فہرست مضامین ما فی الاسلام جلد ثانی

مضمون	نمبر صفحہ
باب ہشتم	ا - ۱۱۳
ضرورت عبادت . . .	۱
نکتہ لطیفہ . . .	۳
تحقیق عبادت . .	۷
اقسام عبادت	۷
ایک وسوسہ شیطانیہ کا ازالہ	۸
غرض عبادت . .	۱۳
تبصرہ . . .	۱۵
حکمت احکام عبادات	۱۶
حکمت وضوء . . .	۱۷
نماز . . .	۲۰
قیام . . .	۲۲
تکبیر تحریمہ . .	۲۲
قرائت . . .	۲۲
رکوع . . .	۲۳
قومہ . . .	۲۳
سجدہ	۲۳

مضمون	نمبر صفحہ
جلسہ . . .	۲۴
قعدہ . . .	۲۴
نماز کی تاکید . .	۲۴
اصلاح بے نماز . .	۲۵
فضائل نماز . .	۳۶
جماعت . .	۳۶
اسرار جماعت . .	۳۷
نماز کے متعلق ضروری احکام	۳۹
نفلی نمازیں . .	۴۱
نماز جمعہ . . .	۴۳
روزہ . . .	۴۹
روزہ کیوں مفروض ہوا ؟	۴۹
موجودہ روزہ بتدریج مفروض ہوا	۵۳
بعض ملاحدہ کا روزہ کے متعلق ایک باطل خیال - ملحدین روزہ کو منافی صحت خیال کرتے ہیں	۵۴
ماہ رمضان اور روزہ کی فضیلت	۵۶
روزہ داروں میں اختلاف مدارج	۵۷

مضمون	نمبر صفحہ	مضمون	
روزہ کے متعلق بعض ضروری احکام	۵۸	اسرارِ فریضۂ حج	[illegible]
احکامِ مسجد	۶۲	ضرورتِ اجتہاد	[illegible]
عیدالفطر	۶۶	غیر مجتہد کے لئے تقلید ضروری ہے	۱۱۰
عیدالفطر کے موٹے موٹے احکام	۶۷	**بابِ نہم**	۱۱۳ تا ۲۵۱
عیدالاضحیٰ	۷۱	عصبیت مذہبی یا قومی	۱۱۳
قُربانی	۷۱	قانونِ شریعت اور رسم و رواج	۱۲۷
احکام عیدالاضحیٰ	۷۲	میراث	۱۳۱
قُربانی کے مسئلے	۷۴	نکاح	۱۳۴
انفاق فی سبیل اللہ اور صدقات	۷۶	غمی	۱۳۵
فریضۂ حج	۸۵	وضع و قطع لباس	۱۳۷
کعبہ	۸۷	اسلام اور حرّیت	۱۳۸
غلافِ کعبہ	۹۲	مساوات	۱۴۴
مسجدِ حرام	۹۳	حقوق الرجال والنساء	۱۴۶
اصنام کعبہ	۹۳	کیا فطرت نے مرد اور عورت	
بیع و اجارہ در مکہ	۹۶	کو یکساں حقوق دیئے ہیں؟	۱۴۶
حرم	۹۷	اسلام میں رہبانیت نہیں	۱۶۱
حدود حرم	۹۷	آیات	۱۶۶
زمزم	۹۹	احادیث	۱۶۹
فرضیت حج	۱۰۰	التصوف	۲۱۱
فضیلت بیت اللہ	۱۰۱		

مضمون	نمبر صفحہ
تعبیر حقیقت تصوّف . .	۲۱۱
لفظ تصوّف کا اشتقاق . .	۲۱۵
حقیقت تصوّف . .	۲۱۶
شریعت و طریقت . .	۲۱۹
فنافی اللہ . .	۲۲۰
انکار . .	۲۲۳
وجہ انکار . .	۲۳۱
طریق تصوّف کی ضرورت	۲۳۶
شریعت و طریقت . .	۲۴۳
باب دہم ۱۰	۲۵۱ تا ۳۳۹
تالیف القرآن . .	۲۵۱
اعجاز القرآن . .	۲۶۴
تبصرہ . .	۲۷۹
فائدہ . .	۲۷۹
قرآن مجید کی نوعیت تعلیم	۲۸۳
تفسیر بالرائے	۲۸۵
علم حدیث کی ضرورت	۳۰۱
علم حدیث کے موضوع کے رُو سے علم حدیث کی ضرورت	۳۲۱

مضمون	نمبر صفحہ
باب یازدہم ۱۱	۳۳۹ تا ۳۶۱
الحقوق	۳۳۹
بنی نوع انسان کے علاوہ دیگر جاندار مخلوقات پر بھی رحمدلی سے سلوک کرنا عین منشاءِ اسلام ہے . .	۳۳۹
حقوق عامۂ مسلمین . .	۳۴۰
حقوق الجوار . .	۳۴۲
حقوق ذوی القربیٰ . .	۳۴۴
حقوق والدین . .	۳۴۶
حقوق معلم . .	۳۴۹
حقوق زوجیت . .	۳۵۱
خاوند کے حقوق . .	۳۵۸
عورت کے حقوق . .	۳۶۰
باب دوازدہم ۱۲	۳۶۱ تا [illegible]
حرمت سود . .	۳۶۱
بیمۂ زندگی کی حرمت . .	۳۸۸
لاٹری . .	۳۸۸

مضمون	نمبر صفحہ
عورتوں کے لئے حکم پردہ	۳۸۹
مذکورہ بالا دلائل کا رد	۳۹۳
ما ورد فی القرآن	۴۰۶
پردہ شرعی کی حد	۴۱۳
ما ورد فی الاخبار والآثار	۴۲۱
پردہ کے متعلق ایک مغربی عیسائی کا غلط خیال اور اس کا رد دمشق کے ایک مشہور عالم کی طرف سے	۴۲۵
تعلیم نسواں . . .	۴۳۰
مسئلہ نکاح وطلاق . .	۴۳۷
عدت . . .	۴۷۳
اسلام اور عیسائیت کی اشاعت	۴۷۴
اعلان	۴۸۴

تاج الدین تاجر کتب
لونڈی راہ والی ڈاکخانہ خاص ضلع گوجرانوالہ

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

ما فی الاسلام

حصہ دوم - باب ہشتم

ضرورت عبادت

انسان کا اشرف کائنات ہونا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں - جس میں ہم نے بیان کیا تھا کہ انسان کی شرافت ذاتی کا مدار کمال علم و عمل پر موقوف ہے - اور کمال علم سے عقاید صحیحہ مراد ہیں - اور کمال عمل سے احکام شریعہ کی پابندی - ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی سوسائٹی کے رسوم و رواج کے رُو سے چند ایک اخلاقی باتیں سیکھ لے اور اس کو اپنے لئے کافی سمجھے - مگر صرف اس حد تک محدود رہنے سے بقینا وہ انسان کے صحیح معنی سمجھنے سے قاصر ہے - یا یوں کہو کہ اس خیال کا شخص جوہر عقل کھو کر انسان نہیں رہا بلکہ زمرۂ حیوانات میں داخل ہو گیا - کیونکہ اگر ہم انسان کو جوہر عقل سے عاری فرض کر کے اسے صرف ایک جاندار متحرک جسم خیال کریں تو ایسے انسان اور دیگر حیوانات میں کوئی مابہ الامتیاز نظر نہیں آتا - ہاں بے شک صورت شکل میں حیوانات سے ضرور ممتاز ہے - مگر انسان صرف صورت و شکل کا نام نہیں بلکہ انسان جوہر عقل کے ساتھ انسان ہے - جس کے ساتھ اس کی دنیا و

آخرت کی صلاح وفلاح وابستہ ہے۔ اگر یہ نکتہ صحیح طور پر انسان کے ذہن نشین ہو
تو یقیناً اتباع شریعت سے وہ کبھی جی نہ چرائے۔

انسان کو عبد کہا گیا ہے۔ اور عبد کا فرض اطاعت خداوندی ہے۔ جس کو اصطلاح شریعت میں عبادت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لئے حقیقی طور پر انسان وہی شخص کہلا سکتا ہے جو شریعت کے مطابق فرض عبادت کو بجا لائے۔ کیونکہ وہ اسی غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا وَمَا خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ یعنی میں نے جن اور انسان کو صرف اسی غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ اور پھر فرمایا وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین له الدین۔ یعنی انہیں صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ خالصاً لوجہ اللہ فرض عبادت کو بجا لائیں۔ اس لئے جو شخص اس فرض کے بجا لانے سے پہلوتہی کرتا ہے وہ درحقیقت انسان نہیں۔ کیونکہ صحیح معنی میں کوئی چیز اسی وقت وہ چیز ہو سکتی ہے جبکہ وہ اپنے اس فعل میں کامل ہو جس کے لئے وہ وجود پذیر ہوئی ہے۔ اور جب اس میں وہ بات موجود نہ ہو تو اس چیز سے اس کا نام اٹھا لیا جاتا ہے۔ تم روزمرہ سنتے ہو گے کہ مریل اور پھسڈی گھوڑے کو کہہ دیا کرتے ہیں۔ کہ یہ تو گھوڑا نہیں ہے یا ناکارہ اور وحشی آدمی کو کہہ دیتے ہیں کہ اس کو آدمی کون کہتا ہے۔ اسی بنا پر کفار نہ تو حق کو سنتے اور نہ زبان سے اس کا اقرار کرتے اور نہ حق و باطل میں غور کرتے۔ اس لئے انہیں صم بکم عمی کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا۔ حالانکہ وہ کان۔ زبان اور آنکھیں رکھتے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان اسی وقت اور اسی قدر انسان کہلائے گا جس وقت اور جس قدر وہ فرض عبادت کو بجا لائے۔ ورنہ نہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے حق میں فرمایا۔ ان ھم الا کالانعام بل ھم اضل سبیلا۔ یعنی وہ تو چوپائے ہیں بلکہ گمراہی میں چوپایوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ اور دوسری جگہ ان کو اشرار کہا

کا خطاب دیا گیا۔ یعنی زمین پر چلنے پھرنے والے جانداروں سے بھی بدترین وہ لوگ ہیں جو قبول حق سے اعراض کرتے ہیں ◆

نکتۂ لطیفہ حضرات علمائے اُمّت اس امر پر متفق ہیں کہ قرآن مجید کے جمیع معارف و حقائق پر حاوی ہونا طاقت بشری سے خارج ہے ۔ چنانچہ ایک حدیث میں بھی اِس امر کی طرف بالفاظ لا تنقضی عجائبہ اشارہ کیا گیا ہے ۔ یعنی قرآن مجید کے معارف و حقائق کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا ۔ سالہا سال سے فقیر مؤلف کے دِل میں سورۃ الرّحمٰن کے ابتدائی آیات الرحمٰن علمہ القرآن ۔ خلق الانسان ۔ علمہ البیان کے متعلق یہ خلجان چلا آتا تھا کہ اِن آیات کی یہ ترتیب کیونکر کی گئی ۔ اور اِن جملوں کو حرف عطف کے ساتھ کیوں بیان نہیں کیا گیا ۔ کیونکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِن آیات کی ترتیب یوں ہوتی ۔ الرّحمٰن ۔ خلق الانسان و علمہ البیان و علمہ القرآن ۔ کیونکہ طبعی طور پر پہلے انسان کو پیدا کیا ۔ پھر اُسے کمال نطق کے ساتھ اس خالق حقیقی نے امتیاز بخشا جس سے وہ قرآن کے معانی کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے ۔

اتفاقاً ایک دِن کتاب تفصیل النشأتین و تحصیل السعادتین تالیف امام ابوالقاسم حسین ابن محمد ابن مفضل المعروف بہ راغب اصفہانی کے دیکھنے کا موقعہ ملا ۔ اور ترتیب آیات کا عقدہ حل ہو گیا ۔ امام ممدوح کے حق میں دعائے مغفرت کی اور خدا کا شکر بجا لایا کہ ایک مدت العمر کی مشکل حل ہوئی جو کئی ایک تفاسیر کے دیکھنے سے بھی حل نہیں ہوئی تھی فالحمد للہ علیٰ ذٰلک ۔ چونکہ امام موصوف کی توجیہ ترتیب ہمارے موضوع زیر بحث سے تعلق رکھتی ہے ۔ اِس لئے اس کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے ◆

امام موصوف لکھتے ہیں کہ اِن آیات کی ترتیب میں ایک لطیف نکتہ مضمر ہے ۔ جس سے ذات باری نے اِس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اِنسان دین کی پابندی کئے بغیر انسان

نہیں کہلا سکتا۔ اور نہ اسے حقائق دینیہ کے بیان کرنے کی قدرت حاصل ہو سکتی ہے
علم القرآن سے اس امر کا اظہار فرمایا کہ انسان جب تک تعلیم قرآن سے متصف نہ ہو
تب تک وہ انسان ہی نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان متصف بالقرآن ہو کر ہی انسان
کہلا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے متعلق ایک حدیث میں وارد ہوا کان
خلقه القرآن اور اخلاق امور طبعی ہیں نہ کسبی۔ اس لئے اس میں انسان کے پیدا کرنے
سے پہلے اس کی حقیقت کاملہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد جملہ علمه
البیان ارشاد فرمایا۔ جس سے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بیان حقیقی جو انسان کی
ذات کے ساتھ مخصوص ہے وہ صرف معرفت قرآن پر موقوف ہے۔ اس لئے آیات کی
اس ترتیب مخصوص اور حرف عطف کے حذف کرنے اور ہر ایک جملہ کو اپنے ماقبل کا بدل
قرار دینے سے اس نکتہ پر آگاہ کیا گیا ہے کہ انسان جب تک عقائد و احکام صحیحہ سے متصف
ہو کر مقام عبادت کو حاصل نہ کرلے تب تک وہ نہ تو انسان کہلا سکتا ہے نہ اس کا کلام
بیان + علم معانی کا ماہر جانتا ہے۔ کہ اگر ان جملوں میں حرف عطف لایا جاتا تو قواعد نحو کے
مطابق ہر ایک جملہ اپنے ماقبل کا بدل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے مسطورہ بالا بلاغت پیدا
نہ ہو سکتی ۔

اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ بیان مذکورہ بالا سے پایا جاتا ہے کہ کافر جو نہ
شریعت کو مانتا ہے اور نہ اس کا متبع ہے انسان نہیں کہلا سکتا۔ حالانکہ قرآن مجید کے
کئی ایک آیات میں انسان کا لفظ کافر پر اطلاق کیا گیا ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے۔
کہ تعارف ناس یعنی محاورہ عامہ کچھ اَور ہے اور تحقیقی استعمال کچھ اور۔ اس لئے کافر پر
لفظ انسان کے اطلاق کی نفی عقلاً اور شرعاً کی گئی ہے نہ لوگوں کی عام بول چال کے رُو سے
جس کا مطلب یہ ہے کہ عقل اور شریعت کے رُو سے ایسا شخص فی الحقیقت انسان
نہیں کہلا سکتا۔ اور اگر کبھی اہلِ شریعت اس پر انسان کا لفظ اطلاق کرتے بھی ہیں تو وہ

بطور مجاز ہوگا نہ بطور حقیقت۔ اور لوگوں کا اپنی بول چال میں اسے انسان کہنا اسے انسان نہیں بنا دیتا۔ کیونکہ لوگ اپنے محاورات میں ایسے کئی ایک لفظ کا استعمال کسی خاص معنی میں کرتے ہیں۔ مگر شریعت اس استعمال کو صحیح قرار نہیں دیتی۔ مثلاً عام بول چال میں غنی ایسے شخص کو کہتے ہیں جو مالدار ہو۔ مگر ایک حدیث میں اس استعمال کو غلط قرار دیا گیا ہے۔ حدیث یہ ہے لیس الغنی بکثرۃ المال وانما الغنی غنی النفس۔ یعنی تونگری کثرت مال کا نام نہیں بلکہ تونگری دل کی تونگری کا نام ہے۔ اور محاورۂ عامہ کو قرآن مجید نے استعمال کیا ہے۔ حیث قال عزوجل۔ ومن کان غنیا فلیستعفف۔ اس لئے ایسے شخص پر جو متبع شریعت نہ ہو انسان کے لفظ کا اطلاق بطور مجاز ہوگا نہ بطور حقیقت۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ جب اہل بلاغت کسی لفظ کا اطلاق کسی چیز پر مقام مدح میں کیا کرتے ہیں تو اس وقت اس چیز سے فرد کامل مراد لیا جاتا ہے۔ کلام بلیغ میں اس کی کئی ایک مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً آیہ ورفعنا لک ذکرک میں ذکر سے مراد ذکر محمود ہے۔ حالانکہ لغت کے رو سے اس کا اطلاق محمود ومذموم ہر دو قسم کے ذکر پر کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کبھی کسی چیز کو مقام مدح میں اس کی نوع کے لفظ سے تعبیر کر دیا کرتے ہیں جیسے کہ دیں ہاں وہ شخص انسان ہے یا یہ گھوڑا گھوڑا ہے۔ گویا اس مخصوص انسان اور مخصوص گھوڑے کے مقابلہ پر دوسرے انسان اور دوسرے گھوڑے انسان اور گھوڑے نہیں ہیں۔ اس کی تائید میں حدیث موجود ہے۔ الناس اثنان عالم ومتعلم وماعداھما ھمج۔ یعنی انسان دو قسم کے ہیں۔ علم شریعت جاننے والا اور علم شریعت سیکھنے والا۔ اور ان دونوں کے سوا جتنے لوگ ہیں وہ سب خرمگس ہیں۔

واضح ہو کہ انسان سے جتنے افعال صادر ہو سکتے ہیں وہ یا تو طبعی ہیں۔ جنہیں نہ تو اچھا کہا جاسکتا ہے اور نہ برا۔ اسہو اور خطا کے طور پر جو افعال صادر ہوتے ہیں وہ

عمل کچھ مفید نہیں۔ اور نہ عمل بدوں علم۔ قرآن مجید میں کثرت کے ساتھ ایمان اور عمل ہر دو کا اکٹھا ذکر کیا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایمان تصدیق قلب کا نام ہے جو ایک قسم کا علم ہے۔ اس لئے اکٹھا بیان کرنے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ کمال انسان علم و عمل کے ساتھ وابستہ ہے اور ہر دو میں علم کو اشرف قرار دیا گیا ہے اور اس امر کے متعلق بکثرت آیات۔ احادیث وارد ہوئی ہیں سو علم کی دو صورتیں ہیں۔ ایک نظری دوسری عملی۔ حصہ نظری میں صرف عقائد شامل ہیں۔ جن میں کسی عمل کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ مثلاً توحید ذات باری۔ وجود ملائکہ۔ کتب سماویہ۔ رسالت۔ بعث بعد الموت وغیرہ ایسے امور ہیں جن پر ایمان لانا ہر ایک مسلم کا فرض ہے۔ اور حصہ عملی وہ ہے جن کی کیفیت عمل پر آگاہ ہو کر اُن کا عمل میں لانا بھی ضروری ہے۔ مثلاً صلوٰۃ۔ زکوٰۃ۔ صوم۔ حج۔ بر والدین۔ جہاد وغیرہ*

ایک وسوسہ شیطانیہ کا ازالہ

بعض نیا چرہ جہّال کا خیال ہے کہ جب تک کوئی شخص الفاظ نماز کے معانی نہ سمجھتا ہو اُس کی نماز نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایسے نمازی کو کچھ علم نہیں کہ وہ مُنہ سے کیا کہہ رہا ہے اسی طرح یہ لوگ تلاوت کتاب اللہ کے متعلق بھی یہی شیطانی وسوسہ لوگوں کے دل میں ڈال دیتے ہیں۔ مگر یہ ایک ملحدانہ خیال ہے۔ کوئی ان جاہلوں سے یہ تو پوچھے کہ کسی عمل کے شرعی طور پر جواز اور عدم جواز کا فتویٰ شریعت کا ہے۔ کیا کتاب اور سُنّت میں اس کی کچھ اصل ہے؟ اسی غلط خیال پر بعض بے لگام طبائع اس حد تک غلو کر گئی ہیں کہ وہ نماز کی صورت کو بدل ڈالنے کا مشورہ مسلمانوں کو دینے پر آمادہ ہیں اور ایسے نصاریٰ کی نماز کی صورت میں جو گرجاؤں میں پڑھی جاتی ہے لانا چاہتے ہیں ؏

لیبک علی الاسلام من کان باکیا[1]

---

[1] جو شخص اسلام کا ماتم کرنا چاہے کرلے ۱۲ منہ

ہیں ایسے بے معنیٰ اور لغو خیال کے رد کی ضرورت اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ مذکورہ بالا خیال کوئی معمولی گناہ نہیں بلکہ خدائے تعالےٰ پر بہتان باندھنا ہے ۔ کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم[1] سچ تو یہ ہے الناس اعداء ما جھلوا[2] ۔ خود تو یہ لوگ بے توفیق ہیں اور ایک رذیل زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے ہیں ۔ بھلا دوسرے کی بضاعت ایمان کو کیوں غرق کرتے ہیں ۔ ع

مرا بخیر تو اُمید نیست بد مرساں

یہ بالکل صحیح ہے کہ الفاظ نماز کے معانی کا سمجھنا نہ سمجھنے کی نسبت افضل ہے ۔ اس میں کسی کو کلام نہیں ۔ لیکن اگر کوئی شخص نہ سمجھتا ہو ۔ تو اس کی نماز ناجائز کیونکر ہو سکتی ہے ۔ کیونکہ نماز ایک عبادت ہے جس میں دو باتوں کا پایا جانا ضروری ہے ۔ ایک تو خارجی طور پر ارکان یعنی تکبیر تحریمہ ۔ قیام ۔ قرأت ۔ رکوع ۔ سجود ۔ قعدہ سلام کا بجا لانا ۔ دوسرے باطنی طور پر خشوع وخضوع کا پایا جانا ۔ سو پہلا امر تو ضروری طور پر موجود ہونا ہے ۔ جس میں کسی کو کلام نہیں ۔ رہا خشوع وخضوع سو یہ ایک ایسا امر ہے کہ اس میں خواندہ اور ناخواندہ میں کوئی امتیاز نہیں ۔ ایسے کئی ایک صاحب موجود ہیں جو نہ صرف الفاظ نماز کا ترجمہ جانتے ہیں بلکہ تفسیر بھی کر سکتے ہیں ۔ مگر نماز میں انہیں خشوع وخضوع نصیب نہیں ہوتا ۔ قرآن مجید نے خشوع وخضوع کو بھی ضروری قرار دیا ہے ۔ چنانچہ فرمایا ۔ والذین ھم فی صلوتھم خاشعون ۔ اور خشوع کے لئے اتنا جاننا کافی ہے کہ نماز پڑھتے وقت حضور رب العالمین میں اس کی ثنا اور حمد اور بندہ کی طرف سے اظہار عبودیت ہوا کرتا ہے ۔ سو اتنی بات کو ہر ایک عالم وجاہل جانتا ہے ۔ بلکہ اکثر ان پڑھ لوگ نماز میں زیادہ مستغرق نظر آتے ہیں ۔ برخلاف ان لوگوں کے جو سرکاری کام

---

[1] چھوٹا منہ بڑی بات ۱۲ [2] لوگ جس امر کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں اسکی مخالفت کیا کرتے ہیں ۔ ۱۲ منہ

کی طرح رٹتے ہیں - وہاں الفاظ نماز کے پانچ سات جملوں کے معانی کا جاننا کونسی بڑی بات ہے - مگر حق تو یہ ہے کہ امتحانی کتب میں دیدہ ریزی اور دماغ سوزی کا نتیجہ تو حصول معاش ہے اور نماز میں کیا رکھا ہے - مفت کی تکلیف اور اپنی وضعداری کا کھو دینا - یہ سب حجتیں نماز نہ پڑھنے کی خاطر ہیں اور بس +

یہی جواب قرآن مجید کی تلاوت کے متعلق سمجھو - ایک حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ قرآن مجید کے ایک ایک حرف کے بدلے پڑھنے والے کو دس دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے اس میں حضور علیہ السّلام نے یہ تو نہیں فرمایا کہ بشرطیکہ پڑھنے والا قرآن کے معانی بھی سمجھتا ہو - اور اگر پڑھنے والا معانی نہیں سمجھتا تو جس کو وہ سُناتا ہے وہ تو جانتا ہے یہی حال نماز کا ہے کہ نمازی اتنا جانتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں اظہار عبودیت کر رہا ہے - اور جن الفاظ میں وہ عبودیت کا اظہار کرتا ہے معبود حقیقی اُسے جانتا ہے - اور اس کا جاننا ثواب کے لیئے کافی ہے اگر کوئی شخص یوں اعتراض کرے کہ آیہ افلا یتدبرون القرآن کا صریح مفہوم یہ ہے کہ قرآن مجید میں غور و خوض کرنا ضروری ہے - اور ناخواندہ لوگ یا جو عربی زبان سے ناواقف ہیں کیا غور و خوض کر سکتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کا سمجھنا ضروری ہے خواہ بذریعہ تلقین علما ممکن ہو - خواہ بذریعہ تعلیم علوم عربیہ - سو ہم دیکھتے ہیں کہ ناخواندہ لوگ حضرات علماء دین سے عقائد و احکام صحیحہ سیکھ سکتے ہیں اور اسی لیئے علماء کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے - اِس امر کا ثبوت کہ دونو طریق پر لوگ قرآن مجید کی تعلیم سے مستفید ہو سکتے ہیں - خود قرآن مجید میں مذکور ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وقالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحٰب السعیر یعنی منکرین قیامت کے دن یوں کہینگے کہ اگر ہم نے کتاب اللہ کو سنا ہوتا یا خود سمجھتے ہوتے تو آج دوزخ کی آگ میں نہ جلتے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے - کہ مقصود بالذات تعلیم شریعت

کا سمجھنا ہے۔ جس طرح ہو سکے صحیح ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ ہر ایک شخص کو کتاب اللہ کے خود سمجھنے کی تکلیف دی جائے ورنہ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا کے کیا معنی ہونگے *

غرض عبادت عبادت سے غرض صرف یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو پاک کرے اور بجز عبادت کے نفس مختلف قسم کی اندرونی نجاستوں سے کبھی پاک نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ایک ایسا اہم امر ہے کہ اس سے کوئی شخص بھی مستثنیٰ نہیں - اس اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اپنے خالق حقیقی کو پہچانیں اور اُس کا قرب حاصل کریں۔ ذات باری چونکہ بے نیاز ہے اس لئے ہماری عبادت کا فائدہ اُس کی طرف عائد نہیں ہوتا۔ اور اگر ہمارا اس میں کچھ فائدہ نہ ہوتا تو ہمیں تکلیف دینے کا کوئی فائدہ متصور نہیں یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ اور جو شخص بار عبادت کا متحمل نہیں ہوتا وہ کبھی پاک نہیں ہو سکتا۔ اور جنت صرف پاک لوگوں کی جگہ ہے۔ اس لئے جو شخص دوام حیات اور طہارت نفس کو چاہتا ہے اُسے چاہیئے کہ وہ تقویٰ اور طہارت حاصل کرنے میں غفلت سے کام نہ لے اور زاد آخرت کی تیاری کرے۔ سابقوا الی مغفرۃ من ربکم کے معنی میں غور کرو *

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے بدن پر کچھ عوارض اور امور موجود ہوتے ہیں یا اگر سردست موجود نہ ہوں تو بتدریج موجود ہوتے چلے جاتے ہیں - ایسے عوارض کو ایک قسم کی نجاست سمجھا گیا ہے اور اسی لئے جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ان عوارض کو اس کے بدن پر سے دُور کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً وہ جھلی جس میں بچہ لپٹا ہوتا ہے اور ناف اور قلفہ اور عقیقہ اور وہ نجاستیں جو بتدریج پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً میل کچیل جوئیں۔ ناخن۔ موئے زیر ناف۔ موئے زیر بغل وغیرہ جنہیں انسان اپنی زندگی تک دُور کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح انسان کے نفس کے ساتھ

بھی ایسے عوارض موجود ہوتے ہیں جو نجاست باطنی کہلاتے ہیں۔ مثلاً جہل، حرص
بخل، ظلم اور جلد بازی وغیرہ اور قرآن مجید نے اِن سب نجاسات باطنی کے دُور
کرنے کا حکم مختلف مواقع پر کیا ہے۔ کیونکہ بجز ان کے دُور کئے طہارتِ نفسی
حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور بجز طہارت نفس اِنسان قرب ذات باری حاصل نہیں
کر سکتا۔ اور نہ ہی وہ حیات طیبہ کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اور نہ حق و باطل میں کچھ
امتیاز کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان باطنی نجاستوں کے دُور نہ کرنے کی صورت میں دُنیا
کا مال و دولت اس شخص کے لئے دُنیا و آخرت میں وبال جان ہو جاتا ہے۔
جس کا اشارہ اِس آیت میں کیا گیا ہے۔ آیہ فلا تعجبک اموالھم ولا اولادھم
انما یرید اللہ لیعذبھم بھا فی الحیٰوۃ الدنیا وتزھق انفسھم وھم
کافرون۔ اِس آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ مال اور اولاد اس دُنیا میں بھی کفار
کے لئے عذاب الیم کا موجب ہیں۔ جب اِنسان اپنے مقصود بالذات کو سمجھ کر احکام
خداوندی کی اطاعت میں آجاتا ہے تو وہ ذخیرہ حسنات کی طرف متوجہ ہو کر ذات
باری سے مغفرت کا انعام حاصل کر لیتا ہے۔ اس تصفیہ اور تزکیہ نفس کا طریق
صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع پر موقوف ہے۔ جس کا اشارہ آیہ
خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا میں کیا گیا ہے۔ اور تصفیہ اور
تزکیہ نفس کے بغیر انسان حیرت جہالت وساوس و شکوک کے دلدل سے کبھی رہائی
نہیں پا سکتا۔ اور نہ وہ سعادت آخرت سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ
امراض قلبی ہیں کہ جن کی موجودگی میں خالص الایمان ہونا ناممکن ہے آیہ انما المؤمنون
الذین آمنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا میں جملہ ثم لم یرتابوا۔ اس
حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ اِس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ
صحیح الایمان صرف وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں ایمان لا چکنے کے بعد وساوس

وشکوک پیدا نہ ہوں مگر وساوس و شکوک سے محفوظ رہنے کے لئے کچھ مہلت درکار ہے جو عملی حالت کی اصلاح کے لئے ضروری ہے ۔

یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ مذکورہ بالا روحانی اور جسمانی نجاستوں کو آدمی کے ساتھ لازم قرار دینے سے کیا فائدہ متصوّر ہے؟ جبکہ بالآخر ان کا دُور کرنا ضروری ہے تو پہلے ہی سے اگر انسان کے ساتھ ضروری نہ قرار دیجائیں تو ان کے دُور کرنے میں تکلیف نہ اُٹھانی پڑتی ۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے کوئی چیز حکمت اور مصلحت سے خالی پیدا نہیں کی ۔ گو انسان بعض اوقات کسی امر کی مصلحت کو نہ سمجھ سکے مگر قانون الٰہی کے مطابق اِس میں ضرور کوئی نہ کوئی مصلحت مضمر ہوتی ہے ۔ بعض اشیاء ایسی ہیں کہ کسی خاص مخصوص وقت تک ان کی ضرورت ہوتی ہے ۔ جب وہ ضرورت باقی نہ رہے تو ان کا وجود غیر ضروری قرار دیا جاتا ہے ۔ جیسے ولادت پر بچہ کے بدن سے عوارض مذکورہ بالا کا زائل کرنا ۔ جن کی ولادت کے بعد کوئی ضرورت نہیں ہوتی ۔ یا جب ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو ان کا ازالہ ضروری ہوتا ہے ۔ جیسے بال ۔ ناخن وغیرہ یہی حال عوارض روحانی کا سمجھو کہ جب تک وہ حد اعتدال تک رہے تو محمود ہیں ورنہ مذموم ۔

تبصرہ اصلاح نفس ایک اہم مسئلہ ہے جس پر محققین نے بڑے بڑے طویل مباحث قلمبند کئے ہیں ۔ چنانچہ ان مباحث کے ضمن میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اصلاحِ نفس فطری طور پر انسان کے لئے ضروری ہے ۔ کیونکہ اصلاح کی قابلیت اس میں فطرتاً موجود ہے جس کا اشارہ آیہ انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرا و اما کفورا ۔ اور نیز آیہ وھدینٰہ النجدین میں کیا گیا ہے ۔ چونکہ انسان کی فطرت میں خیر و شر ہر دو کی قابلیت ودیعت رکھی گئی ہے اس لئے تعلیم و تربیت سے ایک

حد تک اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس تعلیم و تربیت کا اثر تمام طبائع پر یکساں نہیں ہو سکتا۔ لیکن باینہمہ اگر ابتدا ہی میں بچوں کو اکتساب سعادت کی طرف متوجہ کیا جائے تو ان کی طبائع میں سعادت کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں اور وہ بتدریج کامل طور پر پختہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ خیال کہ آیات و احادیث سے طبائع کا غیر متبدل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا تعلیم و تربیت بے سود ہے صحیح نہیں۔ کیونکہ امور طبعیہ کا غیر متبدل ہونا اگرچہ صحیح ہے۔ مگر کوئی طبیعت انسانی محض شر نہیں پیدا کی گئی۔ اس لئے جس قدر قابلیت خیر و سعادت کسی طبیعت میں موجود ہو گی اُسی قدر وہ فیض تربیت سے مستفید ہو سکتی ہے۔ حدیث کل میسر لما خلق لہ سے یہ عقدہ بخوبی حل ہو جاتا ہے۔

135265

حکمتِ احکامِ عبادات

شریعت نے عبادات و معاملات ہر دو کے متعلق نہیں واضح و انسب احکام بتلائے ہیں۔ عبادات کا منشا صرف تصفیہ و تزکیہ باطن ہے اور جو شخص عبادت و ذکر سے بالکل بے بہرہ ہے وہ اصطلاح شریعت میں شیطان کا ساتھی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور اصطلاح اہلِ حقیقت میں ایسے شخص کو مُردہ بولتے ہیں کیونکہ ذکر ہی حیات قلبی کا ذریعہ ہے اور ذکر ہی سے انسان کو اطمینان کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اور ذکر و عبادت ہی سے مقاماتِ رُوحانیہ تک ترقی حاصل ہوتی ہے اور اسی سے انسان کا قلب کشف و الہام کا رُتبہ پا سکتا ہے۔ الغرض بجز عبادت کے اور کوئی ذریعہ تہذیب نفس کا متصور نہیں ہو سکتا کوئی شخص علم و کمال کے خواہ کسی درجہ فضیلت تک ترقی حاصل کرلے مگر بجز ذکر و عبادت کے وہ مردانِ الٰہی کی صف میں شمار کئے جانے کے قابل نہیں۔ ذکر و عبادت کے فضائل

مگر کامل نہیں ہوتی۔ تیسرا مرتبہ وہ ہے جس کو قطع وساوس سے تعبیر کرنا مناسب ہے یعنی اصلاً کسی قسم کا خطرہ نہ آئے۔ اور یہ ایک قسم کا استغراق اور حال ہے۔ اس پر صحت اور کمال کا انحصار نہیں۔ البتہ فی نفسہٖ محمود حالت ہے گو مقصود نہیں۔ پہلا اور دوسرا مرتبہ اختیاری اور مقدور اور شرعاً واجب العمل ہے اور تیسرا مرتبہ غیر اختیاری اور غیر مقدور اور شرعاً واجب العمل نہیں۔ دونوں صورتوں میں خشوع کا مفہوم ایک نہیں تو پھر عدم حضور کا عذر کیونکر چل سکیگا۔ پھر انکے استدلال کے فی نفسہٖ غلط ہونے کے علاوہ ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ اُن کے اس استدلال سے نص قطعی لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا کی تکذیب لازم آتی ہے۔ کیونکہ جو مرتبہ حضور قلب کا ایسا ہے کہ بدون اس کے نماز نہیں ہوتی خواہ مرتبہ صحت میں یا مرتبہ کمال میں لامحالہ شریعت میں اس کے حاصل کرنے کا حکم ہوگا اور جس امر کا حکم ہے اس کا داخل وسعت ہونا بہ نص بالا لازم آتا ہے۔ پھر اس کو وسعت سے خارج کرنا نص کی تکذیب ہے۔ پھر ان عقل کے پتلوں سے کوئی پوچھے کہ نماز میں جتنے فرائض ہو توقف علیہ صلوٰۃ کے ہیں۔ اگر وہ کبھی وسعت سے خارج ہو جاتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ شریعت اس کا کوئی بدل اس کے قائم مقام کرکے اس کی اجازت دیتی ہے مثلاً قیام فرض ہے اگر قدرت نہ رہے تو قعود اس کے قائم مقام ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا پس اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضور قلب کا مرتبہ ضروریہ وسعت سے خارج ہے تو ضرور ہے کہ شریعت میں اس کا کوئی بدل ہوگا۔ سو اس کے بدل کے ساتھ نماز پڑھنا ضروری ہوا۔ پھر ترک کی کیسے گنجائش نکلی؟ یہ اُس وقت ہے جبکہ حضور قلب اس کا رکن ہو اور اگر رکن نہ ہو تو اس صورت میں ضرور سوچنا چاہئے کہ نماز بلا حضور قلب پڑھنے میں تو نماز کے لوازم ضروریہ کا فوت ہونا لازم آتا ہے اور نماز نہ پڑھنے سے خود اصل نماز ہی فوت ہوتی ہے۔ سو نماز کا فوت کر دینا اشد

ہے یا اس کے لوازم کا! چونکہ لازم کا وجود بدوں ملزوم نہیں پایا جاتا۔ اور جب ملزوم کو فوت کر دیا ہے تو لا محالہ لازم بھی فوت ہوگا۔ کیونکہ نماز پڑھنے میں تو حضور قلب ہی فوت ہوتا ہے اور نہ پڑھنے میں وہ حضور بھی گیا۔ اور نماز بھی صرف لازم کا فوت ہونا ایک آسان امر ہے یا لازم و ملزوم ہر دو کا! اور یہ جہالت کا نتیجہ ہے۔ ہماری اس تقریر میں غور کرنا اس کا علاج ہے۔

بعض لوگ اس جہالت میں مبتلا ہیں کہ وہ باوجود دعوئے اسلام کے نماز فرض نہیں سمجھتے اور یہ دو قسم کے لوگ ہیں۔ بعض فلسفیت کے رنگ میں ہیں بعض تصوف کے رنگ میں۔ پہلی قسم کے لوگ تو یوں تقریر کرتے ہیں کہ اصل مقصد شارع علیہ السلام کا تہذیب اخلاق ہے۔ حکم صلوٰۃ کے فرض ہونے کے وقت میں صفاتِ ذمیمہ کبر و ظلم وغیرہ کا غلبہ تھا۔ نماز کی ہیأت و اوضاع و اذکار۔ تواضع اور انکسار کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس لئے انہیں نماز کا حکم دیا گیا۔ ہم چونکہ اب مہذب ہو چکے ہیں لہٰذا ہم کو نماز کی ضرورت نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ یہ تقریر اس خیال پر مبنی ہے کہ احکام شرعیہ کو مقصود بالذات نہ تسلیم کیا جائے۔ اس میں دو دعوے تمہاری طرف سے ہوئے ہیں۔ اوّل یہ کہ نماز مقصود بالذات نہیں۔ دوم یہ کہ بدون نماز کے مہذب ہونا ممکن ہے۔ جن کا ثابت کرنا تمہارے ذمہ ہے۔ جن کے جواب سے تم قیامت تک بھی قادر نہ ہوگے۔ کیونکہ حکم نماز مقصود بالذات ہے۔ پس ایسے بے ہودہ شبہات سے یہ یقین زائل نہیں ہو سکتا عقلاً و سمعاً ایسا اعتقاد الحاد و زندقہ ہے اور ایسا شخص ہرگز مسلمان نہیں۔ اس کو نماز سے پہلے تجدید ایمان ضروری ہے۔ اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ واقعی یہ لوگ اپنی تہذیب نفس سے فارغ ہو چکے ہیں۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ترفع و تجبر و تعلی و تکبر و ظلم و نخوت و قساوت و غفلت ان مدعیوں میں حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے جس کا وجود سلف صالحین کے زمانہ میں

...س کا عشر عشیر بھی نہیں تھا - پھر یہ مہذب کیونکر کہلا سکتے ہیں؟ اگر شرعیت
صلوٰۃ کی غایت اسی قسم کے مصالح پر مبنی ہوتی تب بھی یہ لوگ بہ نسبت ان بزرگوار
کے نماز کے زیادہ محتاج ہوتے - اس جہل مرکب کا علاج بھی وہی ہے جو اوپر مذکور
ہوا - اور اگر یہ کافی نہ ہو تو دیگر محققین سے اپنے شبہات کو رفع کر لینا چاہیئے -
مستغنی کے گروہ یعنی جو تصوّف کے رنگ میں آکر تارک صلوٰۃ ہیں تقریر یہ ہے کہ نماز سے
مقصود بالذات قربِ الٰہی ہے - اور نیز دیگر طاعات بھی اسی قرب کا واسطہ ہیں اور
یہ واسطہ ذکرِ الٰہی ہے - پس اگر کسی کو دوامِ ذکر نصیب ہو جائے اس کو نماز کی حاجت
نہیں رہتی یا نماز ہی سے اگر یہ رتبہ مل جائے تو نماز کی حاجت داعی نہیں ہوتی اور
حصول قرب پر بھی اگر نماز پڑھتا رہے تو بطور فریضہ مستقلہ نہیں ہوگی - اس حالت
میں فرائض اس کے حق میں نوافل ہو جاتے ہیں - سو اس کے جواب میں بھی وہی
مذکورہ بالا تقریر جو فلاسفہ کے مقابلہ میں لکھی گئی ہے کافی ہے - اور اس پر بھی
وہی فتویٰ اور وہی علاج عرض کیا جائیگا - اور دونوں کو مخاطب کر کے ہم بطور مثال
بیان کرتے ہیں کہ جس طرح بعض ادویہ طبیہ میں بعض اشیاء ایسی ہوتی ہیں جو بالخاصیت
مؤثر ہوتی ہیں - اس کی نسبت طبیب ماہر فن حکم لگا سکتا ہے - اسی طرح اگر ایسے
عبادات شرعیہ کو محض اپنی صورتِ نوعیت و خاصیت کے اعتبار سے خاص ثمرات
مثلاً اخلاق مرضیہ حق و نجات و قرب و رضا میں مؤثر مانا جائے تو اس کی نفی کی کیا
دلیل ہے - ہاں اثبات کی دلیل نصوص آیات و احادیث ہیں جو بلا قید خصوصیت
ہر ایک شخص کے حق میں یکساں طور پر وارد ہوئے ہیں - جن سے صاف معلوم ہوتا ہے
کہ وہ بذاتہا واسطہ ہیں - اور جہاں کہیں بعض طاعات کی حکمت بتلائی گئی ہے
وہاں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا ذکر صرف اس غرض سے ہے کہ
اس حکم کی اہمیت اور ضرورت کو ظاہر کیا جائے - اللّٰھم اھدنا الصراط المستقیم ؂

فضائل نماز

ابوذر رضؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلعم جاڑے کے موسم میں جبکہ درختوں کی پت جھڑ ہو رہی تھی باہر تشریف لائے۔ سو آپ نے درختوں کی دو شاخوں کو پکڑا تو اُس کے پتے جھڑنے لگے۔ تب آپ نے فرمایا کہ ابوذر! عرض کیا یا رسول اللہ! حاضر ہوں۔ فرمایا کہ مسلمان بندہ جب محض خالص نیت سے نماز پڑھتا ہے تو اس کے گناہ ایسے جھڑ جاتے ہیں جس طرح کہ اِس درخت کے پتے جھڑتے ہیں ٭ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا یہ تو بتلاؤ کہ اگر تمہارے دروازوں کے سامنے ایک نہر جاری ہو اور تم میں سے کوئی ہر روز پانچ دفعہ اس میں نہائے تو کیا اُس کے بدن پر کوئی میل کچیل باقی رہ جاتی ہے؟ صحابہؓ نے عرض کی کہ نہیں فرمایا کہ یہی مثال پانچوں نمازوں کی ہے کہ اِن کے سبب اللہ تعالےٰ گناہوں کو مٹادیتا ہے یعنی پانچ وقت کا نمازی گناہوں کی میل سے پاک صاف ہوجاتا ہے ٭

جماعت

جماعت سے نماز پڑھنا سنّت مؤکدہ ہے۔ اِس کی بڑی تاکید آئی ہے۔ ابیؓ بن کعب سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ایک دِن صبح کی نماز پڑھائی۔ سلام کے بعد فرمایا کہ فلاں شخص حاضر ہے؟ صحابہؓ نے عرض کی کہ نہیں۔ پھر فرمایا کہ فلاں حاضر ہے؟ عرض کیا نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہ دو نمازیں (عشا و صبح) منافقوں پر بہت بھاری ہیں۔ اور اگر تم جانتے کہ اِن دونوں میں کیا ثواب ہے تو تم اِن دونوں کے لئے آتے۔ گو تم کو گھٹنوں کے بل چلنا پڑتا اور پہلی صف فرشتوں کی صف کی طرح ہے۔ اور اگر تم اِس کی فضیلت جانتے تو جلدی آتے (صف اوّل میں) دو مرد کی نماز بہ نسبت اکیلے کے بہتر ہے۔ اور تین کی دو سے بہتر ہے اور جس قدر زیادہ ہوں خدا کے نزدیک بہت عمدہ ہے۔ ایک روایت میں جماعت سے نماز پڑھنے سے پچیس نماز کا اور ایک روایت میں ستائیس نماز کا ثواب آیا ہے۔ اور یہ محلّہ کی مسجد کے لئے ہے اور جامع مسجد میں پانچ سَو نماز کا ثواب

اور بیت المقدس اور مسجد نبوی صلعم میں تو پچاس پچاس ہزار نماز کا اور بیت اللہ میں ایک لاکھ نماز کا ثواب ملتا ہے۔ اللہ اکبر۔ اس میں علاوہ اور بات سے فوائد و برکات دینیہ کے دنیوی فائدہ بھی ملحوظ ہے ۔ بلا عذر ترک جماعت پر حضور علیہ السلام نے سخت وعید فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے کہ مجھے خدا نے حکم دیا ہے کہ جو لوگ جماعت کے ساتھ شامل نہ ہوں میں اُن کے گھر پھونک دوں۔ ہر ایک ایماندار اس وعید کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین رحمہم اللہ العزیز تکبیر تحریمہ فوت ہو جانے پر تین دن اور جماعت فوت ہو جانے پر سات دن تک متواتر اس شخص کی تعزیت کیا کرتے جو تحریمہ اور جماعت کی فضیلت سے محروم رہ جاتا۔ اللہ رے محبت دین۔ جزاہم اللہ خیرا ۔

ناظرین کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شریعت اسلامی کے رو سے کامل الایمان وہی شخص ہے جو حضور علیہ السلام کی روش سے بلا عذر سرمو تفاوت جائز نہ رکھے جو شخص دلی محبت اور ارادت سے حضور علیہ السلام کی پیروی کرتا ہے وہ چند ہی روز میں اپنے دل میں حلاوت ایمان محسوس کرنے لگتا ہے۔ نفس اگر بالفرض غفلت و سستی کی طرف میلان کرتا ہو تو فی الفور استغفار و لاحول پڑھ کر جماعت کو بجا لانا چاہیئے۔ یہ ایک راز ہے جس کو عملی طور پر بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ اور جس نے سمجھا ہے اُسے کسی دوسری چیز سے خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو لذت حاصل نہیں ہوتی۔ یہ حالت بتدریج نفس کو قابو کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ آرام طلبی اور تن آسانی کو اپنے وقتوں میں اختیار کرنا جبکہ اللہ اور اللہ کے رسول کا حکم سر پر موجود ہو نفسانیت کا نتیجہ ہے اور ایسا آدمی نورِ عرفان سے ہمیشہ محروم رہتا ہے ۔

اسرارِ جماعت

ذیل میں ان اسرار کو نمبروار قلمبند کیا جاتا ہے۔ جو باجماعت نماز ادا کرنے میں شارع علیہ السلام کو مدِ نظر ہیں :-

(۱) نماز معافی گناہ کے لئے عذر پیش کرنے کا نام ہے۔ چنانچہ کتاب وسنّت میں اس کی تصریح ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اکیلے شخص کا عذر وہ وقعت پیدا نہیں کرتا جو ایک جماعت کا ؎

(۲) نماز دُعا کا نام ہے جس میں اپنی کام روائی کی التماس پیش کی جاتی ہے۔ بہت سے لوگوں کا جمع ہونا گویا ایک گونہ سفارش کا کام دیتا ہے ؎

(۳) نماز رحمتِ الٰہی کا ایک وسیع دسترخوان ہے۔ کریم آدمی کا شیوہ ہے کہ جس قدر زیادہ مہمان اس کے دسترخوان پر موجود ہوں اُسیقدر اُسے زیادہ خوشی ہوتی ہے ؎

(۴) جماعت سے عبادت کا کفّار پر اظہار ہوتا ہے جو اُن پر بمنزلہ حجت تصوّر ہو سکتا ہے اور ان کے دلوں میں ہیبت وحشمت اسلامی کا سکّہ جم جاتا ہے ؎

(۵) جماعت سے مسلمان باہم ایک دوسرے کے گواہِ عبادت بن جاتے ہیں ؎

(۶) ایک حدیث میں حضور علیہ السّلام یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ جب چالیس آدمی مِلکر نماز ادا کرتے ہیں تو اُن میں ایک شخص ضرور مغفور ومرحوم ہوتا ہے ؎

(۷) ملائکہ نے آدم علیہ السّلام کے خلیفۃ اللہ ہونے پر یوں اعتراض کیا تھا کہ اے خدا کیا تو زمین میں ایسا مُفسد کو خلیفہ بناتا ہے۔ پس اقامت صلوٰۃ کے وقت آسمانوں کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں تاکہ ملائکہ دیکھ لیں کہ ان کا اعتراض درست نہیں تھا ؎

(۸) ممکن ہے کہ اکیلے آدمی کو کسی رُکن کے ادا کرنے میں سہو ہو جائے بصورتِ جماعت احتیاط ملحوظ رہے گی ؎

(۹) شعائر اللہ کا اظہار موجب عظمتِ دین ہے ؎

(۱۰) انتظار جماعت کا ثواب ؎

(۱۱) باہم ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہونا موجب ہمدردی و باعث ازدیادِ محبت ہے۔

(۱۲) السلام علیکم کا ثواب۔

(۱۳) ضرورتِ جماعت پر مساجد کی تعمیر جو منجملہ شعائر اللہ ہے۔

(۱۴) جماعت سے نماز اوّل وقت میں ادا ہوگی کیونکہ تنہا غالباً تاخیر کرے گا جو گناہ ہے۔

(۱۵) مشابہت بالملائکہ حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ ملائکہ اپنی نسبت یوں کہتے ہیں اِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّوْنَ وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ۔

(۱۶) مجاہدین سے مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔

(۱۷) حجاجِ بیت اللہ سے مشابہت حاصل ہوتی ہے۔

(۱۸) امام کی اقتداء سے اطاعت و انقیاد کی عادت ہو جاتی ہے۔

(۱۹) پابندئ وقت کی عادت ہو جاتی ہے۔

(۲۰) جماعت بجائے خود ایک زینت ہے۔

(۲۱) میدانِ حشر میں جمع ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔

ممکن ہے کہ غور کرنے سے کوئی صاحب اور بھی فوائد یا اسرار تجویز کر سکیں مگر تقویتِ ایمان کے لئے کیا یہ کچھ کم ہیں؟

نماز کے متعلق ضروری احکام

اوپر کے بیان سے اسرار و فوائد نماز معلوم ہو چکے ہونگے۔ نماز بندہ اور مولےٰ کے درمیان تقرّب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کو عمدہ طور پر ادا کیا جائے اس کے تمام فرائض و واجبات و سنن و مستحبات کا لحاظ رہے۔ کیونکہ تمام جگہ اَقِیْمُوا

الصَّلٰوۃَ" فرمایا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ نماز کو اپنی حالت پر قائم کرو اور خضوع و خشوع تو لازمی امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلٰوتِہِمْ خَاشِعُوْنَ۔ یعنی وہ مومن عذاب سے خلاصی پا گئے جو اپنی نمازوں میں خشوع اور فروتنی کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب نماز میں کھڑا ہے تو اس کا دل خدا کی طرف متوجہ ہو۔ معانی کا لحاظ رہے۔ اور یوں سمجھے کہ میں اپنے رب کو دیکھ رہا ہوں۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو اتنا سمجھے کہ میرا رب مجھ کو دیکھ رہا ہے جیسا کہ آنحضرت صلعم نے حدیث جبریلی میں احسان کے معنی بیان فرمائے ہیں۔ ایسی نماز ہی انسان کو گناہ کی باتوں سے روکتی ہے۔ ایسے پاک نفوس ہی اس کے قرب کے مستحق ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حالت نماز میں ہوتی یہ تھی کہ گویا ہانڈی کا جوش ہے کہ آپ کے سینہ مبارک سے ظاہر ہو رہا ہے۔ صحابہ کرام و تابعین و تبع تابعین اور آئمہ مجتہدین کی نمازوں کا مطالعہ کرو تو معلوم ہو جائیگا کہ یہ اللہ کے بندے نمازی تھے ایک نماز ہماری بھی ہے کہ زبان سے کچھ کہہ رہے ہیں اور دل میں کچھ۔ پھر اس کا کیا فائدہ اور ایسی نماز برائیوں سے کیونکر روک سکتی ہے ؎

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں مگر اس کے آداب کا خیال نہیں۔ صف بندی پورے طور پر نہیں کی جاتی۔ ابھی پہلی صف پوری ہی نہیں ہوتی کہ دوسری بنا لیتے ہیں۔ حکم یہ ہے کہ جب امام رکوع کرے سجدہ کرے تم اس کے بعد کرو مگر یہاں حال برعکس دیکھا جاتا ہے۔ امام ابھی سجدہ میں جاتا ہی نہیں کہ مقتدی پہلے سے پہنچے ہوتے ہیں۔ مقتدی وہ ہے جو اقتدا کرے نہ کہ جو پیش روی کرے۔ اس طرح بیشک نماز نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ نماز سے سخت بے پروائی کی جاتی ہے۔

ول تو نمازی ہی کتنے ہیں؟ فی صدی ایک بھی نہ پایا جائیگا۔ اور جو کچھ ہیں بھی۔ تو نماز برباد کن۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ۔ پروردگار عالم مسلمانوں کو اِس بڑے فرض کے صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق دے۔ آمین ؂

نفلی نمازیں

پانچ وقتی نماز جو ہر مسلمان پر فرض ہے اِس کا ذکر تو گذر چکا اب ہمیں یہ بیان کرنا ہے کہ فرضی نمازوں کے علاوہ نفلی نمازوں کا ذکر بھی احادیث میں آیا ہے۔ چونکہ اسلام میں عباداتِ بدنیہ میں سے نماز بڑا مرتبہ ہے۔ یہاں تک کہ نماز کو مومن کا معراج کہا گیا ہے۔ اِس لئے جس قدر ماثورہ نمازیں ہیں ان کا معلوم کرنا اور اُن پر پابند ہونا اعلیٰ درجہ کی سعادت کا نشان ہے یاد رکھو کہ جس قدر تم کو خدا سے زیادہ تقرب ہوگا اُسیقدر زیادہ اُس کے مقبول ہوگے۔ اور تقرب کے بڑے وسائل میں سے نفلی نماز ہے جس قدر زیادہ ادا ہوگی اُسیقدر زیادہ تقرب ہوگا۔ یہاں تک کہ ملقب بہ ولی اللہ ہو جائیگا۔ چنانچہ بخاری میں ابوہریرہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ پروردگار نے فرمایا۔ کہ جو شخص میرے ولی سے عداوت پیدا کرے تو میں اُس کو اپنے سے لڑائی کا پیغام دیتا ہوں۔ اور سب سے زیادہ محبوب عمل (بندہ کی طرف سے) یہ ہے کہ میرے فرائض کو ادا کرے۔ اور میرا بندہ نوافل پڑھ کر مجھ سے ہمیشہ تقرب حاصل کرتا ہے حتیٰ کہ میں اِس کو دوست بناتا ہوں تو میں اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اُس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ اور میں اُس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو ضرور اُس کو دیتا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو پناہ دیتا ہوں۔ میں جس کام کو کرتا ہوں اُس میں تردد نہیں کرتا۔ مومن کی طرف سے مجھے تردد ہے کہ وہ موت کو بُرا سمجھتا ہے۔ اور مجھے اُس کی بُرائی بُری معلوم ہوتی

ہے۔ لیکن اس کی موت کا آنا ضروری اور اٹل امر ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نوافل پڑھتے پڑھتے خدا کے ولی ہوجایا کرتے ہیں تم نے اولیاء کرام کے حالات دیکھے ہونگے تو تم کو یقین ہوگا کہ یہ لوگ کیسے عبادت ریاضت وذکر وشغل میں اپنے عزیز اوقات کو بسر کیا کرتے تھے۔ یہانتک کہ تمام زمانہ میں خدا کے ولی اور محبوب مشہور ہوجاتے تھے۔ اور لوگوں کے دلوں میں عموماً اُن کی محبت اثر کرجایا کرتی تھی۔ جیسا کہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ جب خداوند کریم کسی بندہ کو اپنا ولی اور دوست بناتا ہے تو خدا کی طرف سے فرشتہ آسمان میں پکار دیتا ہے کہ فلاں بندہ میرا ولی ہے تو بھی اس کو دوست رکھ۔ علیٰ ہذا زمین پر بھی فرشتہ پکار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کسی ولی اللہ کا گذر ہوجائے ہزاروں بندگانِ خدا اُن کی زیارت وبرکت سے مشرف ہوتے ہیں۔ آجکل بھی اس گئے گذرے زمانہ میں کوئی بندۂ خدا بزرگوں کے طریقہ پر چلنے والا آجاتا ہے تو دیکھ لو کہ بلا اُن کے طلب اور درخواست واشتہار ہر طبقہ کے لوگ ان کی خدمت میں نہایت ذوق شوق سے جمع ہوجاتے ہیں۔ سبحان اللہ۔ اُن بزرگانِ دین کی زندگی اور موت یکساں ہوتی ہے فقط زندگی ہی میں یہ لوگ مرجع انام نہیں ہوتے بلکہ موت کے بعد بھی مرجع عالم ہوتے ہیں۔ اور روحانی فیض حاصل کرنے والے فیض یاب ہوتے ہیں۔ الغرض عبادت وہ شئے ہے جس کی خوبی اور فوائد سے عابد لوگ ہی جو خالصاً لوجہ اللہ عبادت کرتے ہیں بخوبی واقف ہیں۔ نافلہ نمازیں حسب ذیل ہیں:۔

نمازِ تہجد۔ نماز اشراق۔ نمازِ ضحیٰ۔ نماز بعد از زوال۔ صلوٰۃ اوّابین۔ صلوٰۃ تسبیح۔ صلوٰۃ حاجت۔ نماز استخارہ۔ نماز کسوف۔ نماز خسوف۔ نماز استسقاء۔ نماز خوف نماز شب قدر۔ نماز نصف شعبان۔ نماز جنازہ جو فرض کفایہ ہے۔

اِن مذکورہ بالا نمازوں کے تفصیلی احکام کتب فقہ وحدیث میں بخوبی موجود ہیں۔ اس کتاب

میں ان کا بیان باعثِ طوالت ہے ۔

نمازِ جمعہ شریعت اسلام نے اتفاق کے دائرہ کو وسیع کرنے کی خاطر جمعہ کا دِن مقرر کیا ہے ۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ تمام شہر کے لوگ ایک جگہ جمع ہوں بلکہ اس پاس کے چھوٹے چھوٹے گاؤں کے لوگ بھی آجائیں ۔ جمعہ کے متعلق بعض ضروری احکام مندرجہ ذیل ہیں :۔

(۱) جمعہ کے روز نماز کے لئے مسجد جامع میں جمع ہونے کی وجہ سے اُس دن کو جمعہ کہتے ہیں ۔ گو پنجگانہ نماز کے لئے بھی لوگ مسجد میں جمع ہوتے ہیں مگر نمازِ جمعہ میں زیادہ خصوصیت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اکیلا آدمی نماز جمعہ ادا نہیں کر سکتا ۔ ایامِ جاہلیت میں اس دن کو یوم العروبہ پولا کرتے تھے ۔ کعب بن لوی ایام جاہلیت میں لوگوں کو اُس دن جمع کر کے انہیں وعظ و نصیحت کیا کرتا اور جناب پیغمبر علیہ السلام کے آنے کی خبر دیا کرتا تھا ۔ جمعہ کا لفظ اب گویا اسلامی اصطلاح ہے ۔ سب سے پہلا جمعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مسجد قبا میں ادا کیا جبکہ آپ مکہ معظمہ چھوڑ کر مدینہ منوّرہ تشریف فرما ہو رہے تھے بعد ازاں مدینہ منوّرہ میں نازل ہو کر آپ نے دار بنی سالم بن عوف میں پہلا جمعہ ادا کیا ۔

(۲) جمعہ کا دِن نہایت مبارک سمجھا گیا ہے ۔ چنانچہ اس کو مسلمانوں کے لئے عید کا دِن کہا جاتا ہے ۔ کیونکہ عبادات فریضہ اور نوافل کا ثواب جمعہ کے دِن بہت بڑا ہے ۔ ایک حدیث میں حضور علیہ السلام یوں ارشاد فرماتے ہیں خیر یوم طلعت[۱] فیہ الشمس یوم الجمعۃ فیہ خلق ادم وفیہ ادخل الجنۃ[۲] وفیہ اخرج منہا ولا تقوم الساعۃ الا فی یوم الجمعۃ ۔

---

[۱] ترجمہ ۔ تمام دنوں میں بہترین دِن جمعہ کا ہے کیونکہ اسی میں آدم علیہ السلام کے وجود کی تکمیل ہوئی اور اُسی دِن آپ داخل جنت ہوتے اور اُسی دن جنت سے نکالے گئے اور قیامت بھی اُسی دِن ہوگی ۱۲ منہ [۲] شاید کسی صاحب کو یہ خیال پیدا ہو کہ آدم علیہ السلام کا بہشت سے نکالا جانا جمعہ کے دن موجب فضیلت ہے ؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا یہ نکالا جانا تمام انبیاء و اولیاء کے سلسلہ کا باعث ہوا ۱۲ منہ

اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی عبادت کے لئے علیحدہ علیحدہ ہفتہ اور اتوار دن مقرر تھے۔ مسلمانوں کی بہت خواہش تھی کہ اُنکے لئے بھی عبادت کے واسطے کوئی دن مقرر ہو۔ چونکہ اکثر احکامِ شریعت کا نزول مدینہ منورہ میں ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ میں مشرکین نے ابھی تک توحید کا اقرار نہیں کیا تھا تو دیگر احکام کی تعلیم جو توحید پر مترتب ہو سکتی ہے کیونکر ممکن تھی۔ اس لئے خداوند کریم نے مدینہ منورہ کو یہ شرف بخشا کہ حضور علیہ السلام وہاں تشریف فرما ہوئے اور سب احکام شرعی مثلاً وجوب نماز و زکوٰۃ وغیرہ نازل ہونے شروع ہو گئے۔ مسلمانوں کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی اور خدا کا شکر بجا لائے۔[1]

اجابت دُعا روز جمعہ کی خصوصیات میں داخل ہے اور اس خصوصیت کا منبع یہ حدیث ہے۔ اِلْتَمِسُوا السَّاعَةَ الَّتِيْ تُرْجٰى فِيْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ بَعْدَ الْعَصْرِ اِلٰى غَيْبُوْبَةِ الشَّمْسِ۔ گو اس ساعت میں اختلاف کیا گیا ہے مگر عام طور پر بھی جمعہ کا دن قبولِ دُعا کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ بزرگانِ سلف خاص خاص وظائف و اوراد جمعہ کے دن بجا لایا کرتے تھے۔

یہ خیال محض غلط ہے کہ تمام دن یکساں ہیں اور ان میں بلحاظ برکت و خیر کوئی تفاوت نہیں۔ کیونکہ خداوند کریم نے اپنی حکمت کاملہ سے تمام مختلف قسم کی اشیا میں تفاوت رکھا ہے۔ یہ تو ایسا ہی خیال ہے کہ تمام آدمی یکساں ہیں اور ان میں بلحاظ فضائل ذاتی کوئی تفاوت نہیں۔ یہ سچ ہے کہ مخلوق ہونے کی حیثیت سے یکساں ہیں مگر عوارض میں ہر ایک چیز اپنے نوع کے دیگر افراد سے متمیز ہو سکتی ہے خصوصاً جبکہ نص قرآنی سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند کریم نے اس دن کو برخلاف دوسرے

---

[1] ممکن ہے کہ حضور کے خاتم النبیین ہونے کی وجہ سے جمعہ کا دن مسلمانوں کے لئے منتخب کیا گیا ہو کیونکہ جمعہ بھی آخری دن ہے جس میں آدم کے وجود کی تکمیل ہوئی [2] اُس گھڑی کی تلاش کرو جو جمعہ میں عصر اور غروب آفتاب کے درمیان وقت میں قبول دعا کے لئے مقرر ہے ۱۲ منہ

دنوں کے عظیم الثواب نماز کے لئے منتخب کیا ہے اور احادیث میں اُس دن کے فضائل مذکور ہیں۔ جمعہ کی خصوصیت دیگر ایام کی نسبت بعینہٖ ماہ رمضان اور لیلۃ القدر کی سی ہے جو بنص قرآن دوسرے مہینوں اور راتوں پر فضیلت رکھتے ہیں ✤

(۳) ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ بموجب حدیث بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلَی النَّظَافَۃِ مقدس اسلام میں طہارت ظاہری و باطنی پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ جمعہ کا دن اِس ضروری حکم کی بجا آوری کے لئے حضور علیہ السلام نے مخصوص فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں یوں وارد ہے۔ مَنِ اغْتَسَلَ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ وَغَسَلَ وَبَكَّرَ وَابْتَكَرَ وَدَنَا وَاسْتَمَعَ وَانْصَتَ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ خُطْوَةٍ يَخْطُوْهَا اَجْرُ سَنَةٍ صِيَامِهَا وَقِيَامِهَا اگر لباس دُنیا تبدیل کرکے خوشبو وغیرہ لگائے تو اور بھی موجب ثواب ہے ✤

علماء نے اِس امر میں اختلاف کیا ہے کہ غسل جمعہ فضیلت یوم جمعہ کی خاطر ہے یا نماز کی۔ کچھ ہو بہ نیت ادائے سنت موجب ثواب عظیم ہے ✤

غسل اور تبدیل لباس سے ایک مومن کے دل میں جو نور پیدا ہوتا ہے اُسکی کیفیت وہی جانتا ہے ✤

(۴) جب امام منبر پر کھڑا ہو اور دوسری اذان ہو جائے تو ہر ایک قسم کے کام کاج کو فی الفور ترک کر دینا چاہئے۔ قرآن مجید میں بیع کا لفظ آیا ہے کیونکہ بیع ضروریاتِ انسانی میں سب سے اہم ہے ورنہ ہر ایک شغل کی ممانعت ہے حضور علیہ السلام اور خلیفہ اوّل اور خلیفہ ثانی کے زمانہ تک ایک اذان ہی

---

[۱] جو شخص جمعہ کے روز غسل اور سر کے بالوں کو صاف کرے اور نماز کے اوّل وقت میں حاضر ہو کر خطبہ سنے۔ اور امام سے قریب بیٹھ کر کان لگائے۔ وعظ اور پند جو خطبہ میں ہوا کرتا ہے اُسے سنتا رہے تو اُسے ہر ایک قدم کے عوض ایک سال کے روزوں اور رات بھر عبادت کرنے کا ثواب ملتا ہے ۱۲ منہ

[۲] اہل مدینہ شروع شروع میں اگر کسی کو بُرے الفاظ سے تعبیر کرنا ہوتا تو کہتے کہ فلاں اس شخص سے بھی بُرا ہے جو جمعہ کے دن غسل نہیں کرتا ۱۲ منہ

مقرر تھی۔ مگر خلیفہ ثالث کے زمانہ میں جب لوگوں کی کثرت ہو گئی تو مسجد نبوی کے متصل مکان زوراء پر ایک اذان اور بڑھا دی گئی ✦

(۵) مسافر۔ عورت۔ مریض۔ غلام۔ نابینا۔ قیدی پر جمعہ واجب نہیں لیکن اگر وہ ادا کرلیں تو ادا ہو جائیگا ✦

(۶) جب مسجد میں جائے اور ابھی خطبہ شروع نہ ہوا ہو تو چار رکعت سنت قبل جمعہ ادا کرے۔ اور اگر خطبہ ہو رہا ہو تو صحیح مذہب یہی ہے کہ دو یا چار رکعت نہ پڑھے بلکہ چپکا بیٹھا سنا کرے۔ بعض نے دو رکعت کا پڑھنا جائز رکھا ہے ✦

(۷) اثنائے خطبہ میں ہر ایک قسم کا بولنا منع ہے بلکہ احادیث میں یوں وارد ہے کہ دوسرے کو زبان سے منع بھی نہ کرے۔ چھینک پر الحمد للہ یا کسی کے السلام علیکم کا جواب بھی نہ دے ✦ اگر نیند آجائے تو بہ حکم حدیث اپنی جگہ بدل دے

(۸) بعض لوگوں کا قاعدہ ہے کہ جب مسجد میں آتے ہیں تو لوگوں کے کندھوں پر سے صفیں چیرتے آگے جا بیٹھتے ہیں جس سے اُن کے امن میں ایک گونہ خلل پیدا ہوتا ہے۔ اِس کی سخت ممانعت آئی ہے۔ چاہیئے کہ جہاں موقع بیٹھنے کا ملے وہیں بیٹھ جائے۔ مگر اِس حرکت سے باز رہے۔ چنانچہ فرمایا مَنْ تَخَطّٰی رِقَابَ النَّاسِ[1] یَوْمَ الْجُمُعَةِ اِتَّخَذَ جِسْرًا اِلٰی جَهَنَّمَ۔ سب سے اگلی صف میں پہلے آکر رو بقبلہ بیٹھ جانا موجب ثواب عظیم ہے۔ مگر اکڑو بیٹھنا منع ہے ✦

(۹) اہل السنّت والجماعۃ کے نزدیک جمعہ کا وہی وقت ہے جو نماز ظہر کا ✦

(۱۰) سُنّت یہی ہے کہ امام خطبہ منبر پر کھڑا ہو کر پڑھے۔ پہلے خطبہ کے بعد امام کا نیچے درجہ پر آجانا اور پھر اُٹھ کر اوپر کے درجہ پر چلے جانا ممنوع ہے ✦

---

[1] جو شخص جمعہ کے دن نمازیوں کے کندھے پر سے گذر کر آگے جاتا ہے وہ اپنے لئے جہنم کی طرف ایک پُل بناتا ہے۔ ۱۲ منہ ✦

(۱۱) امام کا منبر پر چڑھتے وقت السلام علیکم کہنا ضعیف مذہب ہے ۔

(۱۲) دوسرے خطبہ میں امام کا درود پڑھتے وقت صلیٰ وصام اور قعد وقام پر دائیں اور بائیں منہ پھیرنا بدعت ہے ۔

(۱۳) خطبہ کے وقت ہر ایک قسم کی نماز مکروہ ہے ۔ ہاں اگر صبح کی نماز نہ پڑھی ہو اس کی قضا بہ غرض حفظ ترتیب کرلے ۔ ہر دو خطبہ میں بحالت وقفہ دُعا کرنا مسنون نہیں (بعض نے دِل میں دُعا کرنا جائز رکھا ہے ۔

(۱۴) دوسرے خطبہ کے اخیر پر آیہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ . الخ پڑھی جاتی ہے ۔ مگر سُنّت میں اسکا کچھ پتہ نہیں ۔ اس کی اصل یہ ہے کہ خلفائے بنی اُمیہ خطبہ کے اخیر پر جناب علی کرم اللہ وجہہ کے حق میں طعن وتشنیع کیا کرتے تھے جب خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رض جو نہایت متقی اور پارسا شخص تھے خلیفہ ہوئے تو اُنہوں نے حکماً اس بُری روش کا انسداد کردیا ۔ اور اس کی جگہ آیت مذکورہ بالا کے پڑھنے کا حکم دیا ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالےٰ مسلمانوں کو عدل احسان اور حقوق اہلِ قرابت کی نگہداشت کا حکم دیتا ہے ۔ اور ہر ایک قسم کے فحش فعل بد اور بغاوت سے روکتا ہے تب سے خطباء بدستور پڑھتے چلے آتے ہیں مگر اس کے پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ قرآن مجید کا خطبہ میں بطور وعظ پڑھنا سب سے افضل ہے ۔

(۱۵) امام کو چاہیئے کہ نماز جمعہ میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون پڑھے یا سورۂ اعلےٰ اور سورۂ غاشیہ ۔ مگر بطور لزوم نہیں ۔ کبھی کبھی اس روش کو بدل دے ۔

(۱۶) اہلِ حدیث کے نزدیک جو شخص کہ خطیب ہو وہی امام ہونا چاہیے ۔ مگر اہلِ سنّت والجماعت کے نزدیک خطیب غیر امام بھی ہو سکتا ہے مگر باذن خطیب ہونا چاہیئے ۔

(۱۷) جو شخص پیچھے آکر جمعہ میں شامل ہو وہ باقی کی نماز ادا کر سکتا ہے۔ اگر دوسرے قعدہ میں ملا ہو تو اُسے ظہر پڑھنی چاہیئے۔ رکوع میں ملنے کی صورت میں اختلاف ہے مگر صحیح مذہب یہ ہے کہ جمعہ نہیں ہوا۔ ظہر پڑھے *

(۱۸) اگر جمعہ اور عید کی نماز ایک دن اکٹھی ہو جائیں تو فرض جمعہ ساقط ہو جائیگا لیکن ادا کیا جائے تو موجب ثواب ہے *

(۱۹) جمعہ کے دن صدقہ۔ استغفار اور کثرتِ درود شریف موجب ثواب عظیم ہے *

(۲۰) قبل از نماز جمعہ سفر کرنا منع ہے۔ اگر دوسری جگہ جمعہ مل جانے کا یقین ہو تو ڈر نہیں۔ سلف صالحین کا دستور تھا کہ نماز جمعہ کے لئے صبح ہی سے اہتمام کرتے اور تمام سُنتیں و مستحبات کی نگہداشت کو ملحوظ رکھتے اور اس فرض عظیم کے بجا لانے میں حضور علیہ السّلام کی اس وعید کو کبھی فراموش نہ کرتے منؔ ترك الجمعة ثلاثا من غير عذر طبع الله على قلبه۔ بلکہ بعض سلف تو جمعرات کو مسجد ہی میں بسر کرتے۔ تمام رات تلاوت و ذکر و استغفار میں مشغول رہتے اور اس عبادت کے ساتھ جمعرات اور جمعہ اور ہفتہ یعنی تین دن کے روزہ کی عبادت بھی ملا لیتے۔ الغرض ان بزرگواروں نے جمعرات اور جمعہ کو ازبس غنیمت سمجھ رکھا تھا۔ بعد میں جب لوگوں کی ہمتیں پست ہو گئیں تو عین خطبہ یا جماعت کے وقت مسجد میں آنا شروع ہوا۔ اور آہستہ آہستہ جمعہ پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔ الّا ما شاء اللہ *

ناظرین کو چاہیئے کہ مذکورہ بالا ہدایات کو خوب ضبط رکھیں۔ اور بہ نیت تقرب الی اللہ ان پر عمل کریں۔ تاکہ بموجب فرمان نبوی یہ اعمال گناہ کا کفارہ ہو سکیں۔ واضح ہو کہ نماز تمام حضور علیہ السّلام کی تعلیم کا اصل اُصول ہے کیونکہ بدوں اسکے

لہ جو شخص بلا عذر تین جمعہ نہ ادا کرے خدا اُس کے دِل کو زنگ آلودہ کر دیتا ہے۔ ۱۲ منہ

[ت]کمیل ایمان نہیں ہوسکتی - آپ کو نماز جان سے بھی زیادہ عزیز تھی - بلکہ غور کرو تو معلوم [ہ]وگا کہ حضور علیہ السلام کی بعثت سے صرف نماز کی تبلیغ مقصود تھی۔ تعجب کی بات ہے [کہ] ایک ایماندار کا ایمان کیونکر ترک نماز کا متقاضی ہوسکتا ہے - یہ کیسی ناعاقبت [ان]دیشی اور بے حیائی ہے کہ نماز جیسے ضروری حکم کو بعض لوگ سرسری سمجھ کر ٹالدیتے [ہ]یں - بھلا ان نماقلوں سے کوئی یہ تو پوچھے کہ تمہارا یہ طریقِ غفلت کس کے حق میں وبال [ج]ان ہوگا ؎

دریں دیر مکافات آنکہ بد کرد
نہ با جانِ کسے با جان خود کرد

[ا]ے ناظرین خدا کے لئے غور کرو اور اپنے تئیں دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ مرتے وقت [پ]چھتانا کچھ مفید نہیں ہوگا۔ دُنیا روزے چند است عاقبت کار با خداوند است۔ [خ]دا ہر ایک مسلمان کو توفیق دے - آمین ؛

روزہ

عربی میں لفظ صوم کے معنی روکنے کے ہیں۔ مگر اصطلاح شرعی میں روزہ کے معنی بہ نیت عبادت دن بھر کھانے پینے اور جماع کرنے سے باز رہنے کو کہتے ہیں ؛

روزہ کیوں مفروض ہوا ؟

تمام عبادات شرعیہ میں یہ امر بالاشتراک ملحوظ رکھا گیا ہے کہ نفس کو ہر ایک قسم کی ظاہری اور باطنی آلائشوں سے پاک وصاف کیا جائے۔ کیونکہ بدوں اس کے خدا کی محبت اور معرفت کا دروازہ نہیں کھلتا - اور جو شخص معرفت ذات باری سے اس عالم میں غافل رہا ہے اس کے لئے آئندہ زندگی میں کسی قسم کی صلاح وفلاح نہیں - مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی - انسانی زندگی کا اعلےٰ اور اہم مقصد یہی ہے کہ اسے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تکمیل میں صرف کیا جائے - اگر یہ نہیں تو یوں سمجھو کہ گویا

بھی نہیں۔ یہ امر مسلم ہے کہ جس قدر محسوسات اور مادی اشیاء کے تعلقات اور انکے بد اثر نفس پر کم پیدا ہوگا۔ اُسی قدر امور عقلیہ اور معارف وحقائق کی کنہ تک رسائی حاصل ہوگی۔ جو لوگ شب و روز تن پروری اور نفس پرستی میں مستغرق اور ہر ایک قسم کی جائز و ناجائز عیش وعشرت میں منہمک رہتے ہیں یقیناً لذتِ معرفت اور نورِ ایمان سے محروم رہتے ہیں۔ انسان کی حقیقی غایت معرفت ذاتِ باری کا حاصل کرنا ہے اور یہ امر بدلائل عقل ونقل پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ بدوں ریاضتِ نفس یہ بات ممکن نہیں چنانچہ تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہی رہا ہے کہ اُنھوں نے بذریعہ تعلیم وحی اپنی اپنی اُمتوں کو ریاضت نفس کے طریق بتائے ہیں۔ نماز۔ روزہ حج۔ زکوٰۃ ایسے اُمور ہیں جن میں بجائے خود ہر ایک ریاضت نفس کا بڑا بھاری ذریعہ ہے۔ اور غور کرکے دیکھو کہ بدوں اِن اُمور کی پابندی کے نفس کو اسکی بدلگامیوں سے روکنے کا کوئی چارہ نہیں۔ اگر اِن فرائض کی پابندی ایسے طور پر کی جائے کہ اُن کے ظاہری اور باطنی آداب وارکان وشرائط ولوازم کو کما حقہ ملحوظ رکھا جائے جن میں سے اوّل اور ضروری اخلاص نیّت ہے تو کچھ شک نہیں کہ اِس کا نتیجہ ایک ایسا عظیم الشّان امر ہے جس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ اور یہی حقیقی صلاح وتقویٰ ہے جس کی ضرورت بار بار آیات قرآنیہ میں مذکور ہوئی ہے۔ روزہ کو ریاضت نفس میں جس قدر دخل ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں اور اس کی تہ میں جو خوبیاں پوشیدہ ہیں ان کو سوائے ایک خالص الایمان آدمی کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خداوند کریم اپنے سب بندوں پر سب سے بڑھکر مہربان ہے۔ اس لئے ممکن نہیں کہ جہاں ہم اس کو کامل الحکمۃ اور وسیع الرحمۃ تسلیم کرتے ہیں ہیں کوئی ایسا حکم دے جو بے نتیجہ اور موجب تکلیف ہو۔ اور نہ ہی اس کو کوئی ذاتی فائدہ ہماری تکلیف میں مدنظر ہے۔ وہ غنی ہے اُسے ہماری عبادات کی کیا پروا

وہ جیسا ہے اُسے ہماری نمازوں کی کیا ضرورت ؟ بلکہ اس نے محض اپنی رحمتِ کاملہ اور حکمت بالغہ سے ہمیں ہماری ہی بہتری کے لئے جناب سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلّم کی وساطت سے چند باتیں بتلائی ہیں جن کو بظاہر ناعاقبت اندیش جو محض عیش پرستی ہی کو انسانی زندگی کا اعلےٰ مقصد تصوّر کئے بیٹھے ہیں اپنے حق میں بوجھ اور باعث زحمت خیال کرتے ہیں۔ اِس کی ادنیٰ اور روزمرّہ چشم دید مثال یہ ہو سکتی ہے کہ ڈاکٹر اپنی تجویز طبی کے مطابق کسی شخص پر عمل جراحی کرتا ہے۔ جس کو بظاہر مریض کے حق میں موجبِ تکلیف خیال کیا جاتا ہے۔ مگر درحقیقت کوئی سمجھدار آدمی یہ نہیں کہیگا کہ ڈاکٹر مریض کے حق میں دشمنی اور بدخواہی کر رہا ہے۔ کیونکہ اگر ڈاکٹر ایسا نہ کرے تو اس کا نتیجہ یہ ہو کہ مریض مر جائے۔ اِس لئے عبادات شرعیہ کو موجب تکالیف سمجھنا اور بظاہر عارضی تکلیف سے جی چرا کر عاقبت کے دائمی ہولناک عذاب میں مُبتلا ہونا کونسے عاقل کا کام ہو سکتا ہے ؟ ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ روزہ کی مشروعیت دیگر فرائض کی طرح صرف ریاضت نفس کے لئے قرار پائی ہے جو بالآخر اُمور عقلیہ اور لذّات روحانیہ کا موجب ہوتی ہے تصفیہ و تزکیۂ باطن کے لئے روزہ اکسیر ہے مگر اِس کی خوبی کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس کو عبادت سمجھ کر بجا لاتے ہیں۔ جو لوگ حیوانوں کی طرح شب و روز شکم پروری اور عیش پرستی کے عادی ہیں۔ ممکن ہے کہ اُن کے لئے روزہ وبالِ جان ہو۔ چنانچہ ماہ رمضان کی تشریف آوری کا نام سن کر اُنکے دِل منقبض ہونے لگتے ہیں۔ مگر جنہوں نے اس کی رُوحانی کیفیات سے کچھ بھی حِصّہ لیا ہے ان سے دریافت کیجئے کہ یہ عارضی اور نام نہاد تکلیف ان کو کس قدر مسرّت بخشتی ہے ! اور کس قدر فضول اشغال اور دیگر منہیات اُن سے چھوٹ جاتے ہیں۔ اور باایں ہمہ اِس سے تمدّنی ضرورتوں میں کسی قسم کا خلل نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ کوئی پست خیال یہ کہنے لگے کہ روزہ ضعف اور نقاہت پیدا کر کے

. . . .

آدمی کو کاروبار سے روک دیتا ہے - سو ایسے شخص کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حسنِ ارادہ
اور صدقِ نیت کے سامنے یہ خیال خاک بھی وقعت نہیں رکھتا - یہ خیال اس امر کا
نتیجہ ہے کہ تم نے حقیقتِ عبادت کو نہیں سمجھا اور نفس کو عیش پرستی کا عادی بنا رکھا
ہے - ایسے بھی مردانِ خدا ہیں جو دن بھر کام میں لگے رہتے ہیں اور ساتھ ہی روزہ
بھی رکھتے ہیں اور وہ اِس خفیف تکلیف کو تکلیف نہیں سمجھتے - اور بصورتِ معذوری
شریعت نے جبر بھی نہیں کیا - ہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ روزہ کس طرح نفس کے مطیع
کرنے اور اُسکو قابو میں لانے کا ذریعہ ہو سکتا ہے - سو جو شخص گناہ کی حقیقت اور
اس کے بواعث کو سمجھ سکتا ہے وہ جانتا ہے کہ قوا انسانی کا قوی العمل ہونا ان
قوا کی صحت اور قوت پر موقوف ہے - ظاہر ہے کہ بلاقید اکل و شرب سے جب نفس
کو روک دیا جائیگا تو قوا کی روشِ عمل میں بھی کسی قدر کمی واقع ہو جائے گی اور جذبات
جوانیہ کے جوش میں ایک گونہ رکاوٹ عائد ہو گی - اور یہ امر ذکرِ الٰہی کا واسطہ بن کر
روزہ دار کو لذتِ معرفت کی طرف کھینچ لائیگا - اور یہ جو بعض آثار میں آیا ہے کہ
(اَلْجُوْعُ طَعَامُ الْاَنْبِيَاءِ (بھوک انبیا علیہم السلام کا کھانا ہے) اِس سے اس امر کی
طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ چونکہ انبیا نفس پرستی سے بالکل پاک ہوتے ہیں بلکہ انہیں
اکل و شرب وغیرہ امور سے اُسی قدر تعلق ہو سکتا ہے جس سے جسمانی زندگی کا سلسلہ
قائم رہ سکے - اِس لئے وہ سب سے بڑھکر روحانی کمالات کے مالک ہوتے ہیں - بھلا
یہ بھی کوئی انسانیت ہے کہ کوئی خناس کثرت اکل و شرب سے ہر وقت خر کناس[1] کی طرح
لدا پھرے - ایسے آدمی کو جس کا اہم مقصد اکل و شرب ہو نورِ معرفت کیا خاک حاصل ہو گا
بلکہ انواع و اقسام کی بیماریاں اسی ایک اکل و شرب کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتی ہیں

[1] بھنگی کا گدھا جو نجاست کشی کا کام دیتا ہے ۱۲ منہ

135265

اندروں از طعام خالی دار تا دراں نورِ معرفت بینی

تہی از حکمتی بعلتِ آں کہ پُری از طعام تا بینی

حق یہ ہے کہ جو لوگ انوارِ حکمت کو مشکوٰۃِ نبوت سے حاصل کرتے ہیں وہ اپنے منعم حقیقی کے حکم کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا کو کبھی نظرانداز نہیں کرتے۔ اسی مضمون کو جناب پیغمبر علیہ السّلام نے ایک موقع پر یُوں ظاہر فرمایا ہے اَلْبِطْنَةُ رَأْسُ کُلِّ دَآءٍ[ملہ]۔ اور پھر دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا کُلُوْا فِیْ بَعْضِ بَطْنِکُمْ تَصِحُّوْا[ملہ]۔ الغرض انبیاء علیہم السّلام اور جو لوگ اُن کے آثار قدم پر چلتے ہیں بالاتفاق پیٹ بھر کے کھانے کو بُرا سمجھتے رہے ہیں۔ یہ تو ایک موٹی سی بات ہے کہ جب پیٹ غیرمعمولی بھر جائے تو علاوہ ازیں کہ ایسا شخص کسی جسمانی بیماری کا محلِ خطر ہو تفکّر و تدبّر اور مسائل دقیقہ میں غور و خوض نہیں کرسکتا حواس خمسہ کُند ہوئے اور رجائی پر جمائی آنے لگی۔ نیند نے غلبہ کیا اور اعضاء ڈھیلے پڑ گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ نماز اور دیگر امور ضروریہ بالکل چھوڑنے پڑے۔ چارپائی پر لیٹا اور اُس وقت کروٹ لی جبکہ آفتاب نکل آیا۔ بھلا ایسی حالت میں ایسے شخص سے کیا اُمید ہوسکتی ہے کہ وہ فرائض انسانی کو خواہ دینی ہوں یا دُنیوی بجا لائیگا؟

موجودہ روزہ بتدریج مفروض ہوا

مؤلف تفسیر احمدی نے روزہ کی تدریجی کیفیّت کو حسب ذیل لکھا ہے کہ شروع اسلام میں صرف ایک دن کا روزہ فرض تھا۔ یعنی شریعت موسوی کے مطابق صرف یوم عاشورا کے روزہ کا دستور تھا۔ بعد میں ہر ماہ کے تین دن یعنی تیرھویں۔ چودھویں اور پندرھویں تاریخ کو روزہ کے لئے خاص کیا گیا۔ ان ایّام کو ایام بیض کہتے ہیں۔ بعدازاں بجائے ہرسہ مذکورہ بالا تاریخوں کے ماہ رمضان کو روزہ کے لئے مخصوص کیا گیا۔ مگر اس میں ہر

ملہ پیٹ بھر کر کھانا تمام بیماریوں کی جڑ ہے ۱۲ منہ۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ پیٹ بھر کر کھانا تمام روحانی اور جسمانی بیماریوں کا اصل اُصول ہے ۱۲ ملہ پیٹ کا کچھ حصّہ بھرو اور کچھ خالی چھوڑ دو۔ اسی میں تمہاری صحت ہے۔ ہمارے ہاں بعض اصحاب پورا بھر کر بھی بس نہیں کرتے ۱۲ منہ

ایک شخص کو اختیار تھا کہ اپنی مرضی سے خواہ وہ روزہ رکھے یا بالعوض ایک دن نصف صاع گندم کسی مسکین کو دیدے۔ بعض نیچریوں نے ماہ رمضان کے روزہ فرض ہونے پر بھی یہی حکم لگایا ہے۔ مگر صاحب تفسیر رحمانی اور دیگر مفسرین نے اس کو رد کیا ہے۔ روزہ کی بجائے فدیہ کا ادا کرنا ہر ایک شخص کے لئے کسی نے تجویز نہیں کیا صرف وہی لوگ اس حکم میں داخل ہیں جو غایت پیری اور ناتوانی کی وجہ سے روزہ رکھنے سے معذور ہیں۔ ایسے شخص کو شیخ فانی کہتے ہیں۔ جب لوگ روزہ رمضان کے کسی قدر عادی ہو گئے تو اختیار مذکورہ بالا بھی واپس لے لیا گیا۔ اور روزہ ہر ایک کے لئے فرض قرار پایا۔ مگر قریباً آٹھ پہر کا روزہ رکھنا پڑتا تھا یعنی غروب آفتاب سے عشا تک افطار اور باقی تمام وقت روزہ۔ بعدازاں جب آیہ عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ فَتَابَ عَلَیْکُمْ وَعَفَا عَنْکُمْ نازل ہوئی تو روزہ کا وقت طلوع فجر سے غروب آفتاب تک قرار پایا۔ اور پھر اسی پر روزہ کی فرضیت ہمیشہ کے لئے قائم ہوگئی ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ روزہ کا مذکورہ بالا تدریجی صورت میں ترقی کرکے فرض شرعی قرار پانا بالکل دیگر احکام شرعیہ کے مطابق ہے۔ مثلاً نماز کے لئے پہلے کوئی وقت اور تعیین رکعات وغیرہ نہ تھی۔ مگر آہستہ آہستہ پنجگانہ فریضہ کی صورت میں قرار پائی۔ علےٰ ہذا حرمتِ خمر۔

بعض ملاحدہ کا روزہ کے متعلق ایک باطل خیال
ملحدین روزہ کو منافی صحت خیال کرتے ہیں

یہ خیال صرف انہیں لوگوں کا ہے جو احکام شرعیہ کو ایک فرضی یا وہمی ضرورت پر مبنی کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ قوم کی ابتدائی حالت بجز ان شرعی پابندیوں کے درست نہیں ہو سکتی تھی۔ اب جبکہ مغرب کی طرف سے نئی ترقی کا ایک تلاطم خیز دریا بہتا ہوا تمام روئے زمین کو سیراب کر رہا ہے ان وحشیانہ رسوم کو بالکل ترک کر دینا چاہئے

روزہ کی نسبت ان لوگوں کا خیال ہے کہ وہ صحت میں خلل پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی پوچھے کیوں حضرت جو لوگ گرمی کے دنوں میں جبکہ واقعی روزہ سے روزہ دار کو تکلیف محسوس ہوتی ہے روزہ رکھتے ہیں تو وہ اچھے بھلے ہٹے کٹے نظر آتے ہیں۔ اور آج تک ہم نے کبھی نہیں سنا کہ کوئی شخص روزہ رکھنے سے بیمار ہو گیا۔ ہاں ایک عارضی معمولی ضعف کا پیدا ہو جانا تو کوئی بڑی بات نہیں اور روزہ رکھنے کا بڑا اہم مقصد بھی یہی ہے کہ قوائے بہیمیہ کے جوش کو کسی قدر کم کیا جائے اور اگر درحقیقت کوئی بیمار ہے تو شریعت اس سے مواخذہ بھی نہیں کرتی بلکہ اس پر قضا لازم ہے تو اس وقت ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں ڈاکٹر نے یہ مشورہ دیا ہے۔ اوّل تو اس جواب سے ان لوگوں کی ایمانی طاقت کا اندازہ لگانا چاہیئے کہ احکام شرعیہ کے مقابل باآنکہ غیر معذور ہیں ڈاکٹر کی وہمی تجویز کو زیادہ قابلِ وقعت سمجھتے ہیں۔ دوم میں ہرگز یقین نہیں کر سکتا کہ کوئی پابندِ شریعت دیسی ڈاکٹر ایک تندرست نوجوان کی نسبت روزہ سے بیمار ہونے کا خیال ظاہر کرے بلکہ کئی ایک ڈاکٹر صاحبان بڑے متقی اور پارسا موجود ہیں جو احکام شریعت کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں۔ اور اگر یہ خیال کسی یوروپین یا ہندو یا نیچری مسلمان ڈاکٹر کا ہے تو میرے نزدیک اس لغو خیال کو پاخانہ یا سنڈاس میں پھینک دینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ منافیٔ شریعت ہے۔ یاد رکھو کہ شریعت ایک تندرست مسلمان کو کبھی معافی نہیں دیتی معافی کی صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ سفر اور بیماری۔ ہاں اگر کوئی شخص خود بے حیا ہو کر اپنے تئیں قابلِ معافی سمجھ لے تو یہ علیحدہ بات ہے۔ مگر یہ معافی شریعت کی طرف سے ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کے اپنے نفس کی طرف سے سمجھی گئی ہے۔ جس کی نسبت قرآن مجید میں اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وارد ہو چکا ہے۔ کئی ایک نیچری مزاج لوگوں کا دستور ہے کہ روزہ نہیں رکھتے اور گھر میں پوشیدہ طور پر کھا پی لیتے ہیں اور باہر لوگوں کے سامنے روزہ ظاہر کرتے ہیں یعنی جھوٹ کا ایک زائد گناہ اپنے سر لیتے ہیں اور بعض تو

ایسے بے حیا ہیں کہ علی رؤس الاشہاد کھانا پینا شروع کر دیتے ہیں۔

ماہ رمضان اور روزہ کی فضیلت

ماہ رمضان خیر و سعادت کا مہینہ ہے جس میں ایک ایماندار بہت سی حسنات کا ذخیرہ جمع کر سکتا ہے۔ مثلاً کثرتِ سجود و صدقہ۔ تلاوتِ قرآن شریف اعتکاف وغیرہ ایسے اُمور ہیں جو لزوماً قوتِ بہیمیہ کے اثر کو کھو دیتے ہیں۔ اِسی نکتہ کو جناب پیغمبرؐ نے حدیث ذیل میں بیان فرمایا ہے اِذَا کَانَ اَوَّلُ لَیْلَۃٍ مِنْ شَھْرِ رَمَضَانَ صُفِّدَتِ الشَّیَاطِیْنُ وَمَرَدَۃُ الْجِنِّ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ النِّیْرَانِ فَلَمْ یُفْتَحْ مِنْھَا بَابٌ وَفُتِّحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّۃِ فَلَمْ یُغْلَقْ مِنْھَا بَابٌ وَیُنَادِیْ مُنَادٍ یَا بَاغِیَ الْخَیْرِ اَقْبِلْ وَیَا بَاغِیَ الشَّرِّ اَقْصِرْ وَلِلّٰہِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ وَذَالِکَ کُلَّ لَیْلَۃٍ۔ اس حدیث میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جناب پیغمبرؐ نے ماہ رمضان کے پورا حق ادا کرنے کے لئے کس قدر ثواب عظیم کا پتہ دیا ہے۔ اور اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ مبارک مہینہ اہل ایمان کے لئے روحانی زندگی کا مہینہ ہے۔ البتہ اعتقاد صحیح اور قوتِ ایمان کی ضرورت ہے جو تمام حسنات کا ذریعہ ہیں مگر بد اعتقاد کو اس سے خاک بھی حاصل نہیں۔ ایک حدیث قُدسی میں حضور علیہ السّلام فرماتے ہیں اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ۔ یعنی خداوند کریم فرماتا ہے کہ روزہ میرے لئے ہے اور میں بلا شرکت غیری روزہ دار کو اس کی جزا دیتا ہوں اس میں روزہ کے اعلےٰ درجے کے ثواب کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ مِنَ النَّارِ۔ یعنی روزہ دوزخ کی آگ سے بچنے کے لئے ڈھال ہے ... اللہ صاحب کتاب حجۃ البالغہ میں یوں لکھتے ہیں وَالصَّوْمُ حَسَنَۃٌ عَظِیْمَۃٌ

بڑی بھاری نیکی ہے جو روزہ دار کی قوت ملکی (روحانی) کو قوی کرتی ہے اور اُسکی قوۃ بہیمی ... دیتی ہے اور آئینہ قلب کی صفائی اور نفسانی خواہشات کا زور توڑنے میں ... نہیں اور اسی امر کی طرف حدیث الصوم لی ... الخ میں اشارہ کیا گیا ... کر دیتا ہے۔ جسقدر قوۃ بہیمی کمزور ہوتی ہے روزہ سے انسان کو عالم ملکوت ... بہیمی کے ضعف پر یہ تعلق مشابہت پیدا ہوتا ہے ۱۲ منہ

...وی الملکیۃ ویضعف البھیمیۃ ولا شیٔ مثلہ فی میقلۃ وجہ الروح و ...ر الطبیعۃ ولذلک قال اللہ تعالیٰ الصوم لی وانا اجزی بہٖ ویکفر الخطایا ...ذ ربما اضمحل من سورۃ البھیمیۃ و یحصل بہ تشبہ عظیم بالملائکۃ ...یحبونہ فیکون متعلق الحب اثر ضعف البھیمیۃ۔۔۔ الخ

روزہ داروں میں اختلاف مدارج

یہ تو عوام اہل اسلام کا روزہ ہے کہ وہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور جماع سے مجتنب رہتے ہیں۔ مگر خاص بندگانِ خدا کا روزہ ہر ایک ممنوع امر سے مجتنب رہنے پر پورا ہوتا ہے۔ گو خارج از رمضان بھی ہر ایک قسم کی برائی سے بچے رہنا صفائے روح کے لئے شرط ہے۔ مگر ماہِ رمضان میں بالخصوص اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ تمام اعضاء کی محافظت کرنا چاہیے کہ وہ کسی ناجائز عمل میں حرکت نہ کریں۔ زبان کو ہر ایک قسم کے فحش۔ جھوٹ۔ غیبت وغیرہ سے اور کان کو ایسی باتوں کے سننے سے اور آنکھ کو ناجائز چیزوں کے دیکھنے سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ اہلِ دل ان دنوں اہلِ دنیا کی مجالس میں آمدورفت کم کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ہاں سوائے لغو اور بیہودہ باتوں کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص روزہ رکھتا ہے اور لغویات سے نہیں بچتا۔ اسے روزہ سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں۔ پھر فرمایا اگر کوئی تم سے جھگڑنے لگے تو اسے کہہ دو کہ میں روزہ دار ہوں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ اور اس قسم کی باتیں باہم ضدین ہیں جس طرح کوئی شخص نماز میں صرف ظاہری طہارت پر زور دیتا ہے اور طہارت قلب کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اور وہ تصفیۂ باطن کی لذت کو نہیں پا سکتا۔ اسی طرح اس روزہ دار کی حالت ہے۔ جو بظاہر اکل و شرب وغیرہ سے تو بچتا ہے مگر دیگر ممنوعات شرعیہ سے پرہیز نہیں کرتا۔ اس لئے وہ لذتِ روحانی کو ہرگز نہیں پا سکتا۔ بھلا خدا کو

کیا ضرورت پڑی کہ بھوکوں مرنے پر کسی کو مجبور کرے جس میں خدا کا تو کیا فائدہ ہوگا خود اُس شخص کو بھی کچھ بہرہ نصیب نہیں۔ روزہ دار کو بڑی احتیاط کرنی چاہیئے کہ ناجائز نظر اور دل میں بُرے خیال کے پیدا ہونے اور غیبت۔ فحش جھوٹ وغیرہ کے کہنے سُننے سے حتّی الوسع بچا رہے۔ اور بسا اوقات ذکر یا تلاوت قرآن شریف میں مشغول رہے ؛

روزہ کے متعلّق بعض ضروری احکام

(۱) ہلال رمضان اگر ۲۹ شعبان کو بوجہ ابر یا مطلع صاف نہ ہونے کے نظر نہ آئے تو دوسرے دن شک کی حالت میں روزہ نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ شعبان پورے تیس دن کا سمجھنا چاہیئے۔ اِسی طرح ۲۹ رمضان کو بھی اگر ایسی ہی حالت ہو تو تیس دن رمضان کے پُورے کرنے ہونگے ؛

(۲) شروع رمضان سے پہلے شعبان کے اخیر پر ماہِ رمضان سے متصل کسی قسم کا روزہ نہیں ؛

(۳) ہلال شوال کے متعلّق دو عدل گواہوں کی شہادت ضروری ہے اور ہلال رمضان صرف ایک شاہد عادل کی شہادت سے بھی ثابت ہوتا ہے اور بعض آئمہ نے یہاں بھی دو عدل کی شہادت کو ضروری قرار دیا ہے ؛

(۴) اگر ایک شہر میں رویت ہلال ہو جائے اور دوسرے شہر میں نہ ہو تو جس شہر میں نہیں ہوئی وہاں کے لوگوں پر روزہ واجب نہیں۔ کیونکہ ہر ایک جگہ کا مطلع علیحدہ علیحدہ ہوا کرتا ہے۔ اِس مسئلہ میں آئمہ کا اختلاف ہے مگر عموماً یہ بات بعید فاصلہ کے شہروں میں واقع ہوتی ہے ؛

(۵) افطار میں حتّی الوسع جلدی کرنا چاہیئے اور اگر ہو سکے تو خرما سے ورنہ پانی کے چند جرعہ سے افطار کرلے ؛

(۶) سحور ذرا دیر کرکے کھانا مستحب ہے یعنی طلوع فجر سے تھوڑی دیر پہلے۔ بعض وسواس زدہ طبیعتیں ذرا کچھ دیر ہوئی تو کھانا موقوف۔ مگر شریعت نے ایسا تشدد نہیں کیا۔ چنانچہ بعض آئمہ کے نزدیک فجر احمر یعنی سرخ فجر یا صبح صادق تک بھی سحور کا وقت آچکا ہے۔ اور ایک حدیث میں فجر مستطیر کا لفظ آیا ہے جس سے وہ وقت مراد ہے جبکہ سیاہی کے بعد سفیدی ظاہر ہو جائے ؁

(۷) سحری کھانا موجب ثواب ہے حدیث میں آیا ہے۔ فی السحور برکۃ ؁

(۸) سفر میں روزہ کے بارہ میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ مگر صحیح یہی ہے کہ اگر کوئی تکلیف یا حرج نہ دیکھے تو روزہ افضل ہے ورنہ افطار۔ بہر صورت مسافر کو شرعی اختیار بروئے نص قرآنی حاصل ہے۔ مجاہدین اور حاملہ یا شیر دہندہ عورت کو بھی اختیار افطار حاصل ہے ؁

(۹) کسی مرے ہوئے شخص کی طرف سے بھی جبکہ مرنے والا روزہ نہ رکھ سکا ہو روزہ رکھنا جائز ہے۔ جس طرح اس کا قرض دنیوی ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہ حکم عام ہے۔ خواہ روزہ ماہِ رمضان کا ہو خواہ اُس نے نذر مان رکھا ہو ؁

(۱۰) پچھنے لگوانے اور قے کرنے اور احتلام سے روزہ فاسد نہیں ہوتا مگر اس مسئلہ میں بھی بعض آئمہ کا اختلاف ہے ؁

(۱۱) بھول کر کسی چیز کے کھانے پینے یا جماع کرنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا ؁

(۱۲) اگر عمداً ایسا کرے تو بعض کے نزدیک صرف قضا لازم آتی ہے اور دیگر بعض کے نزدیک قضا اور کفارہ ہر دو۔ اسکا کفارہ وہی ہے جو ظہار کے لئے قرآن مجید میں مذکور ہے ؁

(۱۳) مسواک کرنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا مگر بعض آئمہ دن کے پچھلے حصہ میں مکروہ کہتے ہیں ؁

(۱۴) سُرمہ کا استعمال بعض کے نزدیک مکروہ ہے۔ مگر صحیح یہی ہے کہ کچھ حرج نہیں

(۱۵) اپنی عورت کا بوسہ لینے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا مگر جوان آدمی کے لئے مکروہ ہوتی ہے ؛

(۱۶) امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا مذہب ہے کہ روزہ رمضان۔ روزۂ نفل اور روزہ نذر معین کے لئے نیّت آدھا دن گذرنے پر بھی ہو سکتی ہے اور روزۂ قضا اور کفارہ اور نذر مطلق میں رات ہی سے نیّت کرنا چاہیئے مگر اس مسئلہ میں بہت اختلاف ہے۔ ہر ایک مذہب کے دلائل اپنے اپنے مواقع پر شرح وبسط سے مذکور ہیں ؛

(۱۷) اگر نفلی روزہ ہو اور کوئی شخص دعوت پر بلائے تو روزہ افطار کرے۔ نذر قضا وغیرہ میں یہ حکم نہیں مگر امام ابوحنیفہؒ صاحب جائز نہیں رکھتے۔ بدلیل لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ ؛

(۱۸) جناب پیغمبر علیہ السلام عموماً ہر جمعہ کو روزہ کیا کرتے۔ اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ صرف جمعہ کے دن روزہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اس کے ساتھ پہلے یا پیچھے ایک اور روزہ بھی ملا لینا چاہیئے۔ مطلب یہ کہ صرف اکیلا جمعہ کا روزہ صحیح نہیں ؛

(۱۹) یوم عرفہ کا روزہ موجب ثواب عظیم ہے مگر عرفات میں نہیں ؛

(۲۰) یوم عاشورار کا روزہ موجب اجر جزیل ہے۔ قبل از صوم رمضان یہ روزہ واجب تھا۔ چونکہ یوم عاشورار میں اختلاف ہے۔ کیونکہ بعض نویں محرم کو اور بعض دسویں محرم کو قرار دیتے ہیں۔ اِسلئے ہر دو دن روزہ کیا جائے تو اچھا ہے ؛

(۲۱) ماہ رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے موجب اجر عظیم ہیں متواتر ہوں یا متفرّق ؛

(۲۲) ہر دو عید اور عید اضحٰے کے تین دن بعد کا روزہ منع ہے۔ اِن تین دنوں کو ایام تشریق بولتے ہیں ؛

(۲۳) دو دن یا تین دن متواتر روزہ رکھنا اور شام کو افطار نہ کرنا بلکہ رات کو روزہ ہو اور دنکو بھی پھر تیسرے یا چوتھے دن افطار کیا جائے منع ہے کیونکہ یہ موجب ضعف ہے۔ جناب پیغمبرؐ ایسا کرنے سے مستثنیٰ تھے۔ اِس صورت کو وصال بولتے ہیں ✤

(۲۴) اگر کوئی شخص جُنب ہو تو فجر کے طلوع کرنے پر بھی نماز کے لئے غسل کرسکتا ہے اور روزہ فاسد نہیں ہوگا ✤

(۲۵) حیض و نفاس والی عورت کو اِن ایام میں روزہ معاف ہے۔ مگر قضا لازم ہے ✤

(۲۶) عورت روزہ نفلی جبکہ شوہر اِسکا گھر میں مقیم ہو بدوں اجازتِ شوہر نہیں رکھ سکتی۔ مگر جب سفر میں ہو تو عورت کو اختیار ہے ✤

(۲۷) اگر کہیں مہمان ہو تو بدوں اجازت صاحب خانہ روزہ نفلی نہیں کرنا چاہیئے ✤

(۲۸) اگر سفر جانا ہو تو گھر سے کھانا کھا کر جا سکتا ہے۔ گویا گھر ہی میں بہ نیت سفر معافی روزہ ہو سکتی ہے لیکن نماز میں قصر نہیں کرسکتا جب تک گھر سے باہر نہ آئے ✤

(۲۹) حقنہ اور سعوط یعنی ناک میں دوائی ٹپکانے سے روزہ جاتا رہیگا ✤

(۳۰) شیخ فانی یعنی ایسا بوڑھا جو روزہ کی طاقت نہ رکھتا ہو نصف صاع گندم یا پورا صاع غلّہ جو کافی روزہ مسکین کو بطور فدیہ دے سکتا ہے۔ لیکن اگر طاقت روزہ رکھتا ہو تو فدیہ درست نہیں ✤

(۳۱) مسافر اگرچہ رات کو نیت روزہ نہ کرے مگر صبح وقت زوال سے پہلے شہر میں آجائے تو اُسے روزہ کرنا چاہیئے۔ اور اگر صبح کو گھر میں بہ نیت روزہ موجود ہو

پھر سفر کو چل پڑے تو اُسے وہ روزہ پورا کرنا ہوگا ؟

(۳۲) حیض والی عورت اگر دن کے کسی حصّہ میں فارغ ہوجائے تو باقی حصّہ دن روزہ کرے - اور اگر دن کے کسی حصّہ میں حیض شروع ہوجائے اور عورت روزہ دار ہو تو اُسی وقت افطار کرسکتی ہے - مگر قضا لازم آئیگی ؟

(۳۳) بحالت شک غروب آفتاب افطار درست نہیں اور اگر ایسا کرے اُس پر قضا لازم ہوگی ؟

احکامِ مسجد

اِسلام میں مسجد کی خاص عزت ہے - لغت میں اِس کے معنی ہیں ایسی جگہ کے جہاں سجدہ کیا جائے اور چونکہ یہ جگہ اِسی لئے بنائی جاتی ہے کہ یہاں پر خدا کی عبادت کی جائے اِسلئے متبرک اور معظم سمجھی گئی ہے - اگر آپ کو اِس کی فضیلت سُننے کا شوق ہو تو آیئے ہم آپ کو خدائے پاک کی کلام مجید اور اُس کے رسول کریم کی احادیث شریف سے اِس شوق کو پورا کئے دیتے ہیں - مگر ایسے بیان کے سُننے کا مذاق ہونا شرط ہے - کیونکہ یہاں پر ظاہری عمارت کی شان و شوکت کو نفسِ فضیلت میں دخل نہیں بلکہ باطنی اور روحانی اور شرعی شرافت کو قرآن شریف میں ہے - اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ[1] وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ - اِس سے معلوم ہُوا کہ مسجدوں کا آباد کرنا یعنی ان کو تعمیر کرانا یا پہلے کی مرمت کرانا یا اُن میں آکر نماز پڑھنا اور اُن کو آباد رکھنا انہیں مسلمانوں کا کام ہے جو ہدایت یافتہ ہیں - گمراہوں کا کچھ کام نہیں ؟

پھر دوسری جگہ فرمایا - وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ

[1] بے شک خدا کی مسجدیں وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں - نماز پڑھتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور سوا خدا کے کسی اور سے نہیں ڈرتے - بیشک یہی لوگ ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہیں - ۱۲ منہ ؟

تقوی القلوب۔ اِس آیت سے شعائر اللہ کی تعظیم پائی جاتی ہے اور مساجد منجملہ
اُن مکانوں کے ہیں جنکی تعظیم کا حکم ہے۔ جیسے کعبہ۔ عرفات۔ مزدلفہ۔ صفا و مروہ
وغیرہ۔ پس مسجدوں کی تعظیم کرنا خاص پرہیزگاروں کا کام ہے۔
پھر فرمایا۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ
وَسَعٰی فِیْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِیْنَ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا
خِزْیٌ وَّلَهُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔ اِس سے معلوم ہوا کہ مسجدوں کو برباد
کرنے والے اور ان میں ذکر سے منع کرنے والے دُنیا و آخرت میں ذلیل و خوار ہیں۔

احادیث اِس میں بکثرت ہیں۔

(۱) حضرت عثمان رضہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ
کے لئے مسجد بناتا ہے اُسکے لئے خدا جنّت میں گھر بناتا ہے۔

(۲) ابوہریرہ رضہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک
سب سے پیارے مکان مسجدیں ہیں اور سب سے بُرے مکان بازار ہیں۔

(۳) ابوسعید خدری رضہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جس شخص کو
تم دیکھو کہ مسجد کی خدمت اور آبادی کرتا ہے تو اُس کے ایمان کی گواہی دو۔ کیونکہ
خدا فرماتا ہے۔ اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ . . . الخ

(۴) بعض مسجدوں کی خاص عزت ہے۔ جیسا کہ ابن ماجہ نے انس بن مالک رضہ
سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مرد کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا ایک
ہی نماز کا ثواب ہے اور محلّہ کی مسجد میں پڑھنا پچیس نماز کا ثواب ہے اور جامع مسجد

---

[1] جو شخص خدا کے نشانات کی تعظیم کرتا ہے تو بہتر ہے) کیونکہ انکی عزت کرنا پرہیزگاروں کا کام ہے۔

[2] اس شخص سے بڑھکر ظالم کون ہے جو خدا کی مسجدوں میں خدا کا نام لینے جانے سے روک دے اور اسکی بربادی کی کوشش کرے۔ یہ لوگ اس قابل نہیں کہ اس میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کے لئے دنیا میں ذلت اور آخرت میں بڑا عذاب ہے ۱۲ منہ

میں نماز پڑھنا پانچسو نماز کا ثواب ہے۔ اور بیت المقدس میں ایک نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔ اور میری مسجد (مسجد نبوی) میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔ اور بیت الحرام یعنی بیت اللہ میں نماز پڑھنے سے ایک لاکھ نماز کا ثواب ملتا ہے ؞

اللہ اکبر۔ فضائل تو مختصر طور پر آپ کو معلوم ہو گئے اب ہم اس کے کچھ ضروری مسائل لکھتے ہیں۔ جن پر عام مسلمانوں کو پابند ہونا چاہیے۔ اور اکثر لوگ ان سے ناواقف ہیں ؞

(۱) مسجد میں جُنب اور حیض والی اور نفاس والی عورت کو جانا منع ہے ؞

(۲) مسجد کو نجاست وغیرہ سے پاک صاف رکھنا چاہیے ؞

(۳) جنازہ کے لئے میّت کا داخل کرنا منع ہے۔ ہاں اگر بارش وغیرہ کا عذر ہو تو خیر ؞

(۴) مسجد میں تھوکنا۔ ناک صاف کرنا۔ وضو کرنا۔ مضمضہ وغیرہ مکروہ ہے۔ ہاں جبکہ کوئی جگہ اس کام کے لئے خاص مقرر ہو اور اس میں نماز نہ پڑھی جاتی ہو جیسا کہ عموماً مساجد میں ہوتا ہے تو خیر۔ جو شخص تھوکے اُس کا کفارہ یہ ہے کہ اُس کو مٹی سے ڈھانک دے ؞

(۵) مسجد میں کوئی کام مثلاً درزی کا کام کرنا یا اُجرت کی کتابت اور بچوں کو اُجرت پر پڑھانا مکروہ ہے۔ مگر مسجد کی حفاظت کے لئے بچوں کا پڑھانا جائز ہے ؞

(۶) جب مسجد میں آؤ تو پہلے دایاں پاؤں اندر رکھو اور یہ دُعا پڑھو اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ اور جب باہر نکلو تو پہلے بایاں پاؤں باہر نکالو اور پڑھو اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ وَرَحْمَتِكَ۔ بعض روایت میں یوں آیا ہے کہ آنحضرت صلعم جب مسجد میں داخل ہوتے تو یہ کہتے رَبِّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ وَافْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ اور جب نکلتے تو یہ کہتے۔ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ وَافْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ فَضْلِكَ ؞

(۷) مسجد میں آکر وضو کرکے بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز نفل پڑھو۔ اور اگر بار بار مسجد جانے کا اتفاق ہو تو دن بھر میں ایک دفعہ ہی پڑھنا کافی ہے

(۸) ماتم کے لئے مسجد میں بیٹھنا مکروہ ہے۔ ہاں نکاح کی مجلس کا وہاں بیٹھنا مستحب ہے ؛

(۹) مسجد میں اور اُس کی چھت پر جماع کرنا یا پاخانہ کرنا حرام ہے ؛

(۱۰) مسجد میں بُودار چیز کھا کر جانا منع ہے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جو شخص پیاز وغیرہ کھائے تو وہ ہماری مسجدوں کے قریب نہ آئے ؛

(۱۱) مسجد میں بیع و شراء ناجائز ہے۔ مسافر کے سوا کھانا۔ پینا اور سونا اور دُنیاوی کاروبار یا باتیں کرنا منع ہے۔ بعض حدیث میں ہے کہ مسجد میں باتیں کرنے سے نیکیاں یُوں جاتی رہتی ہیں جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ افسوس کہ عموماً مسلمان مسجدوں میں فضول باتوں سے نہیں رُکتے ؛

(۱۲) مسجدوں میں چلّانا خصوصاً منع ہے۔ اور خاصکر مسجد نبوی صلے اللہ علیہ وسلم میں ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دو شخصوں کو جو طائف کے رہنے والے تھے مسجد نبوی میں بُلایا اور کہا کہ تم کہاں کے ہو؟ اُنہوں نے کہا کہ طائف کے رہنے والے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم مدینہ کے ہوتے تو میں تم کو مارتا۔ کیونکہ تم رسول اللہ صلعم کی مسجد میں چلّا کر باتیں کرتے ہو ؛

(۱۳) درجہ میں سب سے بڑھکر مسجد حرام ہے پھر مسجد مدینہ۔ پھر مسجد بیت المقدس پھر جامع مسجد۔ پھر محلّہ کی مسجد۔ پھر شارع عام کی مسجد۔ پھر گھر کی مسجد۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے روضہ اور منبر میں جنّت کا ایک ٹکڑا ہے ؛

(۱۴) گھروں میں بھی مسجد کی ایک جگہ خاص کرنی چاہیئے تاکہ نوافل پڑھے جائیں اور عورتوں کے کام آئے ؛

(۱۵) مسجدوں کو معمول سے زیادہ خوبصورت بنانا مکروہ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ رسول اللہ صلعم سے راوی ہیں کہ مجھ کو مسجدوں کی زینت کرنے کا حکم نہیں ہوا۔ اس پر ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ تم لوگ مسجدوں کو ایسی خوبصورت بناؤ گے جیسا کہ یہود و نصاریٰ بناتے ہیں ؎

(۱۶) مسجد کی دیواروں سے تیمم کرنا بظاہر جائز ہے۔ ممانعت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مگر بعض فقہا نے منع لکھا ہے ؎

(۵) عید الفطر اہل اسلام کے ہاں دو بڑے تہوار منائے جاتے ہیں اور یہ کچھ اسلام پر ہی موقوف نہیں بلکہ ہر ایک مذہب و دین میں عیدوں کے دن مقرر ہیں۔ اور ان دنوں کو متبرک سمجھ کر ان میں خوشی منائی جاتی ہے مگر سبحان اللہ اسلام نے ان دنوں میں اس خوشی سے جس میں لہو ولعب اور بیہودہ اور لغو کھیلیں ہوتی ہیں۔ اپنے ان تہواروں کو پاک رکھا اور اس میں بھی اسلامی عظمت اور خدا کی توحید و عبادت کا اعلان نہ چھوڑا۔ اس کی اصل یہ ہے کہ ابوداؤد نے حضرت انسؓ رضہ سے روایت کی ہے کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ مدینہ کے لوگ سال میں دو دفعہ جمع ہو کر کھیل تماشا اور عیش و عشرت کیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ دن کیسے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم جہالت کے زمانہ میں یعنی قبل از اسلام ان دنوں میں کھیلا کرتے تھے۔ تب رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ خدا نے تم کو ان دنوں سے بہتر دن دیدئے ہیں اور وہ دن عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے ہیں۔ ان دنوں میں عبادت کو لازمی قرار دیا گیا اور یہ دونوں دن شعائر الاسلام میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اور ان کی عزت و حرمت مسلمانوں کا فرض ہے وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ۔ اور شعائر اللہ کی عظمت یہی ہے کہ حکم شریعت کے مطابق ان کے تمام متعلقہ احکام

کو سر انجام دیا جائے ؛

سبحان اللہ۔ کیا پاک مذہب ہے کہ اس کی خوشی منانے کے تیوہار بھی عبادت پر مشتمل ہیں۔ جبکہ دیگر اقوام کے تیوہار عموماً نفس پرستی اور ہر ایک قسم کی لغویت کا نمونہ ہوتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اسلام نے نفس پرستی کے رُو سے کسی امر کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ جن امور سے شریعت حقہ نے روک دیا ہے۔ ان میں ضرور کسی نہ کسی پہلو میں نفس پرستی کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ عید الفطر کا دن جو ایک ماہ کے بعد افطار کا پہلا دن ہوتا ہے اسلام پاک نے بغرض اظہار سپاس مقرر کیا ہے جس سے ہر ایک شخص جو عید کو محض شکم پروری کا دن نہ سمجھے ایک روحانی لذت کا احساس کرسکتا ہے کیونکہ شریعت کے ہر ایک حکم کی بجا آوری سے دل میں ایک تازہ نور ایمان پیدا ہوتا ہے اچھا کھانا۔ اچھا پہننا۔ اقارب و احباب سے ملاقات کرنا۔ بغرض ازدیاد محبت دوسروں کے ہاں کھانا بھجوانا اور دوسروں کی طرف سے بھیجنے والے کے گھر میں آنا صبح اُٹھتے ہی غسل کرنا۔ صدقہ دینا۔ نماز پڑھنا وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے ہماری دینی اور دُنیوی اغراض کی نہایت عمدہ طور پر تکمیل ہوتی ہے ؛

عید الفطر کے موٹے موٹے احکام

(۱) اس دن کا غسل مسنون ہے ؛

(۲) ستھرا لباس پہننا اور روئے خوش کا لگانا مستحب ہے ؛

(۳) صدقہ نماز سے پہلے ادا کرنا چاہئے۔ بعد میں ادا کرنے سے صدقہ فطر تطوع ہوگا نہ صدقہ فطر یعنی واجب سے نفل بن جائیگا ؛

(۴) بعض نے صدقہ فطر کو فرض لکھا ہے اور بعض نے واجب۔ بہرصورت وجوب میں کسی کو کلام نہیں۔ صحیحین میں یوں وارد ہوا ہے اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِصَدَقَۃِ الْفِطْرِ۔ یعنی آپ نے صدقہ فطر ادا کرنے کا حکم دیا ؛

(۵) صدقۂ فطر مرد۔ عورت۔ چھوٹے۔ بڑے۔ آزاد۔ غلام۔ سب پر واجب ہے۔

(۶) جو بچہ عید الفطر کی صبح سے پہلے پیدا ہوا ہو اُس پر بھی واجب ہو جاتا ہے۔

(۷) صدقۂ فطر عید الفطر سے ایک دو دن پہلے دیدینا بھی جائز ہے۔ کیونکہ بحکم آیہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔ نیک کام میں جلدی کرنا بہتر ہے۔ مگر مناسب یہی ہے کہ عید الفطر کی صبح کو سویرے قبل از نماز عید ادا کرے کیونکہ مساکین کو اگر صبح سویرے مل جائے تو انہیں بھی اغنیاء کے ساتھ مل کر کھانا اور نماز ادا کرنا نصیب ہو جاتا ہے۔ ایک صحیح حدیث میں طُهْرَةٌ لِلصَّائِمِ وَطُعْمَةٌ لِلْمَسَاكِينِ الفاظ وارد ہیں۔ یعنی صدقۂ فطر روزہ دار کے لئے پاکی ہے۔ ہر ایک قسم کی لغو و فحش سے جو روزہ میں اس سے وقوع میں آئے ہوں اور مسکینوں کے لئے کھانا ہے۔ جس سے انہیں بھی اغنیاء کے ساتھ اس عام خوشی میں شریک ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے اَغْنُوْهُمْ عَنِ الطَّوَافِ فِي هٰذَا الْيَوْمِ۔ سبحان اللہ۔ کیا ہمدردی ہے۔ ذرا غور کرنے سے اس صدقہ کی ضرورت ہر ایک شخص پر واضح ہو سکتی ہے۔ مع ہذا غسل اور تبدیل لباس اور صدقہ کا ادا کرنا اور پھر نماز کے لئے عامۂ اہل اسلام کا اکٹھا ہونا ایک اعلیٰ روحانیت کا اثر ایماندار کے دل میں پیدا کرتا ہے کیونکہ ظاہری اور باطنی طہارت پر مشتمل ہے۔

(۸) صدقۂ فطر ایسے شخص پر واجب نہیں جو غنی نہ ہو۔ یہاں غنی سے مراد ایسا شخص ہے جو اپنے مکان۔ لباس۔ اثاث البیت۔ گھوڑے۔ ہتھیار۔ خدمتگار۔ غلام کے علاوہ صاحب نصاب ہو یعنی ضروریات مذکورہ بالا کے علاوہ اس قدر مال کا مالک ہو کہ اس پر زکوٰۃ سال کے گذرنے پر واجب ہو جائے۔ مگر جس طرح زکوٰۃ کے لئے ایسے مال کی شرط ہے جس میں بڑھوتری ہو سکے اور پورا سال گذرے صدقہ فطر

کے نصاب کے لئے یہ شرط نہیں - یہ مال خواہ کسی قسم کا ہو اور خواہ اس پر سال بھی نہ گذرا ہو البتہ مقدار نصاب کے برابر ہو - امام شافعی رح اور بعض دیگر فقہا ایسے شخص پر بھی صدقۂ فطر واجب قرار دیتے ہیں جو صرف ایک دن کے نفقہ سے زیادہ کا مالک ہو اور اگر صرف ایک دن رات کے لئے ہی نفقہ رکھتا ہو تو اس صورت میں وجوب ساقط ہے - دلائل کتب میں اپنے اپنے موقعہ پر لکھے ہوئے ہیں ؃

(۹) جس شخص پر صدقۂ فطر واجب ہے اُس کو زکوٰۃ لینا حرام ہے ؃

(۱۰) صدقۂ فطر چھوٹے بچّوں اور خدمتی غلاموں کی طرف سے باپ اور آقا ادا کریں ؃

(۱۱) بیوی کی طرف سے امام صاحب کے نزدیک ادا کرنا واجب نہیں بیوی اپنے مال سے ادا کرے مگر دیگر آئمہ کے نزدیک واجب ہے - بڑے بچّوں کی طرف سے بھی باپ پر واجب نہیں ؃

(۱۲) اگر غلام کافر ہو تو بھی آقا پر واجب ہے کہ اُس کی طرف سے صدقہ ادا کرے مگر بالعکس نہیں ؃

(۱۳) افضل یہی ہے کہ اُن اشیاء میں صدقہ ادا کیا جائے جن میں خود پیغمبر صلعم نے ادا کیا ہے اور وہ اشیاء یہ ہیں - گیہوں - جَو - آٹا - ستّو - انگور - خُرما ؃

(۱۴) اگر گیہوں - آٹا - ستّو - انگور میں ادا کرے تو نصف صاع ادا کرنا ہوگا - اور اگر جَو یا خُرما میں ادا کرے تو پورا صاع ؃

(۱۵) جَو کا آٹا یا ستّو اور گیہوں کا آٹا یا ستّو گیہوں سمجھے جائینگے ؃

(۱۶) اگر مناسب سمجھے تو نقد قیمت بھی ادا کر سکتا ہے - بعض حالات میں نقد قیمت زیادہ موزوں ہے کیونکہ مسکین اُسے اپنی حسب مرضی صرف کر سکتا ہے ؃

(۱۷) صاع کی مقدار میں آئمہ کا اختلاف ہے - مگر صحیح یہ ہے کہ آٹھ رطل عراقی

یا چار مُد کے برابر ہوتا ہے۔ جس کو ہمارے ہاں مروجہ سیر کے پیمانہ میں اڑھائی سیر[1] چاہیئے - اڑھائی سیر کا وزن کچھ زیادہ ہے مگر احتیاطاً اس زیادتی کا کوئی ڈر نہیں بلکہ اچھّا ہے کیونکہ وہ زیادتی صدقہ تطوع میں داخل ہے ۔

(۱۸) اس صدقہ کو مختلف محتاجوں پر تقسیم بھی کرسکتا ہے ۔

(۱۹) مستحق و محتاج کی خوب چھان بین کرنا چاہیئے ۔

(۲۰) عیدالفطر کو صبح سویرے کھانا کھائے اور عیدالاضحیٰ کو نماز سے فارغ ہو کر

(۲۱) نماز عید واجب ہے اور بعض آئمہ نے سُنّت کہا ہے ۔

(۲۲) یہ نماز مصلائے شہر میں امام کے ساتھ ادا کرنی چاہیئے ۔

(۲۳) نماز عید سے پہلے کسی قسم کے نوافل مصلےٰ میں ادا نہ کرے ۔

(۲۴) اس نماز کا وقت دو نیزہ آفتاب کے اُٹھنے سے قبل از زوال تک ہے

(۲۵) یہ نماز دو رکعت ہے۔ جب تکبیر تحریمہ ہو جائے تو سُبحانَکَ اللّٰھُم پڑھے اور تین تکبیریں کہے ۔ پھر حسب معمول رکعت کو پورا کرے ۔ اور دوسری رکعت کے لئے اُٹھے ۔ فاتحہ اور سورۃ کو ختم کر کے پھر تین تکبیریں کہے اور پھر چوتھی تکبیر کہ کر رکوع کرے ۔ پھر حسب معمول نماز کو پورا کرے ۔ بہتر ہے کہ پہلی رکعت میں سورہ اعلیٰ اور دوسری میں غاشیہ پڑھے ۔ حنفاء کا معمول تو یہی ہے ۔ مگر بعض آئمہ کے نزدیک پہلی رکعت میں سات تکبیریں علاوہ تکبیر تحریمہ کے اور دوسری میں پانچ مگر بعض آئمہ کے نزدیک پہلی رکعت میں سات تکبیریں قبل رکوع علاوہ تکبیر رکوع کے وارد ہوئی ہیں

(۲۶) تکبیر کے وقت ہاتھ کانوں تک اُٹھائے ۔

(۲۷) نماز کے بعد امام دو خطبے پڑھے جس میں احکام صدقہ وغیرہ عام لوگوں کو بتلائے ۔ خطبہ کا سُننا بہت ضروری ہے۔ اکثر لوگ بغیر سُنے بھاگ نکلتے ہیں ۔ یہ منع ہے ۔

[1] لیکن ایک محقق نے تحقیق کیا ہے کہ صاع کی صحیح مقدار ۲ تولہ کم تین سیر ہوتی ہے سو نظر بر احتیاط تین سیری سمجھنا چاہئے مگر ایک تحقیق کے مطابق صاع کی مقدار پونے چار سیر ہے ۔ لیکن پہلی تحقیق اقرب الی الصحت معلوم ہوتی ہے ۔ منہ

(۲۸) اگر نماز عید فوت ہو جائے تو قضا نہیں پڑھ سکتا ؛

(۲۹) اگر رات کو ہلال کسی وجہ سے نظر نہ آیا ہو اور صبح زوال کے بعد ہلال کی شہادت کے سامنے ہو جائے تو نماز عید اس سے اگلے دن ادا کی جائیگی - اس بارہ میں حدیث آچکی ہے ؛

(۳۰) نماز کے لئے جاتے وقت جس راستہ سے جائے اس کو واپسی پر بدل دے آتے جاتے راستہ میں تکبیریں کہے - اور تکبیر یہ ہے - اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ ؛

(۳۱) نماز پڑھنے کے لئے پا پیادہ جانا چاہئے ؛

عیدالاضحیٰ عیدالاضحیٰ بہ نسبت عیدالفطر کے بہت بڑا تہوار ہے - کیونکہ یہ وہ دن ہے جبکہ اس سے ایک دن پہلے لاکھوں بندگان خدا یعنی تمام روئے زمین کے چیدہ چیدہ اور مالدار مسلمان مکہ معظمہ کے اس میدان میں جمع ہوتے ہیں جس کو عرفات کہا جاتا ہے - اور جہاں اس وحدہٗ لاشریک کا ذکر بے شمار مسلمانوں کے دل و دماغ زبان پر آتا ہے - سبحان اللہ یہ کیسا مبارک میلہ ہے جس سے دنیا کے بڑے بڑے میلوں اور نمائشوں کو کوئی نسبت نہیں - کیونکہ ان میں نفس پرستی اور اس میں خدا پرستی اور ان میں خدا سے غفلت اور اس میں خدا کی عظمت پائی جاتی ہے - ان میں حصول لذائذ دنیاوی اس میں شمول فوائد اخروی ؛

علاوہ اس متبرک جگہ کے ہر ایک شہر اور قصبہ میں اس عید کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے - علاوہ عید کے قربانی دیجاتی ہے جو بجائے خود اسلامی شعار سمجھی جاتی ہے

قربانی قربانی بھی قدیمی دستور چلا آتا ہے - ہر ایک مذہب میں اس کا دستور رہا ہے جانوروں کا بتوں کے نام پر چھوڑنا - ان کے نام پر ذبح کرنا یہ تو بت پرستوں میں مروج ہی تھا - پہلے زمانہ میں قربانی کی مقبولیت کی یہ صورت تھی کہ جو

شخص کوئی جانور یا کوئی اور شے خدا کے راہ میں دینا چاہتا تھا اُس کو آسمانی آگ آ کر کھا جایا کرتی تھی - اور جس کی قربانی مقبول نہ ہو اُس کو . . . آسمانی آگ نہ جلاتی - بلکہ جانور کھا جاتے - چنانچہ ہابیل و قابیل کا قصہ مشہور ہی ہے ؞

دراصل قربانی کا ذبح کرنا اسلام میں جو مروّج ہوا تو یہ ابراہیم علیہ السلام کی سنّت ہے - جن کو خواب میں حکم ہوا کہ سب سے پیاری چیز قربانی کرو - آپ نے بہت سے اونٹ قربانی کئے - پھر حکم ہوا - پھر اونٹ قربان کئے - پھر حکم ہوا کہ خاص اپنے بیٹے کو قربان کرو - اِس پر آپ نے حکم مانا اور اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کے لئے میدان میں لے گئے اور خدا کے حکم کو بجا لائے - مگر وہاں تو صرف امتحان ہی تھا - چھری نے ایک بال بھی نہ کاٹا - آخر جنّت سے فرشتہ ایک دُنبہ لایا اور کہا کہ اِس کو ذبح کرو - غرض یہ وہی سنّت ابراہیمی ہے - چنانچہ فرمایا وفدینٰہ بذبح عظیم وترکنا علیہ فی الاٰخرین - خدا کو قربانی کا خون یا گوشت نہیں پہنچتا بلکہ اس کو تقویٰ اور فرمانبرداری اور اخلاص نیّت پسند ہے ؞

اب ہم مختصرًا عید الاضحیٰ اور قربانی کے احکام لکھتے ہیں - عید الفطر کے بیان میں بھی لکھ آئے ہیں - پھر مختصرًا اعادہ کرتے ہیں ؞

احکام عید الاضحیٰ

(۱) عیدین کی نماز واجب ہے ؞

(۲) عید کے دن غسل اور مسواک کرنا - عمدہ کپڑے پہننا - انگوٹھی پہننا - خوشبو لگانا اور عید گاہ تک پیدل چل کر جانا اور ایک راستے سے جانا دوسرے راستے سے واپس آنا سنّت ہے - اگر کوئی سواری مل جائے تب بھی جائز ہے ؞

(۳) عید الاضحیٰ کے دن عید کی نماز سے فارغ ہو کر کھانا کھانا سنّت ہے اور بہتر ہے کہ قربانی کا گوشت کھایا جائے - اور اگر کوئی پہلے کھالے تو جائز ہے ؞

(۴) نماز عید جنگل میں جا کر پڑھنا مسنون ہے گو شہر میں جامع مسجد ہو ؞

(۵) چلتے وقت راستہ میں تکبیریں باواز بلند پڑھنا چاہئے۔ تکبیر یہ ہے اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ ‪۔‬

(۶) یہی تکبیر عرفہ یعنی ۹۔ ذوی الحجہ کی صبح کی نماز کے بعد جو جماعت سے ادا کیگئی ہو امام و مقتدی پر آخر ایام تشریق تک یعنی ۱۳۔ ذوی الحجہ کی عصر کی نماز تک ہر نماز کے بعد یعنی واجب ہے ‪۔‬

(۷) جو شرائط جمعہ کے وجوب کے ہیں وہی عید کے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جمعہ میں خطبہ نماز سے پہلے ہوتا ہے اور عید میں خطبہ نماز کے بعد ہوتا ہے اور بدوں خطبہ کے نماز عید ہو جاتی ہے ‪۔‬

(۸) نماز پڑھنے کا وہی طریق ہے جو عید الفطر کا اور جو وقت اُسکا ہے۔ وہی وقت اِس کا ہے یعنی سورج نکلنے کے بعد سے زوال تک مگر بہتر ہے کہ یہ عید جلدی پڑھی جائے۔ کیونکہ بعد میں قربانی کرنی ہوتی ہے ‪۔‬

(۹) اوّل تکبیر تحریمہ کہہ کر ہاتھ باندھے جائیں اور سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ . . . . پڑھا جائے۔ پھر تین تکبیریں ہاتھ کانوں تک اُٹھا کر اور چھوڑ کر کہی جائیں۔ ہر تکبیر کے بعد تین تسبیح کی مقدار سکوت کیا جائے۔ تیسری تکبیر کہہ کر ہاتھ باندھے جائیں اور امام قرأت پڑھے اور جب دوسری رکعت پڑھے تو تین تکبیریں بعد قرأت ہاتھ کانوں تک اُٹھا کر کہی جائیں اور چوتھی بلا ہاتھ اُٹھانے کے تکبیر رکوع کہہ کر رکوع میں جائیں۔ گویا چھ تکبیریں زائد ہوئیں اور دو پہلی رکعت میں اور ایک دوسری رکعت میں اصلی ہیں ‪۔‬

(۱۰) گھر میں آکر بعد نماز عید چار رکعت نفل پڑھنا مستحب ہے ‪۔‬

(۱۱) امام کو چاہیئے کہ خطبہ میں لوگوں کو عید اور قربانی کے احکام سنائے ‪۔‬

قربانی کے مسئلے

(۱) قربانی واجب ہے اُس شخص پر جو مالدار ہو جس طرح صدقہ فطر واجب ہے

(۲) قربانی کی فضیلت بہت ہے ؛

(الف) زید ابن ارقمؓ سے مروی ہے کہ صحابہؓ نے رسول اللہ صلعم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ یہ قربانیاں کیسی ہیں ؟ آپ نے فرمایا کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم کی سنت ہے لوگوں نے کہا کہ ہمیں اس کا کیا ثواب ہے ؟ فرمایا کہ اسکے ہر بال کے بدلے ایک نیکی۔ صحابہؓ نے کہا کہ پشم کا کیا حال ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ پشم کے ہر بال کے برابر نیکیاں ملینگی ؛

(ب) حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ خدا کے نزدیک قربانی کے دن کوئی عمل قربانی سے بڑھکر زیادہ عزیز نہیں۔ کیونکہ بیشک قیامت کے دن قربانی مع اپنے سینگوں اور بالوں اور کھروں کے آئیگی یعنی سب چیزیں نیکیوں کے ساتھ تولی جائینگی اور بے شک اس کا خون خدا کے نزدیک مرتبہ رکھتا ہے قبل اسکے کہ وہ زمین پر گر پڑے۔ اب تم لوگ اس قربانی کرنے سے خوش ہو جاؤ ؛

(۳) قربانی صرف اپنی ذات کی طرف سے واجب ہے اولاد اور بیوی کی طرف سے واجب نہیں۔ ہاں اگر زوجہ مالدار ہے تو وہ اپنے خرچ سے کرے ؛

(۴) مسافر پر قربانی واجب نہیں ؛

(۵) ہر شخص اپنی طرف سے ایک بکری بکرا یا مینڈھا یا چھترا ذبح کرے اور گائے یا اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے ہو سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ سات آدمیوں کی نیت قربانی کی ہو۔ اگر ایک کی نیت گوشت بیچنے کی ہو تو کسی کی قربانی بھی ادا نہ ہوگی ؛

(۶) بکری کا بچہ ایک سال سے کم کا اور بھیڑ کا بچہ ۶ ماہ سے کم کا اور گائے بیل

دو برس سے کم کا اور اونٹ پانچ برس سے کم کا قربانی میں جائز نہیں مگر جو بھیڑ کا بچہ چھ ماہ کا ہو اور فربہ اور قوی ہو تو جائز ہے ؀

(۷) قربانی کا وقت صبح دسویں ذی الحجہ سے بارھویں ذی الحجہ کے غروب آفتاب تک ہے۔ مگر جو لوگ شہر میں رہتے ہیں اُن کا نماز عید سے پہلے کرنا جائز نہیں۔ البتہ گاؤں والوں کو جائز ہے ؀

(۸) اندھا یا کانا یا ایسا دبلا جانور جس کی ہڈیوں میں مغز نہ رہا ہو اور ایسا لنگڑا کہ ذبح کی جگہ تک بھی اپنے پاؤں سے نہ چل سکتا ہو اور بیمار جانور جس کی بیماری ظاہر ہو اور جس کا تہائی سے زیادہ کان کٹا ہو یا تہائی سے زیادہ دُم کٹی ہو یا جس جانور کے دانت نہ ہوں وہ قربانی میں جائز نہیں۔ ہاں اگر چھوٹے چھوٹے خلقی ہوں تو جائز ہے جس جانور کی ناک کٹی ہو وہ بھی جائز نہیں۔ جس جانور کے سینگ نہ ہوں یا ٹوٹ گئے ہوں وہ جائز ہے خصی جانور بھی جائز ہے ؀

(۹) قربانی کے گوشت سے آپ بھی کھائے اور دوست آشناؤں کو گو وہ غنی ہوں کھلائے اور رکھ چھوڑے مگر بہتر یہ ہے کہ تہائی خیرات کر دے۔ اگر اپنا ہی کنبہ زیادہ ہے تو پھر اُسی میں خرچ کر دے ؀

(۱۰) قربانی اپنے ہاتھ سے کرنا مستحب ہے اور جو آپ ذبح نہ کر سکے مثلاً عورت ہو تو دوسرے سے اپنے سامنے ذبح کرائے ؀

(۱۱) بکرا وغیرہ خوب موٹا تازہ ہونا چاہیئے۔ جس قدر عمدہ اور فربہ ہوگا اُسی قدر زیادہ ثواب ہوگا ؀

(۱۲) قربانی کی کھال قصاب کو مزدوری میں نہ دے بلکہ چاہیئے کہ کھال خیرات کر دے۔ یا اس سے ایسی چیز بنائے جو باقی رہے جیسے مشک یا ڈول۔ اور اگر فروخت کر دے تو اسکی قیمت خیرات کر دے ؀

(١٣) حضرت علی خود دُنبے قربانی کرتے تھے ان سے سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ مجھکو رسول اللہ صلعم نے وصیت کی ہے کہ آپ کی طرف سے میں قربانی دیا کروں سو میں بجا لاتا ہوں۔ اگر کوئی اپنے بزرگ کی طرف سے قربانی کرے تو مستحب ہے۔

(١٤) جس شخص کو قربانی دینی ہو اسے چاہئے کہ پہلی ذی الحجہ سے قربانی ذبح کرنے سے پہلے حجامت خط وغیرہ نہ بنوائے۔

انفاق فی سبیل اللہ اور صدقات

صدقات کا حکم اسلامی شریعت میں ایک ایسی عمیق حکمت رکھتی ہے جو انسانی ترقی کی دینی اور دنیوی اصلاح پر مشتمل ہے۔ عوام الناس اس کی ضرورت کو صرف اس خیال تک محدود رکھتے ہیں کہ اس میں ایک قسم کی انسانی ہمدردی اور قومی اعانت ہے۔ مگر یہ خیال بمقابلہ اس اعلیٰ حکمت کے جو انسان کی روحانی ترقی کا اصل اصول ہے بہت کم وقعت رکھتا ہے۔ قرآن مجید سے بتصریح تمام ثابت ہوتا ہے کہ صدقات نفس انسانی کے لئے طہارت اعلیٰ کا موجب ہوتے ہیں۔ اور طہارت باطنی معارف و حقائق ربانیہ کے انکشاف کے لئے ضروری شرط ہے۔ کیونکہ جب تک قلب خیالات فاسدہ اور عادات رذیلہ سے پاک و صاف نہیں ہو لیتا تب تک انوار الٰہیہ کا ظہور اس پر نہیں ہو سکتا۔ آیہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا ترکیۂ باطن کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔ اور اس کی توجیہ یوں ہو سکتی ہے کہ بخل و امساک سے بے رحمی اور سنگدلی کا مادہ انسان کی طبیعت میں اور بھی ترقی کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضور علیہ السلام نے یوں ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایمان کو پیدا کیا تو ایمان نے کہا کہ خدایا مجھ کو قوی کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حسن خلق اور جود کے ساتھ تقویت بخشی۔ اور جب کفر کو پیدا کیا تو کفر نے کہا کہ خدایا مجھ کو قوی کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو سوء خلق اور بخل کے ساتھ تقویت دی

اس سے صاف طور پر واضح ہوگیا کہ بخل و امساک منجملہ لوازم کفر ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ بخیل کے لئے عدم دخول جنت کی وعید وارد ہوچکی ہے۔ سو کوئی ایسا شخص جس کا نتیجہ سنگدلی اور بیرحمی ہو ہرگز اللہ تعالیٰ کو خوش نہیں کر سکتا۔ چونکہ صدقہ دینے سے نفس کے بخل و امساک کو توڑا جاتا ہے۔ اس لئے اس میں ایک قسم کا انکسار پیدا ہوتا ہے اور اس کی صلابت زائل ہوجاتی ہے۔ یہی ایک امر ہے جو موجب نزول رحمت باری ہے۔ اللہ تعالیٰ خود ارحم الراحمین ہے۔ اس لئے وہ رحیم سے رحیم تر آدمی کو زیادہ دوست رکھتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ یعنی مخلوقات خدا پر رحم کرو تاکہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمت نازل فرمائے ؎

خواہی کہ خدا کند ترا بخشش ٭ با خلق خدا بکن نکوئی

وہ قرآن مجید میں اپنی نسبت فرماتا ہے یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ یعنی اس کی یہ صفت ہے کہ وہ کھانا دیتا ہے۔ اور وہ خود کھانے کا محتاج نہیں۔ چونکہ انسان کے لئے کمال کا معیار یہ ہے کہ وہ اخلاق الٰہیہ کے ساتھ مشابہت پیدا کرے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر ایک اپنا غذا غربا اور مساکین کو کھانا کھلایا کرے۔ تاکہ یہ مشابہت درجہ کمال اس کو حاصل ہو اور اس عمل میں نفس کی اندرونی رذیلتوں سے حفاظت ہے۔ کیونکہ نفس صرف مال سے طبعاً مانع ہوتا ہے۔ خود جناب رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ والسلام باوجودیکہ بظاہر سلاطین دنیا کی طرح خزائن و خدم کے مالک نہ تھے بلکہ فقر و فاقہ حضور کے لئے زیب و زینت تھے۔ مگر جود و عطا میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں وغیرہم کے حق میں باران رحمت کا عالم رکھتے تھے ؎

تہیدست سلطان پشمینہ پوش ٭ غلامی تو ہر بادشاہ کی فروش

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ روحانی ترکہ صحابہ اور آئمہ اہلبیت علیہم السلام کے

ہاتھ پڑا تھا۔ جس کو وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ بعد میں مسلمانوں میں دنیوی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ اور زر و سیم کو اللہ تعالےٰ کے احکام پر ترجیح دی جانے لگی۔ آہستہ آہستہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ اب سینکڑوں مسلمان صاحب نصاب موجود ہیں مگر زکوٰۃ جس کی تاکید قرآن و سنت میں بروجہ اتم مذکور ہے ادا نہیں کرتے کبھی کسی درویش مسکین کو پیسہ دے دیا یا کھانا کھلا دیا اور سمجھ لیا کہ بس۔ زکوٰۃ ادا ہو گئی۔ نعوذ باللہ منہ *

احکام شریعت کے اسرار و حقائق اس قدر وسیع اور دینی و دنیوی اصلاح پر مشتمل ہیں کہ بجز خواص الناس کے دوسرے لوگ ان سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ صدقات و خیرات کے اسرار و حکم اصلاحِ نفس اور اصلاحِ تمدن و معاشرت پر مشتمل ہیں یا یوں کہو کہ انسان کے ظاہر اور باطن کی اصلاح میں بڑا بھاری دخل رکھتے ہیں۔ اصلاحِ نفس جو ایک امر باطنی ہے اور جو معرفت ذات باری کا ایک مضبوط ذریعہ ہے بجز صدقات و خیرات کے ایک ناممکن امر ہے۔ ایثار جو بحکم آیہ وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ مردانِ خدا کی وصف میں آ چکا ہے ایک ایسا اہم امر ہے جو انسان کو اس کے کمال حقیقی تک پہنچا دینے میں ایک عظیم الشان اثر رکھتا ہے۔ ایثار کے معنی یہ ہیں کہ اپنی حاجت یا ضرورت کو نظر انداز کر کے کسی دوسرے بھائی کی ضرورت یا حاجت کو مقدم رکھا جائے۔ چونکہ اس حکم پر عمل پیرا ہونا سوائے خاصانِ خدا کے کسی دوسرے شخص کو حاصل نہیں۔ اس لئے بارگاہِ ربّ العزت میں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کوئی شخص نہیں لگا سکتا۔ الغرض انفاق فی سبیل اللہ ایک ایسا کیمیائی عمل ہے جو اللہ تبارک و تعالےٰ کو نہایت ہی محبوب ہے۔ کیونکہ انفاق مال نفس کے لئے ایک ناگوار بوجھ ہے جس کے متحمل ہونے سے وہ ہمیشہ نفرت کرتا رہتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی مردِ خدا انفاقِ مال کی توفیق رکھتا ہو تو وہ

...اخلاقِ رذیلہ سے بآسانی بچ سکتا ہے۔ اور اسی کا نام اصلاحِ نفس ہے۔ اور فضائلِ انسانی جو اصلاحِ نفس کے بغیر کبھی حاصل نہیں ہو سکتے معرفتِ ذاتِ باری کے مقام تک پہنچا دیتے ہیں اور یہی عرفانِ حقیقی ہے جو غایت کمالِ انسانی سمجھا گیا ہے اور جو انسان کی پیدائش کا مقصود بالذات ہے۔ آیہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا کی یہی صحیح تفسیر ہے ؛

اصلاحِ تمدّن و معاشرت ایک ایسا امر ہے جو انسان کی ظاہری زندگی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اسلام چونکہ ظاہر و باطن ہر دو کی اصلاح کا متکفّل ہے کیونکہ حکم آیۃ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ انسان کا حقیقی کمال ظاہر و باطن ہر دو کی اصلاح پر موقوف ہے اس لئے ضروری ہے کہ حکم صدقات و خیرات انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی عمارت کے قائم کرنے کے لیے ایک مستحکم اساس کا کام دے۔ انسانی فطرت میں دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت کا خیال ایک طبعی امر ہے اور چونکہ تمدّن و معاشرت کا بہترین صورت میں قائم رہنا انہیں دو باتوں پر منحصر ہے۔ اور صدقات و خیرات ان ہر دو امر کی تائید کرتے ہیں۔ اس لئے شارع علیہ السّلام نے صدقات و خیرات کی نسبت نہایت تشدد کے ساتھ احکام تلقین فرمائے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر صدقات و خیرات کے احکام کی پورے طور پر تعمیل کی جائے تو مسلمانوں میں جن خرابیوں کا مشاہدہ ہو رہا ہے بآسانی دور ہو سکتی ہیں۔ حکم صلہ رحمی کی بجا آوری اسی صورت میں متصور ہو سکتی ہے کہ مستحقین اقارب کے حقوق کو مدنظر رکھا جائے۔ مگر نہایت افسوس کے ساتھ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر اہلِ قرابت میں رابطہ اخوت منقطع ہو چکا ہے ؛

یہ امر نہایت قابلِ توجہ ہے کہ عام طور پر مسلمانوں میں صدقات و خیرات کے صحیح مصرف کی نگہداشت نہیں کی جاتی۔ شریعتِ حقّہ نے جہاں صدقات و

خیرات کا حکم دیا ہے۔ ان کے مصارف کی بھی ساتھ ہی تفصیل دیدی ہے مستحق غیر مستحق میں امتیاز نہ کرنا ایک بڑا بھاری جرم ہے۔ سب سے پہلے صدقات و خیرات کا مصرف اپنے اقارب ہیں جن کی نسبت قرآن مجید میں متعدد موقعہ پر تاکید کی گئی ہے۔ ان کے بعد دیگر مستحقین ہیں۔ سخت تعجب کا محل ہے کہ لوگ عموماً دنیوی مصارف میں محض شہرت و نام آوری کے لئے بیدریغ اپنا مال صرف کر دیتے ہیں۔ اور حقوق شرعیہ کے ادا کرنے میں غفلت۔ بے پرواہی اور تنگدلی سے کام لیا جاتا ہے۔ اور اسراف و تبذیر سے کسی صورت میں نہیں بچ سکتے۔ اسراف زائد از ضرورت صرف کرنے کا نام ہے اور تبذیر بے محل صرف کرنے کو کہتے ہیں۔ یعنی جہاں صرف کرنا چاہئے تھا وہاں صرف نہیں کیا۔ اور جہاں صرف نہیں کرنا چاہیئے تھا وہاں بیدریغ صرف کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل تبذیر کو اخوان الشیاطین کہا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ۔ عام طور پر لوگ اسراف اور تبذیر میں فرق نہیں کیا کرتے۔ آیات قرآنیہ و احادیث میں صدقات و خیرات کے متعلق پوری پوری تفصیل دی گئی ہے۔ ذیل میں چند ایک آیات اور احادیث کا ترجمہ دیا جاتا ہے جن سے اس حکم کی اہمیت اور فضیلت کا پتہ لگتا ہے:۔

پارۂ چہارم کے شروع میں فرمایا۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ یعنی تم ہرگز نیکی کو نہیں پا سکو گے۔ جب تک کہ تم اپنے عزیز مال سے صرف نہیں کرو گے۔ چونکہ نفس طبعاً عزیز چیز کو صرف کرنے سے ہچکچاتا ہے۔ اسلئے ارشاد فرمایا کہ بمقابلہ محبت الٰہی و رضائے مولیٰ دنیا کی وہ چیزیں جو تمہیں بغایت محبوب ہیں کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتیں وفاداری اسی کا نام ہے کہ رضائے مولیٰ کی خاطر گرامی اور نفیس چیز کو صرف کیا جائے دیکھو کہ تمہیں جس قدر کسی مہمان کی زیادہ عزت ملحوظ ہوتی ہے اسی قدر تم لوازم ضیافت میں زیادہ مبالغہ کرتے ہو۔ خالق حقیقی کا رتبہ تو تمام مخلوق سے کہیں بہت زیادہ ہے

بخصوص اس حال میں جبکہ سب کچھ اسی کا عطیہ ہے ؎

نیاوردم از خانہ چیزے نخست
تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست

جب حقیقت حال یہ ہے تو جان جیسی عزیز چیز بھی بمقابلہ رضائے مولےٰ کچھ حقیقت نہیں رکھتی ؎

جاں نقد محقر است حافظ		از بہر نثار خوش نباشد

یہی وجہ ہے کہ شہداء کا رتبہ بہت بڑا قرار دیا گیا ہے۔ پھر دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ۔ (سورۃ توبہ) **ترجمہ**۔ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو یا رسول اللہ۔ آپ ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔ جس دن کہ وہ (سونا چاندی) دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائیگا۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائینگی (اور ان سے کہا جائیگا) یہ وہی (سونا چاندی) ہے۔ جس کو تم اپنے لئے جمع کرتے تھے۔ پس (اب) جو تم نے جمع کیا تھا اس (کے مزہ) کو چکھو۔ اس آیت شریفہ میں غور کرو کہ سیم و زر کے جمع کرنے اور اس میں سے حقوق واجبہ ادا نہ کرنے کی صورت میں کس قدر سخت وعید نازل ہوئی ہے۔ کلام الٰہی میں جہاں کسی امر پر کوئی وعید عائد کی ہے علمائے اسلام نے اسے کبائر گناہ میں داخل سمجھا ہے۔ عدم انفاق مال بھی منجملہ کبائر کے قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے سلسلۂ مواسات واخوت بالکلیت منقطع ہو جاتا ہے جو تعلیم اسلام کا عین منشا ہے اور پھر فرمایا وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ

مُسَنُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِہٖ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (سورۂ آل عمران) یعنی جو لوگ اللہ کے دئے ہوئے مال میں بخل کرتے ہیں وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ بخل ان کو مفید ہے بلکہ وہ ان کے لئے بُرا ہے۔ عنقریب قیامت کے دن وہ بخل کا مال اُنکے گلے طوق بنادیا جائیگا۔ اس آیت شریفہ کا مفہوم بھی آیہ مذکورہ بالا کا مفہوم ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ مال کا حقوق واجبہ میں صرف نہ کرنا کس قدر موجب عذاب قرار دیا گیا ہے۔ یہ عذاب تو عالم آخرت کے متعلق ہے مگر دنیا میں بھی مال نہ صرف کرنے والے کو انواع واقسام کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوگ ایسے شخص کو نہایت مبغوض رکھتے ہیں اور اس کا مال ناگہانی آفتوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور مرتے وقت جو حسرت ایسے شخص کو لاحق ہوتی ہے اس کا اندازہ بھی وہی شخص کرسکتا ہے جس پر وہ حالت گذرتی ہے اور جس کو کسی بزرگ نے اپنے مقولہ میں یوں ظاہر فرمایا ہے "بمشقت گرد آورد وبخست نگاہ دارد وبحسرت بگذارد" اور اس سے بڑھکر اور کیا عذاب ہوسکتا ہے کہ ایسا شخص دُنیا سے نامراد جاتا ہے اور اس کے مرنے پر وہ لوگ قابض ہوجاتے ہیں جن کو وہ اپنی زندگی میں ایک حبہ تک دینے کا روادار نہ ہوتا تھا۔ مفصلۂ ذیل پنجابی مقولہ بہت قیمتی ہے "ذرا نہ دیندی مانگواں بھوتا جا" کا

انفاق مال کے متعلق[1] مختلف احادیث بکثرت وارد ہوئی ہیں۔ ذیل میں صرف انکے ترجمہ پر کفایت کی جاتی ہے ؎

(۱) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر بالفرض میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہوتا تو مجھے اس میں خوشی ہوتی کہ تین دن گذرنے سے پہلے ہی وہ میرے پاس نہ رہتا۔ مگر ہاں اتنا کہ قرض کے لئے اٹھا رکھتا

[1] واضح ہو کہ انفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم ہر دو قسم کے صدقات یعنی واجبہ اور تطوع (نافلہ) پر مشتمل ہے۔ واجبہ جیسے زکوٰۃ۔ فطرہ۔ کفارہ۔ نذر وغیرہ اور نافلہ کے لئے کوئی مقدار اور وقت مقرر نہیں ۱۲ منہ

اس کو بخاری نے روایت کیا ہے ؎

(۲) انہیں سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا کہ اس میں دو فرشتے نہ اترتے ہوں۔ ایک یہ کہتا ہے کہ الٰہی خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ اور عوض دے یعنی اور مال یا اولاد دے۔ اور دوسرا کہتا ہے کہ الٰہی ممسک اور بخیل کا ستیاناس کر دے۔ (بخاری و مسلم)

مولانا روم علیہ الرحمۃ نے اسی کا ترجمہ کیا ہے۔ ؎

گفت پیغمبر کہ در بازارہا ✤ دو فرشتہ مے کنند اہم ندا

کاے خدا تو منفقاں را دہ خلف ✤ وے خدا تو ممسکاں را دہ تلف

خاصہ آں منفق کہ جاں انفاق کرد ✤ حلق خود قربانیٔ خلاق کرد

حلق پیش آورد اسمٰعیل وار ✤ کارد بر حلقش نیارد کرد کار

(۳) ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایسے وقت حاضر ہوا کہ آپ کعبہ کے سایہ میں جلوہ افروز تھے۔ جب مجھے دیکھا تو فرمایا کہ رب کعبہ کی قسم وہ لوگ خسارہ میں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ حضور پر قربان ہوں وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا کہ بڑے بڑے مالدار۔ مگر ہاں جس نے ایسا کیا یعنی آگے اور پیچھے اور دائیں اور بائیں خرچ کر دیا۔ اور یہ لوگ بہت تھوڑے ہیں۔ (بخاری و مسلم) ؎

(۴) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ سخی خدا کے قریب۔ جنت کے قریب اور لوگوں کے قریب مگر دوزخ سے دور ہے۔ مگر بخیل خدا سے دور۔ جنت سے دور۔ اور لوگوں سے دور۔ مگر دوزخ کے قریب ہے۔ اور بے شک جاہل سخی خدا کے نزدیک عابد بخیل سے بہتر ہے۔ (روایت کیا اس کو ترمذی نے) ؎

(۵) ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے کہ دو عادتیں مومن میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ بخل اور بد خلقی۔ (ترمذی)

(۶) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے کہ جب خدا نے زمین کو پیدا کیا تو وہ حرکت کرتی تھی۔ پھر پہاڑ پیدا کئے اور اُس پر رکھ دئے تو وہ ٹھہر گئی۔ تب فرشتوں نے پہاڑوں کی سختی سے تعجب کیا اور کہا کہ یا الٰہی کیا پہاڑ سے بھی کوئی سخت چیز مخلوق ہے؟ کہا کہ لوہا۔ پھر پوچھا کہ کیا لوہے سے بھی کوئی سخت ہے؟ کہا کہ آگ۔ کہا کہ آگ سے بھی کوئی زیادہ سخت چیز ہے؟ کہا کہ ہاں۔ پانی۔ پھر پوچھا کہ پانی سے بھی کچھ سخت ہے؟ کہا کہ ہوا۔ پھر پوچھا کہ کیا ہوا سے بھی کوئی چیز سخت ہے؟ کہا ہاں۔ ابن آدم ہے جو دائیں ہاتھ سے صدقہ دے اور بائیں کو خبر بھی نہ ہو۔ (ترمذی) *

واضح ہو کہ سلف صالحین انفاق فی سبیل اللہ میں نہایت سرگرمی سے کام لیا کرتے اور اس کو منجملہ باقیات صالحات سمجھا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقتِ توحید اُن پر غالب تھی۔ اور باوجود اہل تعلق ہونے کے توکل ان کا شعار تھا جو اصل ایمان ہے۔ اور وہ خوب جانتے تھے کہ جب کوئی شخص دل سے خدا کی اطاعت میں آجاتا ہے تو خدائے تعالےٰ خود اس کا متولّی ہوجاتا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ۔ یہی وہ ایک اصل عظیم ہے جس پر اسلام کی عظیم الشان عمارت کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔ چونکہ مسلمانوں میں توحید پرستی محض زبان تک محدود رہ گئی ہے اور قلوب اسباب پرستی کی دلدل میں پھنس رہے ہیں۔ اس لئے اگر حقیقت توکل کی طرف انہیں توجہ دلائی جائے تو یہ اسباب پرست لوگ ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں۔ اور اہلِ حق کو یوں ملزم

ٹھہراتے ہیں۔ کہ یہ لوگوں کو پست ہمت بناتے ہیں اور اسباب کی پابندی سے روکتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت یہ لوگ اپنے قصور فہم کی وجہ سے حقیقت توکل کے سمجھنے سے عاری ہیں۔ کیونکہ خدائے تعالےٰ اور اُس کے صفاتِ کاملہ پر اُن کے دل مطمئن نہیں۔ جو لوگ اسرارِ صدقات سے آگاہ ہیں اور اُس کی دُنیوی و اُخروی منافع کو خوب سمجھتے ہیں وہ انفاق فی سبیل اللہ سے سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً کبھی غافل نہیں ہوتے۔ وَالتَّوْفِیْقُ مِنَ اللّٰہِ تَعَالیٰ ؎

۸۔ فریضۂ حج

فریضۂ حج کے بیان سے پہلے مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر تاریخ مکہ معظمہ اور بیت اللہ شریف کے متعلق کچھ بحث کی جائے :۔

اِس سب سے مشہور اور سب سے مقدس شہر کے لئے قرآن شریف میں دو نام مستعمل ہوئے ہیں :۔

(۱) مَکَّۃَ ۔ کقولہ تعالیٰ ھوالذی کف اید یھم عنکم وایدیکم عنھم ببطن مکۃ من بعد ان اظفرکم علیہ ۔ مکہ کے لغوی معنی کسی چیز کا دُور کرنا۔ یا نکال پھینکنا ہے ۔ عرب کا قول ہے تمککت المخ من العظم تمککا ہڈی سے مغز کا چوسنا) چونکہ اس شہر میں داخل ہونے سے انسان کی گندگی اور آلائش دُور ہو جاتی ہے ۔ اِس لئے اِس کا یہ نام پڑگیا ہے۔ ؎

(۲) بَکَّۃَ ۔ کقولہ تعالیٰ ان اوّل بیت وضع للنّاس للذی ببکۃ مبارکًا وھدی للعالمین فیہ اٰیات بینات مقام ابراھیم ومن دخلہ کان اٰمنًا
بکہ کے لغوی معنی دُور کرنا اور روکنا ہے ۔ چونکہ یہ فاجر اور بدکار کو اپنے سے دُور رکھتا ہے ۔ اِس لئے اِس نام سے مشرف ہُوا ۔ کقولہ تعالیٰ انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا ؎

بعض علماء کا یہ قول ہے کہ مکہ اور بکہ دو مختلف لغات ہیں مطلب ایک ہی
کیونکہ عرب میم کو ب کے ساتھ ہم مخرج ہونے کی وجہ سے تبدیل کر دیتے ہیں۔
ضَربَۃٌ لازم کی جگہ ضربۃ لازب بھی بولتے ہیں۔ بعض کا اس کے برخلاف
قول ہے کہ یہ دو علیحدہ اسم ہیں اور ان کے مسمّٰی دو علحدہ اختیار ہیں۔ کیونکہ
اسم اختلاف مسمّٰی پر دال ہے۔ اختلاف مسمّٰی کے بارہ میں بھی دو علیحدہ اقوال ہیں
اوّل یہ کہ مکہ سے مراد شہر اور بکہ سے مراد بیت اللہ ہے۔ اس قول میں ابراہیم نخعی
اور یحییٰ بن یعقوب متفق ہیں۔ دوم یہ کہ مکہ سے مراد حرم اور بکہ سے مراد مسجد
اس قول میں زُہری اور زید بن اسلم شامل ہیں مصعب بن عبداللہ زبیری کا قول
کہ مکہ کو ایام جاہلیت میں بوجہ امن و آسایش کے صلاح کہا کرتے تھے۔ چنانچہ ابوسفیان
بن حرب بن امیہ کے شعر ہیں ؎

آیامطراً ھلمّ الی صلاحٍ نیکفیک الندامیٰ من قریشٍ
وتنزل بلدۃ عزّت قدیماً وتأمن ان یزورک رب جیشٍ

مکہ کے اور نام ام رحم (بوجہ اس میں لوگوں کے باہم رحم سے پیش آنے کے)
ام زحم (بوجہ زحمت اعداء) ام الناس۔ ام الباس اور حاطمہ وغیرہ ہیں۔ قرآن
میں اسے ام القریٰ بوجہ قدامت وعظمت کے کہا گیا ہے۔ کقولہ تعالیٰ لتنذر
ام القریٰ ومن حولھا ؎

مذکورہ بالا آیت نمبر۲ میں لفظ مبارک کی دو تاویلیں ہو سکتی ہیں۔ مکہ کی طرف
قصد کے ثواب کی برکت اور اس میں داخل ہونے والے کے لئے امن کی برکت۔ انسان
کیا وحشی تک اس میں مامون ہیں۔ ھدی للعالمین کی بھی دو تاویلیں ہو سکتی
اہل عالم کو توحید کی طرف ہدایت اور حج وصلوٰۃ کی ہدایت فیہ آیات بینات مقام
ابراھیم ومن دخلہ کان آمنا میں مقام ابراہیم میں آیت (علامت) سے مرا

ایک سخت پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم ثبت ہیں اور برکات مقام کی آیات میں سے مظلوم اور خائف کو امن ملنا۔ دیکھنے سے عمارت مبارکہ کی ہیبت وعظمت کا رعب دل پر بیٹھنا طیور کو بوجہ تعظیم اوپر سے اڑ کر نہ گذرنا اور ظالم وسرکش کو فوری سزا کا ملنا ہے ٭

ایام جاہلیت میں بھی عرب اور اصحاب فیل بجالیکہ نہ وہ اہل کتاب تھے نہ اس کے متعلق کسی شریعت کے پیرو تھے۔ اس کی تعظیم وتکریم کیا کرتے تھے حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ان کے کسی قریبی رشتہ دار مثلاً باپ اور بھائی تک کو بھی قتل کر کے حرم میں داخل ہو جاتا تھا تو اس سے بھی خون بہا اور دیت وانتقام نہیں لیتے تھے۔ یہ سب آیات اللہ تھیں جو خدا نے طبعی طور پر انکے دلوں میں ڈال رکھی تھیں۔ شریعت اسلامی میں امن کے مفہوم میں دو تاویلیں ہو سکتی تھیں۔ اوّل نار دوزخ سے امن دوم قتل وخونریزی کی آگ سے امن۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ نے حرم کعبہ میں قتل وخونریزی کی قطعاً ممانعت فرمائی ہے۔ حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے وقت ایک خطبہ میں فرمایا:۔

اُحِلَّتْ لِیْ سَاعَۃً مِنْ نَہَارٍ وَلَمْ تُحَلَّ لِاَحَدٍ مِنْ قَبْلِیْ وَلَا تُحَلَّ لِاَحَدٍ مِنْ بَعْدِیْ ٭

کعبہ ان اوّل بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکاً وھدًی للعالمین۔ حضرت علیؓ سے جعفر بن محمد بن علیؓ نے روایت کی ہے کہ جس وقت اللہ سبحانہٗ وتعالےٰ نے فرشتوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ تو انہوں نے کہا اَتَجْعَلُ فِیْہَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْہَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ۔ یہ بے محل اور معترضانہ کلام سن کر غضب الٰہی جوش میں آیا اور فرمایا تم کچھ نہیں سمجھتے۔ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ

اب فرشتوں پر خوف طاری ہوا۔ اور عرش کے گرد لگے طواف کرنے۔ انکی عاجزی تو یہ محرّک رحمت الٰہی ہوئی۔ اور انہیں معاف کردیا۔ اور فرمایا کہ زمین پر بھی ایک ایسا مکان بناؤ۔ جہاں میرے گنہگار بندے طواف کرکے مجھ سے طالب معافی ہوں میں اسی طرح ان کے گناہ معاف کردوں گا ۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام غضب الٰہی کی وجہ سے بہشت سے نکالے گئے اور زمین پر پھینکے گئے۔ تو انہوں نے دعا فرمائی کہ مجھے زمین پر بہشتی عبادت خانہ کے مشابہ ایک عبادت خانہ بنوادیا جائے۔ تاکہ میں وہاں عبادت کرسکوں۔ دعا بدرجۂ اجابت پہنچی اور فرشتوں نے ایک عبادت خانہ بعینہٖ اسی بہشتی عبادت خانہ کی طرح جہاں حضرت آدم علیہ السلام جنّت میں عبادت کیا کرتے تھے بنادیا۔ یہ عبادت خانہ طوفان نوح میں منہدم ہوگیا۔ اس کے بیت اوّل ہونے کے بارہ میں اختلاف ہے۔ بہرحال یہ ثابت ہے کہ کعبہ سے پہلے دنیا میں کوئی عبادتخانہ نہ تھا۔ حسن رض اور دیگر علماء کا قول ہے کہ مکّہ سے پہلے اور مکانات بھی دنیا کے پردہ پر موجود تھے۔ مگر مجاہدؒ اور قتادہؓ کا قول ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا مکان یہی ہے کثرت رائے قول اوّل کے حق میں فیصلہ کرتی ہے اور بہت سے مفسّرین اور مؤرخین کا اتفاق بھی اسی رائے پر ہے۔ جس قاعدہ پر زمانہ حال کے مؤرخ پرانے زمانہ کا حساب لگاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سن کی بیالیسویں صدی میں یعنی حضرت عیسیٰ سے انیسویں صدی ماقبل میں کعبہ بنا تھا۔ اگر اس حساب کو صحیح مانا جائے تو بھی ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں جہاں تک معلوم ہوا ہے کعبہ سے پہلے کوئی گھر خدا کی عبادت کے لئے نہیں بنایا گیا تھا بلکہ کعبہ سب سے اوّل بنا تھا ۔

معتبر روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ دنیا میں نہایت قدیم زمانہ سے ہے مشہور مؤرخ گبن اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ کعبہ کی قدامت سنہ عیسوی سے

کی ہے۔ ساحل بحر احمر کے ذکر میں ڈایوڈورس یونانی مورخ نے تہمودیت اور سبین
بیان میں ایک مشہور معبد (کعبہ) کا ذکر کیا ہے جس کے اعلےٰ درجہ کے تقدس کی
تمام عرب تعظیم کرتے تھے۔

غرض طوفان نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام نے خانہ کعبہ
کی عمارت کی تجدید کی آیہ واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل ربنا
تقبل منّا انک انت السّمیع العلیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل
علیہما السلام اس امر پر مامور تھے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد کعبہ بنی جرہم
کے قبضہ میں آیا۔ ایک دفعہ ان کے زمانہ میں پہاڑی نالہ سے پانی کعبہ کے اندر داخل
ہو گیا۔ اور سب عمارت ڈھ گئی۔ بنی جرہم نے حضرت ابراہیمؑ کی بنیاد پر اُسے تعمیر
کرا دیا۔ بعد ازاں قوم عمالقہ (بنی حمیر) نے بنی جرہم پر غلبہ پایا اور کعبہ کو از سر نو
تعمیر کیا۔ قریش میں سے سب سے اوّل قصی بن کلاب نے کعبہ کی تجدید کی۔ کھجور اور
بیری کی لکڑی سے چھت ڈالا۔ اعشیٰ شاعر کہتا ہے ؎

حلفتُ بثوبیْ راھبِ الشّامِ والّذی ٭ بناہٗ قُصَیٌّ جدّہٗ وابنُ جُرھمِ
فانْ شبّ بینی انّ العداوۃِ بیننا ٭ لیرتحلن منّی علی ظھرِ شیّمِ

یہ تعمیر آنحضرت صلعم سے قریباً دوسو سال پیشتر ہوئی تھی۔ آنحضرت صلعم کی
پندرہ برس کی عمر مبارک تھی کہ پہاڑی نالوں کے سیلاب جنہیں عرب اُسیول عوارم کہتے
تھے کعبہ کی عمارت میں اکثر داخل ہو جاتے تھے جنکی وجہ سے کعبہ کی کچھ دیواریں پھٹ
گئیں۔ اب قریش کو اس کی تعمیر کی فکر ہوئی۔ مگر مارے رعب اور ڈر کے کوئی شخص
انہدام عمارت کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ انہی دنوں مکہ میں ایک سانپ تھا جس سے
لوگ بہت ڈرا کرتے تھے۔ ایک دن وہ نکل کر کعبہ کی دیواروں پر بیٹھا ہوا تھا کہ
ایک پرند غائب سے آکر اس کو جھپٹا مار کر اڑا لے گیا۔ قریش نے اس میں اپنے ارادہ

کے لئے نیک فال لی اور تعمیر کعبہ کا خیال زیادہ مضبوط ہوگیا - اسی اثنا میں ا
عیسائی تاجر کا جہاز بندرگاہ شعیب (جدہ) کے قریب ٹکر اکر ٹوٹ گیا -
جا کر وہ شکستہ جہاز خرید لیا - اب سامان تو ہوگیا مگر انہدام کی جرأت کسی کو نہ ہو
ڈرتے تھے - اگر ڈھائیں گے تو خدا جانے کیا آفت آئیگی - آخر ولید بن مغیرہ نے
کرہ اکیا اور کہا کہ میں ڈھانا شروع کرتا ہوں - بڈھا تو ہوں ہی - اگر آفت آئیگی
تو ہو ہی رہا ہوں - چنانچہ اس نے دیوار پر چڑھ کر ڈھانا شروع کیا اور حضرت ا
بنیاد تک برابر کر دیا - عمارت شروع ہوگئی - کعبہ کو چار ذرعہ اور ایک بالشت کر
اور اس قدر کرسی پر دروازہ بلند کیا کہ نالے کا پانی اوپر نہ چڑھ سکے اور اس حکمت
جس کو چاہیں اندر نہ داخل ہونے دیں - جب بناتے بناتے اس مقام پر پہنچے -
حجر اسود لگانا تھا تو تنازعہ برپا ہوگیا کہ کونسا قبیلہ اسے رکھے - ابو امیہ بن مغ
تجویز کیا کہ جو شخص سب سے پہلے اس راستہ سے آئیگا وہی اسے رکھے گا - آخر
صلعم جن کی عمر اس وقت چھوٹی تھی تاہم پتھر ڈھونے میں شریک تھے - سب سے
اس راستہ سے آئے - سب نے خوش ہو کر امین امین (جاہلیت میں حضرت ص
بوجہ دیانتداری کے امین کہا کرتے تھے) کہہ کر چلانا شروع کیا اور حضرت کو ف
حکم بنایا - حضرت صلعم نے یہ حکم (النبی نبیٌ[ل] ولو کان فی بطن امہ) روح الق
سوئید ہو کر ایسا فیصلہ کیا کہ سب خوش ہو گئے - آپ نے چادر مبارک زمین پر
اور حجر اسود کو اس پر رکھا - سب سرداروں کو بلا کر اس کے کونے پکڑوا دئے
اٹھا کر وہاں لائے - پھر نیچے سے چادر کھسکالی - گویا سارے قبائل نے اس
میں اس تدبیر سے حصہ لیا - بعد ازاں سنہ ۶۴ ھجری میں جب یزید خلیفہ ہوا تو
ابن زبیر نے اس کی بیعت سے انکار کیا - اس پر حصین بن نمیر یزید کی طرف

[ل] نبی نبی ہی ہوتا ہے خواہ وہ ماں کے پیٹ میں ہی کیوں نہ ہو ۱۲ منہ

...زبیر پر حملہ آور ہوا - اور آخر الذکر کو شکست دیکر خانہ کعبہ میں محصور کرلیا - اور
...قبیس پر سے منجنیق سے پتھر مارنے لگا - اس سے دیواروں کو سخت نقصان پہنچا
...سے انہیں دنوں ابن زبیر کے متعلقین میں سے ایک شخص آگ لے جارہا تھا
...ہوا تیز چل رہی تھی - آگ کی چنگاری اُڑ کر خانہ کعبہ کے پردوں میں جا لگی اور سارا
...جل اُٹھا - یزید کی وفات کے بعد حصین بن نمیر واپس چلا گیا اور عبداللہ بن زبیر
...رت کعبہ کی فکر پڑی - اُنہوں نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو بُلا کر مشورہ کیا مگر جابر بن
...للہ و عبید بن عمیر و عبداللہ ابن عباس نے مشورہ ان کے خلاف دیا - ابن زبیر
...اکہ شرم کی بات ہے کہ جب لوگوں کے گھر منہدم ہوجائیں تو انکے بنانے میں جلدی
...ہو مگر خانہ کعبہ کے لئے اس قدر سستی اور تامل - اگر تم لوگ شریک ہونا نہیں چاہتے
...اری مرضی - میں تو کل ہی عمارت شروع کردوں گا - اور جناب رسول کریم کی ایک
...ث بیان کی کہ لو کانَ لنا سعۃ لبنیتہٗ علی اساس ابراھیم ولجعلت لہ بابین
...یا و غربیا - اسود نے پوچھا کہ آپ نے جناب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ سے
...س بارہ میں کچھ سنا ہے؟ - فرمایا - ہاں - اور یہ حدیث پیش کی ان قومک استقصروا
...االبیت ولولا عھد حداثۃ قومک بالکفر لھدمتہ واعدتُ فی ما
...ا - یعنی حضرت عائشہ رضہ سے رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ تیری قوم نے کعبہ کی تعمیر
...و تاہی کردی - اگر تیری قوم کا زمانہ کفر کے زمانہ سے قریب نہ ہوتا تو جو کچھ انہوں
...وڑ دیا ہے میں پھر کعبہ میں ملا دیتا ؀

الغرض صبح ہوتے ہی عبید بن عمیر کو بلا بھیجا - مگر وہ اُس وقت خواب میں تھے
...ا کو واپس کہلا بھیجا کہ ان کو جگا دو - اور خود یہ کہا کہ کیا آپ نے جناب رسول صلعم
...حدیث نہیں سنی - انّ الارض لتضج الی اللہ من نومۃ العلماء فی الضحی

...کر ہمیں گنجائش ہوتی تو میں حضرت ابراہیم کی بنیاد پر بناتا اور اس کے دو دروازے مشرقی اور مغربی قائم کرتا
...زمین علما کے چاشت کے وقت سونے پر چلاتی ہے اور خدا سے فریاد کرتی ہے ۱۲ منہ

غرض عمارت سابقہ باقی کو گرا دیا۔ حضرت عباس رضؓ نے کہلا بھیجا کہ عمارت گرا
لوگوں کو بے قبلہ نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ بہتر ہو کہ باہر پردہ کر لیا جائے اور کام ا
اندر ہوتا رہے۔ ابن زبیر نے ایسا ہی کیا۔ حجر اسود کو ریشم میں لپیٹ کر ایک
میں رکھ دیا۔ بنیاد کھودتے کھودتے مقام حطیم کے قریب حضرت ابراہیمؑ کی
ہوئی بنیاد نظر پڑی۔ وہاں سے کام شروع ہوا۔ جناب رسول کریم کی حدیث
لھا بابین شرقیا یدخل الناس فیہ وغربیا یخرج الناس منہ کے مطابق
دروازے بھی بنائے۔ زبیر ابن بکار کا قول ہے کہ عبداللہ بن زبیر کو کھنڈرات
سے سبز رنگ کی پٹریاں ملیں جو ایک قبر پر لگی ہوئی تھیں۔ عبداللہ بن صفوان نے
کہ یہ قبر حضرت اسمٰعیلؑ کی ہے۔ ابن زبیر نے ان کو وہیں کا وہیں رہنے دیا۔ عمار
تیار ہو گئی۔ مگر تھوڑی مدت بعد عبدالملک بن مروان نے حجاج کو ابن زبیر کے
مقابلہ میں بھیجا۔ ابن زبیر مسجد میں پھر محصور ہو گئے۔ منجنیق کے پتھر نے خانہ کعبہ
دیواروں کو پھر سخت نقصان پہنچایا۔ ابن زبیر بھی اس جنگ میں شہید ہو گئے
بعد ازاں حجاج نے خلیفہ عبدالملک کے حکم سے بنیاد قریش پر پھر از سر نو کعبہ کو
کیا۔ آج تک اسی حالت میں ہے ٭

غلاف کعبہ

غلاف کے متعلق اسلام کے رو سے جو بحث ہو سکتی ہے وہ اسی قدر ہے ما هذا لتعظیما لکعبۃ و لتحسینھا
کفر علی مذهب الاسلام والثانی امر لا باس بہ۔ یعنی یہ کام کس ارادہ سے
کیا جاتا ہے۔ کعبہ کی پرستش کے لئے یا خوبصورتی اور آرائش کے لئے۔ اگر پہلی نیت
سے کیا جائے تو اسلامی رو سے کفر ہے اور اگر دوسرے ارادہ سے کیا جائے
کچھ مضائقہ نہیں۔ بروایت ابو ہریرہ رضؓ سب سے اول چھ سو سال قبل از

لہ یعنی اس کے دو دروازے بنا تا ایک شرقی جہاں سے لوگ داخل ہوں اور دوسرا غربی جہاں سے وہ باہر

بعد یمانی نے کعبہ پر غلاف چڑھایا۔ بعدازاں جناب رسول صلعم نے یمنی چادروں اور حضرت ابو بکر رضہ و حضرت عثمان رضہ نے قبطی چادروں کا غلاف چڑھایا (بقول محارب بن زیاد) خالد بن جعفر نے ریشمی غلاف چڑھایا۔ سلاطین بنو امیہ کے عہد میں اہل نجران کے جنگی لباسوں سے جن پر ریشم کا کام ہوا ہوتا تھا چڑھایا جاتا تھا۔ خلیفہ متوکل علی اللہ نے خانہ کعبہ کی دیواروں کو چاندی سے منڈھایا اور چھت اور چار دیواری کعبہ پر سونے کی پتریاں چڑھائیں اور شہتیروں پر ریشم لپیٹا اور ریشم کا غلاف چڑھایا۔ سلطنت عثمانیہ میں ہر سال ریشم کا لباس خانہ کعبہ پر چڑھایا جاتا رہا۔ اور پرانے غلاف کے ٹکڑے کر کے حاجیوں میں بطور تبرک تقسیم ہوتے رہے ؎

مسجد حرام پہلے یہ حصہ کعبہ کے زائرین کے ٹہلنے کے لئے کھلی جگہ تھی۔ جناب رسالتمآب اور حضرت ابو بکر رضہ کے عہد تک اس کے گرد کوئی دیوار نہ تھی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بوجہ کثرت زائرین انہوں نے اردگرد کے بہت سے مکانات اس میں اور... بڑھا دئے۔ جن لوگوں نے قیمتاً دینا منظور نہ کیا انکے مکانات زبردستی چھین کر ان کو معقول قیمت دیکر راضی کر لیا۔ اور اس کے گرد دیوار بنائی جس پر چراغ رکھے جاتے تھے۔ پھر حضرت عثمان رضہ کے عہد میں اور مکانات خرید کر صحن وسیع کیا گیا۔ مگر بعض نے مکانات بیچنے منظور نہ کئے بلکہ مسجد کے قریب ہر وقت شور کرنے لگے۔ اس پر حضرت عثمان رضہ نے اُنہیں اس حرکت ناشائستہ سے روکنے کے لئے ان سب کو قید کر لیا۔ اور مکانات منہدم کر کے اور اُنہیں معقول معاوضہ دے کر راضی کر لیا۔ اور مسجد کا چھجّہ بھی بنایا۔ مسجدوں میں چھجّہ بنانے کے موجد حضرت عثمان رضہ ہی ہیں۔ بعدازاں ولید بن عبد الملک نے زیادہ وسیع کیا اور سنگ مرمر کے ستون بنوائے۔ منصور اور مہدی نے بھی مسجد کو حسب ضروریات وسیع کر لیا ؎

اصنام کعبہ کعبہ میں قبل از اسلام بُت تھے اور کفار انکی پرستش کیا کرتے تھے

ان میں سے مشہور کے نام یہ ہیں :-

(۱) اساف و نائلہ - بنی جرہم نے صفا اور مروہ کی پہاڑیوں پر دو بت رکھے ہوئے تھے - صفا پر اساف بصورت مرد اور مروہ پر نائلہ بصورت عورت استادہ تھے اصل میں وہ دو انسان تھے - بنی جرہم ان کو دیوتا خیال کرتے تھے - مرنے کے بعد اُن کے بُت بنا کر پرستش کرنے لگے - فتح مکہ کے روز رسول خدا صلعم نے انکو اور بتوں کے ساتھ توڑ ڈالا :

(۲) نہیک و مطعم - یہ بھی دو بُت صفا اور مروہ پر استادہ تھے :

(۳) ہُبَل - یہ ایک بڑا بُت خانہ کعبہ میں تھا - کعبہ کے اندر دائیں طرف جو خزانہ کا کنواں حضرت ابراہیم کا کھودا ہوا تھا - اس پر یہ بُت کھڑا کیا گیا تھا - اس سے ابو سفیان نے فتح مکہ کے دن مدد چاہی تھی :

(۴) منات - سمندر کے کنارہ پر عمر بن لحی نے نصب کیا ہوا تھا وہ ایک ناتراشیدہ لمبا سا پتھر تھا :

(۵) لات - ایک ناتراشیدہ پتھر تھا جس کی نسبت خیال تھا کہ شان باری کے کسی کرشمہ نے اس پتھر میں حلول کیا ہے :

(۶) عُزّٰی - تین درخت تھے جن میں ذات باری کا حلول سمجھ کر پوجا کیا کرتے تھے :

(۷) ذات انواط - یہ ایک سرسبز درخت تھا جسے حُنین کے لوگ پوجتے تھے :

(۸) ذوالکفین - یہ بھی ایک بُت تھا جس کو عُمر بن حمیر نے فتح مکہ کے بعد جلایا تھا

(۹) سُواع قبیلہ ہذیل کا مشہور بُت تھا جس کو عمرو بن عاص نے آنحضرت صلعم کے اشارہ سے بعد فتح مکہ توڑا تھا :

(۱۰) وَدّ - دومۃ الجندل میں بنی کلب کا بُت تھا :

(۱۱) یغوث - بنی مراد اور بنی عطیف کا بُت تھا ؛

(۱۲) یعوق - بنی ہمدان کا بُت تھا ؛

(۱۳) نسر - بنی حمیر آل ذی الکلاع کا بُت تھا ؛

مکہ میں قریش میں سب سے بڑے اہل الرائے صاحب فضل و تجربہ لوگ - ایام جاہلیت میں تھے اور بڑی بڑی سوسائٹیاں اور انجمنیں قائم تھیں - کعب بن لوی بن غالب کے پاس سب قریش ہفتہ وار جمع ہوتے تھے - جس دن یہ مجلس ہوتی تھی اسے عروبہ کہا جاتا تھا کعب نے اس کا نام بدل کر جمعہ رکھا - اس دن وہ قریش کے سامنے لکچر دیا کرتا تھا - اور حضرت صلعم کی بعثت کی نسبت اپنے الہام سنایا کرتا تھا - یہ الہام اس قدر مدلل ہوتے تھے کہ فوراً دلوں پر اثر کرتے تھے ؛

اس کے بعد ریاست قصی بن کلاب کے قبضہ میں آئی - اس نے مکہ میں دارالندوہ بنائی جس میں قریش کے مقدمات فیصل ہوتے تھے - پھر یہ مقام ملکی اور معاشرتی امور پر بحث کرنے کے لئے استعمال کرنے لگا - قریش جوں جوں زمانہ نبوت کے قریب ہوتے گئے - قوت اور تعداد میں بڑھتے گئے - حتیٰ کہ تمام عرب میں ان کی فضیلت قبول کی گئی - اور یہ بوجہ اس برکت کے تھا جو تقدیر نے ولادت جناب حضرت صلعم کی صورت میں اُن پر نازل فرمائی تھی - آنحضرت صلعم کی ولادت نے انکی ترقی اور تبرک کو اوج فلک تک پہنچا دیا - ذالك فضل الله یؤتیه من یشاء - آنحضرت صلعم کفار مکہ کی بے انتہا تکلیفوں اور اذیتوں سے تنگ آ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرما ہوئے آنحضرت صلعم پھر آٹھ سال کے بعد جب اسلام کا غلبہ ہوا تو فتح حاصل کرکے مکہ میں تشریف فرما ہوئے - آنحضرت صلعم کے مکہ واپس آنے کے بارہ میں مختلف روایات ہیں - اس امر میں کہ آپ صلح سے داخل ہوئے یا امن سے - امام ابوحنیفہ و مالک علیہما الرحمتہ کا قول ہے کہ وہ غلبہ اور زور شمشیر سے داخل ہوئے - مگر آپ نے انصار

کو لوٹ اور غارت سے منع فرمایا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلعم ابوسفیان معاہدہ کر کے صلح سے داخل ہوئے۔ اس میں یہ شرطیں تھیں کہ جو شخص اپنا دروازہ کھلا چھوڑ دے۔ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو۔ جو کعبہ کے پردہ تلے ہو۔ وہ امن میں رہیگا۔ سوائے ذیل کے چھ اشخاص کے جن کا قتل ہر حالت میں مباح ہو گا ٭

اوّل۔ عبداللہ بن سعد جو پہلے مسلمان تھا اور آنحضرت صلعم کی وحی لکھا کرتا تھا۔ بعد ازاں مرتد و مشرک ہو کر کفار میں جا ملا ٭

دوم۔ عبداللہ بن اخطل۔ بنی تمیم بن غالب میں سے تھا۔ پہلے مسلمان تھا آنحضرت صلعم نے اسے کفار کے پاس مع دو اور انصار کے تصدیق کے لئے بھیجا۔ راہ میں اپنے ایک مسلمان غلام کو قتل کر کے مرتد ہو گیا۔ اس کے پاس دو خوبصورت نوجوان گانے والی لونڈیاں تھیں۔ جو آنحضرت صلعم کی ہجو میں گیت گایا کرتی تھیں۔ آپ نے ان کو اسی مردود کے ساتھ قتل کرنے کا حکم فرمایا ٭

سوم۔ حویرث بن نغیہ بن وہب بن عبد قصیٰ۔ یہ آنحضرت صلعم کو مکہ میں سخت ایذا دیا کرتا تھا ٭

چہارم۔ مقیس بن صبابہ۔ یہ پہلے اسلام لایا تھا مگر ایک مسلمان انصاری کو قتل کر کے مرتد ہو گیا تھا ٭

پنجم۔ سارہ (بنی عبدالمطلب میں سے ایک شخص کی لونڈی) ٭

ششم۔ عکرمہ بن ابوجہل جو حضرت صلعم کو مکہ میں سخت تکالیف پہنچایا کرتے تھے ٭

بیع و اجارہ در مکہ فقہاء میں مکہ میں مکانات کو بیع کرنے اور کرایہ پر دینے کے بارہ میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ بیع مکانات

سے منع فرماتے ہیں لیکن سوائے ایام حج کے کرایہ پر دینے کو جائز رکھتے ہیں۔ اور اُن کی دلیل یہ
ت ہے قال رسول اللہ صلعم مکۃ حرام لایحل بیع رباعہا و لا اجور
تھا۔ یعنی آپ نے فرمایا کہ مکہ کے منازل کی بیع اور کرایہ پر دیا جانا حلال
نہیں ہے ❊

امام شافعیؒ بیع اور کرایہ پر دینے کو روا رکھتے ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم نے اہل مکہ کے سامنے فرمایا تھا کہ مکہ کی زمانہ اسلام میں وہی حالت رہے گی جو قبل از اسلام تھی۔ آنحضرت صلعم نے بعد فتح مکہ اسی لئے غنیمت اور لوٹ مار سے منع فرمایا ❊

دارالندوہ ہی کو لو۔ اسے معاویہ نے عہد اسلام میں عکرمہ بن عامر بن ہشام بن عبداللہ بن عبدالدار بن قصی سے خریدا اور اسے اپنا دارالامارت بنایا۔ تو پھر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے مسجد کو وسیع کرنے کی خاطر مکہ کے مکانات خرید فرمائے۔ اور انکے مالکوں کو انکی قیمت ادا کی۔ اگر یہ حرام ہوتا تو وہ مسلمانوں کے روپیہ کو حرام کام میں کبھی خرچ نہ کرتے۔ ایسا ہی مکانات کو اُجرت پر دینے کو محمول کر لینا چاہیے ❊

حرم تعریف۔ مکہ کے گرد چند میل کے فاصلہ تک وہ قطعہ زمین ہے جہاں سے حاجی لوگ احرام باندھتے ہیں ❊

حدودِ حرم مدینہ کی طرف سے آتے ہوئے تنعیم کے ورے بنی نفر کے گاؤں سے تین میل کے فاصلہ پر جعرانہ کی طرف سات میل کے فاصلہ پہ طائف کی طرف عرفہ کے پاس بطن نمرہ سے سات میل کے فاصلہ پر عراق کی جانب سات میل کے فاصلہ پر پہاڑ کے دامن تک۔ یہ وہ حد ہے جس کی نسبت خداوند تعالےٰ نے تعظیم و تکریم کے الفاظ فرمائے اور اسے سب علاقوں پر افضل اور اعلےٰ

بیان فرمایا کما قال واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا بلدا امنا وارزق
من الثمرات - کیونکہ اس سے پہلے یہ جگہ وادغیر ذی زرع تھی - اس آیت میں
ابراہیمؑ نے دعا فرمائی کہ یہاں ایسا امن وآرام ہو کہ لوگ بعیش زندگی بسر کرسکیں خ
تعالیٰ نے انکی دُعا کو قبول فرمایا - اور اس مقام کو حرما امنا یتخطف الناس من حو
بنا دیا اور عیش وعشرت کے تمام قدرتی سامان مثلاً میوے - چشمے - باغ وغیرہ
کردئے ؛

علماء کا اس بارہ میں اختلاف ہے کہ کیا مکہ اور حرم پہلے ہی امن تھے یا حضر
ابراہیمؑ کی دُعا سے ہوئے - ایک فریق کی یہ رائے ہے کہ حرم ہمیشہ سے ظالمو
اور جابروں کے خوف وزلزلہ کی دستبرد سے محفوظ ہے - حضرت ابراہیمؑ کی دُ
سے قحط اور خشک سالی سے امن کی استدعا پائی جاتی ہے ؛

سعید بن ابی سعید ابو شریح الخزاعی سے روایت کرتے ہیں کہ جس دن آنحض
صلعم نے مکہ کو فتح فرمایا تو عرب کے ایک مجمع کثیر کو مخاطب کرکے یوں ارشاد فرمایا - ای
الناس ان اللہ سبحانہ حرم مکۃ یوم خلق السموت والارض فھی حرام ا
یوم القیامۃ لا یحل لامرئ یومن باللہ والیوم الاخر ان یسفک بھا دم
او یعضد بھا شجرا وانھا لا تحل لاحد من بعدی ولم تحل لی الا ھذہ ال
غضبا علی اھلھا الا وھی قد رجعت علی حالھا بالامس - الا لیبلغ الشاھ
الغائب - یعنی اے لوگو! خداوند تعالیٰ نے مکہ کو اُسی دن حرام کیا (قتل وغیرہ حرا
قرار دیا) جس دن زمین وآسمان پیدا کیا اور وہ قیامت تک حرم ہی رہیگا - اور کسی
مومن کے لئے حلال نہیں ہے کہ اس میں خونریزی کرے یا درخت کاٹے - میرے بعد
بھی کسی پر حلال نہیں ہوگا - سوائے اس وقت کے مجھ پر بھی حلال نہیں ہے - کیونکہ
اس وقت اس کے اہل پر غضب الٰہی نازل ہے - کل سے پھر اصلی حالت پر ہوگیا ہے

...یہ ۔ حکم ۔ حاضرین غائبوں کو سنا دیں ۔
دوسرے فریق کا قول ہے کہ مکہ دیگر بلاد کی طرح تھا ۔ اس میں قتل و خونریزی
...یت نہ تھی ۔ حضرت ابراہیم کی دعا سے قتل و خونریزی حرام ہوئی ۔ اسی طرح
...یں آنحضرت صلعم کی دعا سے یہ باتیں حرام ہوئیں ۔
...اشعت نافع سے بقول ابوہریرہ رضہ روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے ان
...ہیم کان عبد اللہ وخلیلہ وانی عبد اللہ ورسولہ وان ابراھیم حرم مکۃ
...ی حرمت المدینۃ مابین لابتیہا عضاھا وصیدھا ولا یحمل بھا سلاح
...تال ولا یقطع بھا شجر الا لعلف لعیر ۔ (ترجمہ) ابراہیم اللہ کے بندے اور اس کے
...یل تھے ۔ اور میں خدا کا بندہ اور رسول ہوں ۔ ابراہیم نے تو مکہ میں (خونریزی وغیرہ)
...رام فرمائی اور میں مدینہ میں حرام کرتا ہوں ۔ اس کے دونوں کنکریلی واد یوں کے
...یان کے درختوں اور شکار کو ۔ چاہیئے کہ اس میں لڑائی کے لئے ہتھیار نہ اٹھایا جائے
...اور نہ درخت کاٹا جائے مگر اونٹ کے چارے کے لئے ۔

زمزم یہ مقدس چشمہ اس وقت کی یادگار ہے جبکہ حضرت ہاجرہ رضہ مع حضرت اسمٰعیل ع کے اس بیابان لق و دق میں پہنچائے گئے ۔ حضرت اسمٰعیل ع
...یہ پیاس سخت بیقرار تھے ۔ اور جیسا کہ اضطراب میں قاعدہ ہے ۔ اُنہوں نے
...نی ایڑیاں زمین پر رگڑیں ۔ قدرت الٰہی سے یہ چشمہ نمودار ہوا ۔ پانی کے سوتوں سے
...نہریں جاری ہوگئیں اور سبزی لہرانے لگی ۔ قبیلہ بنی جرہم کے لوگ تلاش آب میں پھرتے
...پھراتے یہاں آپہنچے ۔ اور حضرت ہاجرہ رضہ کی اجازت سے یہاں آباد ہوئے ۔ مکہ کی
آبادی کا زیادہ تر ذریعہ یہی چشمہ تھا ۔ کچھ مدت کے بعد یہ چشمہ خشک ہوگیا ۔ واقعہ اصحاب
...فیل کے بعد عبدالمطلب جد جناب رسول علیہ السلام کو خیال ہوا کہ جہاں وہ چشمہ تھا وہاں
...سے کھود کر پانی نکالا جائے ۔ چنانچہ اُنہوں نے بڑے فساد کو رفع کرکے اسے کھودا

اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ سنہ ۲۲۳ و سنہ ۲۲۴ ہجری میں پھر وہ خشک ہو
اسلئے وہ دو ذرعہ اور کھود اگیا۔ مگر سنہ ۲۲۵ ہجری میں سخت بارش ہوئی اور اس
کنوئیں میں بہت سا پانی جمع ہوگیا۔ ہارون الرشید کی خلافت میں بھی نو جگی آب دو
ذرعہ اور کھود اگیا۔ اور مہدی اور محمد بن الرشید کی خلافت میں بھی گہرا کیا گیا۔ آجکل
ہر سال صاف کیا جاتا ہے ؛

فرضیت حج

فریضہ حج منجملہ ارکان اسلام ایک رکن عظیم ہے۔ جناب پیغمبر علیہ السّلام حجۃ الوداع کے موقعہ پر میدان عرفات میں جب اپنی راحلہ پر سوار تھے تو آیۂ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا نازل ہوئی۔ اس آیت کو آیت الدین بولتے ہیں حسن اتفاق سے وہ دن جمعہ کا تھا اور یوم عرفہ کا بھی وہی دن تھا۔ چونکہ فریضۂ حج کے اثنائے عمل میں یہ آیت شریفہ نازل ہوئی اس لئے اس سے فریضہ حج پر احکام شریعت کے خاتمہ کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ اور دو ماہ کچھ دن اوپر جناب والا کی وفات حسرت آیات وقوع میں آئی۔ حکم حج کی فرضیت بروئے نص قرآنی ثابت ہے حیث قال عزّوجل و للہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا۔ حدیث شریف میں حکم حج بیت اللہ شریف کے متعلق یوں وارد ہوا ہے۔ من مات ولم یحج فلیمت ان شاء یھودیا وان شاء نصرانیا اس شدید وعید سے حکم حج کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جب جناب خلیل اللہ علیہ السّلام نے اپنے فرزند ارجمند اسمٰعیل علیہ السّلام کے ساتھ ملکر بیت اللہ کی عمارت کی تجدید کی تو آپ کو جناب باری سے حکم ہوا واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا و علی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق۔ یعنی تمام لوگوں کو فریضہ حج کی اطلاع کر دو۔ جس پر وہ تمام اطراف عالم سے سوار و پیادہ ہوکر آیا کرینگے جن

بفضلہ تعالےٰ باحسن وجوہ ہو رہی ہے اور تا قیامت ہوتی رہیگی۔ انشاءاللہ تعالےٰ

فضیلت بیت اللہ

فضیلت بیت اللہ میں آیات واحادیث بکثرت آ چکی ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے ان اوّل بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکاً وھدی للعالمین۔ اس آیت سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ معبود حقیقی کی عبادت کے لئے دنیا میں سب سے پہلا عبادت خانہ بیت اللہ ہے۔ اس لئے بمقتضائے الفضل للمتقدم دنیا بھر کے عبادت خانوں پر اسکو شرف حاصل ہے۔ جس طرح حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام تمام بنی آدم کے لئے جدِّ اعلیٰ تسلیم کئے گئے ہیں۔ اسی طرح دنیا بھر کے عبادت خانوں کی اصل یہی بیت اللہ شریف ہے۔ اور چونکہ بموجب بیان سابق حضرت آدم علیہ السلام کی دعا سے یہ عبادت خانہ بحکم الٰہی قرار پایا تھا۔ اس لئے اس کو بالفاظ مبارکاً وّھدًی للعالمین تعبیر فرمایا یعنی ایسا گھر جو اہل عالم کے لئے منبع برکات وہدایات ثابت ہوگا اور لفظ للعالمین سے اسے تمام اہل عالم کا مرجع قرار دینا بخوبی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے الفاظ مثابۃً للناس کے یہی معنی ہیں۔ پھر مکہ معظمہ کو البلد الامین کے معزز لقب سے قرآن پاک میں یاد کیا گیا ہے۔ اس کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ بحکم آیہ من دخلہ کان امنا۔ اس میں داخل ہونے والا ہر ایک قسم کے امن وامان کا مستحق ہو جاتا ہے جسمانی طور پر بھی (جسکا ذکر اوپر آ چکا) اور نیز روحانی طور پر بھی۔ کیونکہ بموجب فرمان نبوی فریضہ حج کو خالصاً لوجہ اللہ بجا لانے والا اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا ہی پاک ہو جاتا ہے جیسا کہ نوزائیدہ بچہ۔ اس توجیہ کے مطابق اس کا مادہ امن ہوگا۔ مگر بعض محققین نے اس کی یہ تحقیق کی ہے کہ لفظ امین اس مقام پر مادہ امانت سے مشتق سمجھنا چاہیے جس میں نہایت باریک طور پر اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ بار امانت جس کا حکم آیہ انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت والارض والجبال

فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان حضرت انسان متحمل ہوا۔ اسی مبارک مقام پر بطور ودیعت رکھا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابو البشر علیہ السلام کے بعد تمام حضرات انبیا علیہم السلام اس مقام سے مستفیض ہوتے چلے آئے جس کی تکمیل یعنی حقیقت توحید کا اتمام بروجہ کمال جناب خاتم النبیین کی ذات گرامی پر ہو گیا۔ خاکسار کے ایک شعر میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حیث قلت ؎

زتاب آفتاب ما جہاں نزم چراغاں شد
زمین مکہ از نور احد دارد دمیدن ہا

آیات قرآنیہ میں بیت اللہ کی عظمت و شان کو مختلف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للناس۔ اس آیہ شریفہ سے بیت اللہ کی عزت و حرمت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ لفظ البیت الحرام میں جو ترکیب نحوی کے رُو سے بطور عطف بیان کے لایا گیا ہے اس عزت و حرمت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔ اور جس کی علت یہ ہے کہ جس طرح ملائکہ عرش رب العلمین کے طواف سے شان الوہیت کا اظہار کرتے ہیں اسی طرح زمین پر بنی آدم اس عظیم الشان معبد کا طواف کر کے جلال و جبروت الٰہی کی شان کا اظہار کرتے ہیں چونکہ ایسی باعظمت و ہیبت جگہ میں خلاف رضائے مولیٰ کسی قسم کے فسق و فجور کا ارتکاب موجب سوئے ادب ہے اس لئے حکم ہوا ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم۔ اس آیت میں جو وعید عذاب آچکی ہے وہ اس مقام کی جلالت و شان کا پتہ دیتی ہے ؛

ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے کہ اللہ تبارک و تعالےٰ ہر رات ساکنان

زمین کی طرف دیکھتا ہے جن میں سب سے اوّل اہل حرم ہیں اور اہل حرم میں سے سب سے اوّل وہ لوگ ہیں جو مسجد حرام میں ہوتے ہیں۔ سو ان لوگوں میں سے جو لوگ طواف میں یا نماز میں یا جو متوجّہ بہ کعبہ ہوں ان سب کو مغفرت عطا فرماتا ہے ÷

حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے اپنے ایک خطبہ میں اس پاک معبد کی حقیقت کو بیان فرمایا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :-

"اللہ تعالےٰ نے بیت الحرام کا حج تم پر فرض کیا ہے جو تمام لوگوں کا قبلہ ہے اور جہاں لوگ اس طرح جمع ہوتے ہیں جس طرح مواشی چشمہ پر پانی پینے کے لئے جمع ہوا کرتے ہیں اور وہاں پناہ لیتے ہیں جس طرح کبوتر اپنے آشیانہ میں پناہ لیتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالےٰ نے حج بیت اللہ کو ایک ایسا نشان بنایا ہے جس سے عزت و عظمت خداوندی کی وجہ سے بنی آدم کے خشوع و خضوع کا ثبوت ملتا ہے۔ اس نے اپنی خلقت میں سے اپنے حکم کے بندوں کو منتخب کر لیا ہے جو فی الفور لبیک لبیک پکارتے ہیں۔ اس کی دعوت کو قبول کرتے ہیں۔ اور اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور اس فرض کی بجا آوری میں ان مقامات پر کھڑے ہوتے ہیں جہاں انبیاء علیہم السّلام کھڑے ہوا کرتے تھے اور ملائکہ کرام سے مشابہت پیدا کرتے ہیں جو عرش رب العلمین کے گرداگرد طواف کرتے ہیں۔ اور عبادت الٰہی کی تجارت کر کے بڑے بڑے منافع حاصل کرتے ہیں اور مغفرت الٰہی کے وعدہ کی طرف دوڑے جاتے ہیں۔ بیت اللہ کو اللہ تعالےٰ نے منجملہ شعائر اسلام کے مقرر فرمایا ہے اور اس کے پناہ لینے والے اسے امن و امان کا گھر بناتے ہیں۔ ایسے حرم معظم کا حج اس نے فرض کیا اور اس کے ادائے حق کو واجب ٹھہرایا۔ اور اس کی زیارت لازم قرار دی۔ چنانچہ اپنی کتاب پاک میں ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے جو آمد و رفت کے مصارف

بی ۔۔۔ رکھتے ہیں - اور جو شخص باوجود استطاعت کے اس فرض کو بجا نہ لا
تو اللہ تعالیٰ لوگوں کی عبادتوں سے بے نیاز ہے"۔

اسرارِ فریضۂ حج

انسان کی حقیقت ایک جسم مادی اور روح غیرمادی کے مجموعہ کا نام ہے - اور اِن ہردو میں ایک نہایت لطیف تعلق ہے - اگر اِن ہردو میں سے کسی ایک پر کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے تو دوسرے پر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے - عبادات بدنیہ کا عمل اگرچہ اعضائے بدنی سے پورا ہوتا ہے مگر اِن کا اثر انسان کی رُوح پر یقیناً عائد ہوتا ہے - بشرطیکہ وہ عبادات خلوص پر مبنی ہوں - عام طور پر ہر ایک عبادت میں عظمت و جلال الٰہی اور عجز و انکسار عبودیت کا نقشہ عامل عبادت کے سامنے مدِنظر ہوتا ہے - فریضہ حج جس کی فرضیت کا اوپر ذکر آ چکا ہے ایک ایسی عبادت ہے جس میں جلال و جبروت خداوندی کا تصوّر اس درجہ تک غالب ہوتا ہے کہ ایک مومن اس کو ظاہر اور باطن میں ملحوظ رکھتا ہے - اور اپنے غایت خشوع و خضوع کا اظہار کرتا ہے - جب احرام باندھا جاتا ہے تو پہلے غسل کر کے نماز پڑھی جاتی ہے - اور ایک خاص قسم کا لباس پہنا جاتا ہے جس کو سب لوگ جانتے ہیں - یہ طہارت ظاہری اور سادہ لباس انسان کو اس کی اصل فطرت کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں - یہ طہارت اور لباس گویا ایک طرح کا اشارہ ہے غسل موت اور کفن کی طرف جو انسان کے اِس دُنیا سے علیحدہ ہو کر بارگاہ رب العزت میں حاضر ہونے کے لئے عمل میں لائے جاتے ہیں - سو جس طرح کہ اُس وقت انسان دُنیا سے منقطع ہو جاتا ہے - اسی طرح احرام کے وقت - یہی وجہ ہے کہ تلبیہ اور تکبیر یعنی لبیک اور اللہ اکبر کہنا ضروری قرار دیا گیا ہے - کیونکہ اِن کلمات سے بارگاہ رب العزت میں حاضر ہونے اور اس کی عظمت بیان کرنے کا اشارہ پایا جاتا ہے اِسی طرح بیت شریف کے طواف میں اس حکمت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ طواف کرنے

یا اپنی جان نثار کرنے کا عملاً ثبوت دیتا ہے۔ جس طرح پروانہ شمع کے گرد چکر لگاتے لگاتے آخر اپنی ہستی کو فنا کر دیتا ہے اور استلام الحجر یعنی حجر اسود کو بوسہ دینا شعائر اللہ کے اظہار عظمت پر مبنی ہے قال اللہ تبارک و تعالیٰ ومن یعظّم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب اور حجر اسود منجملہ شعائر اللہ کے قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ بموجب حدیث حجر اسود زمین میں خداوند تعالیٰ کا داہنا ہاتھ ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ حجر اسود کو معبود قرار دے کر ایسا کیا جاتا ہے کیونکہ یہ خیال عین شرک ہے۔ جس طرح کعبہ کو اظہار عظمت کے خیال سے بیت اللہ کہا گیا ہے اسی طرح حجر اسود کو اس کے متبرک ہونے کی وجہ سے یمین اللہ کہا جاتا ہے نہ یہ کہ کسی قسم کے خیر و شر کا اسے مصدر قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عوام الناس کے دلوں سے اسی ظن فاسد کو رفع کرنے کے لئے استلام الحجر کے وقت فرمایا کہ میں تجھے (حجر اسود کو) ایک پتھر سمجھتا ہوں جو کسی قسم کے خیر و شر کا مصدر نہیں ہو سکتا اور اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھتا تو میں تجھے ہرگز بھی بوسہ نہ دیتا۔ قاعدہ ہے کہ مقدس بزرگوں سے ہاتھ کو ملاقات کے وقت بوسہ دیا جاتا ہے۔ چونکہ حجر اسود کو یمین اللہ قرار دیا گیا ہے اسی خیال پر اس سے مصافحہ کیا جاتا ہے اور اسے بوسہ بھی دیا جاتا ہے۔ رہا یہ امر کہ اسے کیوں متبرک قرار دیا گیا ہے۔ سو اس کے متعلق آثار میں وارد ہو چکا ہے کہ وہ جنت سے دنیا میں لایا گیا تھا۔ سنتِ ابراہیمی کو قائم رکھنے کے واسطے ارشاد ہوا واتخذوا من مقام ابراھیم مصلّی۔ اس سنّت حسنہ کو قائم رکھنا منجملہ عبادات حج قرار دیا گیا ہے جس سے جناب خلیل اللہ علیہ السلام کی ایک اعلیٰ درجہ کے اخلاص نیت کا پتہ لگتا ہے۔ تاکہ زائرین بھی اس حسنہ سے ثواب عظیم کے مستحق قرار پائیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی سنن کا قائم رکھنا بجائے خود ایک بڑی عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ جناب پیغمبر علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے فبھداھم اقتدہ یعنی اپنے سے پہلے حضرات انبیاء علیہم السلام کے قدم بقدم چلا کر۔ چنانچہ یوم عاشوراء کا روزہ بھی اسی حکمت پر مبنی ہے۔ میدان عرفات میں بحاج زائرین کا جمع ہونا منجملہ ارکان حج قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ مقام استجابت دعا کا ہے۔ غور کرو کہ تمام اطراف عالم کے مسلمانوں کا اس میدان میں جمع ہونا بعینہٖ میدان قیامت میں جمع ہونے کے ساتھ پوری مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح قیامت کے دن حق سبحانہٗ تعالےٰ کے جلال و جبروت کا کامل ظہور ہوگا اور بحکم لمن الملك اليوم لله الواحد القهار۔ تمام مخلوقات صفات جلال کے تجلیات پر مغلوب و مقہور ہو جائیگی اور کسی کو بولنے تک کی مجال نہیں ہوگی۔ اسی طرح اس میدان میں بھی اس وحدۂ لاشریک معبود حقیقی کے صفات جلالیہ کا اظہار اور غایت عبودیت کا اقرار کیا جاتا ہے۔ اور جس طرح میدان قیامت میں اظہار شان جلال کے بعد تجلیات رحمت کا ظہور ہوگا اسی طرح اس میدان میں بھی اللہ تبارک و تعالےٰ کے کمال رحمت کا ظہور ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مختلف طبقات ناس جن میں بڑے بڑے حضرات اکابر اولیاء ابدال و اوتاد و اقطاب شامل ہوتے ہیں مجتمع ہو کر نہایت خلوص او غایت تضرع کے ساتھ بارگاہ ذوالجلال والاکرام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اس مجموعی توجہ کا اثر ارحم الراحمین کی رحمت عامہ کے نزول کا یقینی طور پر سبب قوی ہو جاتا ہے۔ اسی خیال پر بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ بڑے سے بڑے گناہ بھی اس موقف عظیم میں بندہ پر سے گرا دئے جاتے ہیں۔ مع ہذا جماعت مسلمین کی اس ہیئت اجتماعی سے مقدس اسلام کی شان و شوکت اور ہیبت و حشمت کا جو نقشہ دلوں پر جم جاتا ہے۔ اس کی نظیر دنیا بھر کے کسی مذہب میں نہیں پائی جا سکتی سعی بین الصفا والمروہ اور رمی الجمرات کی حکمت بھی اسی مذکورہ بالا سنن حسنہ کے

کے قائم رکھنے پر مبنی ہے۔ کیونکہ سعی بین الصفا والمروہ زوج خلیل اللہ علیہ السلام سے بحالت اضطرار ظہور میں آئی تھی اس لئے زائرین کو بھی استدعائے رحمت کے خیال پر اپنے تئیں اضطراری حالت میں لانا چاہیے جس میں بار بار آمدورفت کرنے سے اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اگر پہلی بار نزول رحمت نہیں ہوا تو دوسری دفعہ یا تیسری دفعہ علےٰ ہذا سات دفعہ سعی کرنے پر نزول رحمت ہوگا عمل رمی جمار چونکہ دفع شیطان کی غرض سے وقوع میں آیا تھا اس لئے زائرین کو اسی نیت سے بجا لانا پڑتا ہے۔ اس موقعہ پر ضروری ہے۔ کہ لایعنی خواطر و وساوس کو دل سے بالکل دور کر دیا جائے۔ مبادا کہ کسی ضعیف الاعتقاد کو یہ خیال دامنگیر ہو کہ اس عمل سے کیا فائدہ متصور ہے؟ چاہ زمزم کی مثال بعینہٖ حوض کوثر کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے جس سے قیامت کے دن اہل ایمان سیراب ہونگے ٭

الغرض زیارت بیت اللہ شریف میں کئی ایک مختلف قسم کی حکمتیں مضمر ہیں۔ بالخصوص شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس پاک زمین کا مشاہدہ جہاں آپ کی ولادت باسعادت ظہور میں آئی اور جہاں منصب نبوت پر ممتاز ہوئے اور جہاں مختلف قسم کے واقعات مخالف و موافق پیش آئے۔ ایک صحیح الایمان آدمی کے دل میں عہد قدیم کی یاد اور جوش عقیدت و محبت کو تازہ کرتا ہے۔ اور جب مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوتا ہے تو حسن عقیدت و جوش محبت کا ایک ایسا ولولہ دل میں اُٹھتا ہے جس کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس سعادت سے بہرہ یاب ہوئے ہیں۔ اللّٰھم صلّ علےٰ محمّدٍ وّ علےٰ اٰلِ محمّدٍ ٭

زائرین کو چاہیے کہ گھر سے نکلنے سے پہلے آدابِ سفر اور مناسک حج کے متعلق ضروری ہدایات سے آگاہ ہو لیں ٭

ضرورتِ اجتہاد

شریعتِ اسلام دو حصوں پر منقسم ہے عقائد اور احکام۔ عقائد سے صرف ایسے امور مراد ہیں جن کی تصدیق ہر ایک مسلمان کا فرض ہے اور احکام سے مراد وہ اوامر و نواہی ہیں جو عبادات و معاملات پر مشتمل ہیں۔ شریعت کا اصل ماخذ قرآن شریف ہے۔ احادیث اکثر آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر و تفصیل پر مشتمل ہیں اس لئے قرآن شریف اور احادیث کی نسبت علماء کا اتفاق ہے کہ بالتصریح یا بالاشارہ ہر ایک مسئلہ کا ماخذ یہ دونوں چیزیں ہیں۔ لیکن بالفرض اگر کوئی مسئلہ ایسا ہو جس کا پتہ قرآن و حدیث سے نہ لگ سکے تو اجماعِ اُمت کی طرف۔ رجوع کیا جاتا ہے۔ اجماعِ اُمت سے ایسے اہلِ علم کا اجماع مراد ہے جو علمِ کتاب و سنّت میں خاص امتیاز رکھتے ہوں۔ ایسے علماء کا کسی خاص مسئلہ کے متعلق متفقہ فیصلہ شرعاً تیسرے درجہ پر حجت سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ثابت شدہ امر ہے کہ اس طبقہ کے اصحاب کبھی کسی غلط امر پر متفق نہیں ہوتے۔ اور اگر کوئی مسئلہ کتاب و سنّت اور اجماعِ اُمت سے خارج رہ جائے تو اس کے متعلق مجتہدینِ شریعت کے فتویٰ پر عمل کیا جاتا ہے اس لئے قاعدہ یہ ہے کہ اگر کتاب اللہ کسی امر کا فیصلہ کرے تو احادیث کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت داعی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر قرآن مجید میں اسکی تصریح موجود نہ ہو تو احادیث نبویہ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اور اگر احادیث سے بھی جواب نہ مل سکے تو اجماعِ اُمت حجت ہے۔ اس لئے اجتہاد سب سے آخری ماخذ ہے علمائے اُمت نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ اسلامی شریعت کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جسکی تصریح مذکورہ بالا چاروں ماخذوں سے کسی ایک میں نہ آچکی ہو۔

اجتہاد کے لئے چند ایک شرائط ہیں جن کو کتب اُصول میں مفصل بیان کیا گیا ہے
اس لئے مجتہد ایسا شخص ہو سکتا ہے جو مفصلہ ذیل علوم میں مہارت تامہ رکھتا ہو :-
اوّل - آیاتِ قرآنیہ کو لغت اور اصطلاحات شرعی کے طریق پر بخوبی سمجھتا ہو
اور اُن کے موارد نزول سے پورے طور پر آگاہ ہو ؛
دوم - علم لغاتِ عربیہ یعنی الفاظِ مفردہ اور مرکبّہ کے خواص اور اشتقاق
اور محل استعمال سے بخوبی آگاہ ہو ؛
سوم علمِ صرف یعنی الفاظ مفردہ کے اوزان اور انکی مختلف صور تغیرہ سے
پورا واقف ہو ؛
چہارم - علمِ نحو یعنی الفاظ کی ترکیب اور مُعرب و مبنی وغیرہ احوال پر کامل اطلاع
رکھتا ہو ؛
پنجم علم معانی یا علمِ بلاغت - یہ وہ دقیق علم ہے جس سے کلام کے ان احوال
کا پتہ لگتا ہے جن سے کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو سکتا ہے ؛
ششم علم بیان - یہ وہ علم ہے جس سے ایک معنی کو کئی ایک مختلف طریق پر
ادا کیا جا سکتا ہے - ان مذکورہ بالا علوم کے علاوہ مجتہد کے لئے ضروری ہے کہ وہ
آیات کے مختلف قسم کے اقسام میں امتیاز کر سکتا ہو - جنکا اُصول فقہ میں پتہ دیا گیا
ہے - اور اس کے علاوہ آیاتِ قرآنیہ کے متعلق ناسخ و منسوخ کا پورا علم رکھتا ہو اور
احادیث نبویّہ کی مختلف اقسام میں امتیاز کرنے کی کامل استعداد رکھتا ہو جس کے لئے
علمِ اسماء الرجال یعنی راویان حدیث کی معرفت اور اُصول جرح و تعدیل کی پوری قابلیت
درکار ہے - اور سب سے بڑی ضرورت مجتہد کے لئے اس امر کی ہے کہ وہ وجوہ
قیاس میں کامل دستگاہ رکھتا ہو اور مسائل اجماعیہ کا ضبط مجتہد کے لئے ایک ضروری
شرط ہے تاکہ وہ اجماع کے برخلاف اجتہاد نہ کر سکے - جب تک مذکورہ بالا علوم میں

یگانہ وممتاز نہ ہو۔ کوئی شخص مسائل شرعیہ کا استنباط کتاب اور سنت سے نہیں

غیر مجتہد کیلئے تقلید ضروری ہے

چونکہ ہر ایک شخص کا اس درجہ کی قابلیت رکھنا کہ وہ پایۂ
کو پہنچ سکے ناممکن ہے۔ اس لئے بحکم آیۂ "فاسئلوا اہل
الذکر ان کنتم لا تعلمون" ضروری ہے کہ ان بزرگواران
اُمت کی جن کو اللہ تعالٰے نے یہ رُتبہ عطا فرمایا ہے اور جن کو ماہرین کتاب وسنت
نے بالاتفاق مجتہد تسلیم کیا ہے تقلید کی جائے۔ اس حد تک تقلید واجب ہے۔
یہ امر کہ ان بزرگواران میں سے کس کی تقلید کی جائے۔ سو اس امر میں صحیح مذہب
یہ ہے کہ کسی ایک مجتہد مطلق کی جو صاحب مذہب ہو تقلید کر لینا کافی ہے اور اس کا
فیصلہ ہر ایک شخص کی اپنی رائے پر موقوف ہے لیکن اس امر پر کوئی دلیل قطعی موجود
نہیں کہ فلاں مجتہد کی تقلید واجب ہے۔ البتہ کثرتِ وجوہ فضائل سے ہم افضلیت
کا حکم لگا سکتے ہیں۔ علمائے اُمت نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ مجتہدین صاحب مذہب
صرف چار گذرے ہیں۔ امام نعمان بن ثابت ابوحنیفہ کوفی۔ امام مالک ابن انس مدنی
امام محمد بن ادریس شافعی۔ اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہم اجمعین۔ ان چار
بزرگواران کے مقلدین اہل السنت والجماعت کہلاتے ہیں۔ اگرچہ ان چار بزرگوار
کے علاوہ بھی چند ایک بزرگواران کو پایۂ اجتہاد حاصل ہوا ہے۔ مگر وہ صاحب مذہب
نہیں کہلائے "ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم" ان
چار بزرگواروں کے زمانہ اجتہاد سے پہلے بھی قاعدہ تھا کہ حضرات صحابہ اور تابعین
رضی اللہ عنہم میں جو حضرات پایۂ اجتہاد رکھتے تھے عوام الناس ان میں سے کسی
ایک سے استفادہ اور استفاضہ کر کے عمل پیرا ہوتے۔ کیونکہ اس وقت تک ہوائے
نفس اور بدعات کی ہوا نہیں چلی تھی۔ اور دین کے معاملہ میں نہایت احتیاط اور
دیانتداری سے کام لیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ یہ بزرگوار

کچھ فرمائیں گے وہ کتاب اللہ اور سنّت کے برخلاف نہیں ہوگا۔
وہ زمانہ تھا کہ علم کتاب و سنّت سینوں میں محفوظ تھا۔ اور تصنیف
تالیف اور مسائل شرعیہ کے ابواب کی تدوین و ترتیب کی ضرورت
پیش نہیں آئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ اور تابعین رضی
اللہ عنہم کی جماعت میں باآنکہ بہت سے بزرگواروں کو پایۂ اجتہاد
حاصل تھا۔ مگر ان کے اجتہادات کے متعلق کوئی باضابطہ تصنیف و
تالیف موجود نہیں۔ مگر حکمتِ خداوندی کا اقتضا تھا کہ زمانہ نبوّت
جُوں جُوں بعید ہوتا چلا گیا اس خیال سے کہ مبادا ملحدین علم کتاب
و سنّت کو مسخ کر دیں۔ حضرات محدّثین اور مجتہدین کی جماعت میں
ایسے بابرکت نفوس اُٹھ کھڑے ہوئے جنہوں نے اپنی مساعی جمیلہ
سے احادیث کی تنقیح اور مسائل اجتہادیہ کی توضیح ایسے طور پر
کر دی کہ آج تک ان کی تحقیق و تدقیق میں سرمُو فرق نہیں آیا۔
اور ان کی علمی تحقیقات واسطہ در واسطہ حدِ تواتر تک پہنچ چکی
ہیں۔ آج اگر کوئی شخص کفرانِ نعمت کر کے ان کے بے نظیر علمی
کمالات کا انکار کرنے لگے تو اس کے انکار کی کیا وقعت ہو سکتی
ہے؟ مگر یہ سب کچھ ان بزرگواروں کی حسنِ نیّت اور اخلاص فی الدین
کا نتیجہ ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

اگرچہ بہ حکم عقل یہ امر ناممکن نہیں ہے کہ فیض ازلی کسی صاحب
توفیق کو ویسی ہی ہمّت عالی اور قابلیّت علمی اور اخلاص فی الدین
عطا فرماوے کہ وہ پایۂ اجتہاد حاصل کر سکے۔ مگر عادتاً دشوار
نظر آتا ہے۔ کیونکہ قربِ زمانۂ نبوّت اور جمہور اُمت کا متبع

کتاب و سنّت ہونا اور علوم متعلّقہ فن اجتہاد کی گرم بازاری
سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ اور ہر ایک صاحب رائے کا اپنی
رائے پر اترانا اور بدعات کا رواج اور اغراض نفسانی
کثرت اس حد تک ترقی کر گئی ہے کہ ایسے حالات میں ان اسباب
کا مہیا ہونا جو بزرگوارانِ سلف کو حاصل تھے متعذر بلکہ محال خیال
کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ اجتہاد کے بعد کے اکابر
علمائے اُمت میں سے ایک بھی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو
چاروں مجتہدین میں سے کسی ایک کا مقلد نہیں تھا۔ تقلید
کے متعلق یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ مجتہد کو کسی دوسرے مجتہد
کی تقلید کرنا صحیح نہیں۔ اس لئے غیر مجتہد کو عقلاً اور شرعاً
واجب ہے کہ وہ مجتہد صاحب مذہب کی تقلید کرے۔ عقلاً
تو اس لئے کہ عمل بالشریعۃ واجب ہے۔ مگر عمل کے لئے علم
کا حاصل کرنا بھی واجب ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ جو امر واجب
کسی دوسرے امر پر موقوف ہوتا ہے تو دوسرا امر بھی
واجب ہو جاتا ہے۔ اور شرعاً بحکم آیۂ مسطورہ بالا۔ خاکسار
مؤلف عامہ اہل اسلام سے استدعا کرتا ہے کہ عقائد اور احکام
دین کے متعلق ہمیشہ اس بات کو ملحوظ رکھا کریں کہ سلف صالحین
کے سوا موجودہ زمانہ کی مذہبی تحقیق کے مدعیان کی طرف ہرگز
متوجہ نہ ہوں۔ اور جب کبھی کسی دینی مسئلہ کے متعلق صحیح مذہب حاصل
کرنا ہو تو سلف صالحین کی روش کو لازم سمجھیں۔ کیونکہ خیر اسی
میں ہے۔ ؎

دُور است سرآب دریں بادیہ ہُشدار
تا غولِ بیاباں نفریبد بسراب

موجودہ زمانہ میں اس قسم کے بہت سے مدعیان علم دین پیدا ہو گئے ہیں جو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں آیاتِ قرآنیہ کا ترجمہ پڑھکر مفسّر بن بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ انہیں علوم مذکورہ بالا میں بجز ایک معمولی ربط کے کوئی معتدبہ علمی قابلیّت حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کی عملی حالت اتّقاد اخلاص پر مبنی ہوتی ہے۔ مگر کتاب و سُنّت کی علمبرداری کے دعوائے بے دلیل کے میدان میں وہ سب سے آگے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں اور سلف صالحین کے حق میں نکتہ چینی اور طعن و تشنیع ان کا مبلغ کمال ہے۔ لاحول ولا قوّۃ الّا باللہ ؎

باب نہم

عصبیّت مذہبی یا قومی

لفظ تعصّب اِن دِنوں بچّہ بچّہ کی زبان پر چڑھا ہُوا ہے۔

ف ناظرین یہ مضمون المنار مصری نے عروۃ الوثقیٰ سے نقل کیا ہے (باقی صفحہ آئندہ)

مغرب سے مشرق تک تعصّب کی صدا بلند ہے - جسے دیکھئے تعصّب تعصّب پکار رہا ہے - کوئی جلسہ ہو - انجمن ہو - دو چار کی صحبت ہو - جہاں کوئی شخصی - قومی - ملکی مسئلہ چھڑا اور لفظ تعصّب زبان سے نکلنے لگا - سیپچوں - تقریروں کا انجام و آغاز اکثر اسی لفظ پر ہوتا ہے - کہتے ہیں یہی ہر قسم کے مصائب و آلام کی جڑ ہے - یہی رنج و عنا - بلا و ابتلا کا منبع اور سرچشمہ ہے یہی قومی - ملکی - شخصی ترقّی کا سدِّ راہ ہے - غرضیکہ یہ مجموعہ رذائل ہے اور سب بُرائیوں کا نام ہے - جو لوگ کہ نیم مغربی بن چکے ہیں یا یورپین تہذیب پر فدا ہو چکے ہیں وہ سب سے زیادہ تعصّب کو بدنام کرتے ہیں - جس کو وہ اپنے خیال میں ذلیل تر سمجھتے ہیں - اور بُرے سے بُرا کہتے ہیں اور دشمن انسانیت گردانتے ہیں - کہتے ہیں - "متعصّب ہے متعصّب" ان کے نزدیک متعصّب کون ہے ؟ وہ شخص جو ان کے طور و طریق - مسالک و مشرب سے کسی قسم کی مخالفت رکھتا ہو - ایسے شخص کی بات تک سُننا ان کے نزدیک گناہ اور ناقابل کفّارہ گناہ ہے - اس شخص کی صورت تک وہ دیکھنے کے روادار نہیں - پھر اس سے جس قدر ناک بھوں چڑھائیں - منہ بنائیں اور باتوں باتوں میں اس کی تضحیک و تذلیل کریں سب کچھ روا ہے اور تھوڑا ہے - خدا جانے تعصّب کا مفہوم ان کے دل و دماغ میں

بقیہ صفحہ ۱۱۳ کا - جو عرصہ ہوا پیرس سے نکلتا اور مرحوم سید جمال الدین افغانی اور مرحوم محمد عبدہ مفتی مصر کے پُر زور قلموں کا نتیجہ ہوتا تھا - مضمون جس پایہ کا ہے وہ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں ۱۲ منہ

کیا سمایا ہوا ہے اور کیا معنی اس کے سمجھ رکھے ہیں کہ تعصب کو اتنا برا سمجھتے ہیں۔ مگر یہ سب حق و باطل میں تمیز نہ کرنے اور حقیقت کے نہ جاننے کا نتیجہ ہے۔ ورنہ کجا تعصب اور کجا یہ ہزیان؟ ؂

تعصب کیا ہے؟ واجبات عصبیت کے بجا لانے کا نام ہے۔ اور عصبیت کہتے ہیں کسی قوم کی قوت کو جس سے وہ قوم اپنے جائز قومی حقوق کی حفاظت کر سکتی ہے۔ اپنے تئیں بلا میں پڑتے دیکھ کر مدافعہ کو اُٹھ کھڑا ہوتی ہے۔ اِس لئے تعصب انسانیت ہے۔ ایسی وصف و قوت کی تحریک ہے جس سے آدمی اپنے بچوں کی حمایت کرتا ہے۔ اور ان کے حقوق کو پامالی سے بچاتا ہے اور انانیت اِس حکم نفس کے تابع ہے جو معارف و معلومات کا نتیجہ ہے ؂

تعصب ہی وہ وصف ہے جس سے قوم ایک شکل خاص میں متشکل ہوتی ہے۔ گویا کہ قومی ہار کی لڑی رشتہ تعصب ہی سے مرتبط و منتظم ہے۔ اور تعصب ہی قوم کا مزاج صحیح ہے۔ یہی بکھرے ہوئے افراد کو ایک نام کے تحت میں لاتا ہے۔ اور مجموعہ افراد سے شخص واحد بناتا ہے۔ جو اپنے طور و اطوار اخلاق و عادات سعادت و شقاوت میں دوسرے اشخاص سے ممتاز ہو۔ یہی تعصب کی پیدا کردہ وحدت قوموں اور قبائل میں مقابلہ کی روح پھونکتی ہے اور ہر ایک کو دوسرے سے برتری حاصل یا ثابت کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور جیسا کہ خود داری اور انانیت تشخصات میں تکمیل

و ترقی کا بہترین ذریعہ ہیں - اسی طرح قومیں بھی تنافس و باہمی انانیت کے ذریعہ سے بقدر طاقت خود تمام لوازمات حیات میں انتہائے درجہ کمال پر پہنچتی ہیں - غرض کہ تعصب ایک روح کل ہے اور ہیئت اجتماعیہ قوم اس کا بدن اور افراد قوم کی تمام روحیں اس روح کل کے حواس ہیں - جب ان حواس میں سے کسی حاسہ کو کسی اجنبی اور غیر کے ہاتھوں امر نا ملائم سے رنج و الم کا احساس ہوتا ہے روح کلی اس سے منفعل ہوتی ہے اور طبیعت کا یہ مدافعہ کے لئے جوش میں آتی ہے - اسی سے تعصب عام حمیت اور جبلی غیرت کو ابھارتا ہے اور یہی حمیت اور غیرت افراد قوم کو خیانت اور افعال قبیح کے ارتکاب سے جن سے قوم کو نقصان پہنچے اور برا انجام پیش آئے روکتی اور ان کی طبیعتوں کو بلند کرتی ہے - اور جس قدر کہ افرادِ قوم میں اس قسم کا تعصب و اتحاد زیادہ ہوتا ہے اسی قدر قوم میں استقامت طبع اور رسوخِ فضیلت کا مرتبہ زیادہ اونچا ہوتا ہے اور قوم کا ہر فرد بدن صحیح کا عضو سلیم بن جاتا ہے اور جو کام اس کا ہوتا ہے اسے اچھی طرح ادا کرتا ہے جیسے کہ بدن میں سربلند ہو کر اپنے آپ کو پاؤں سے مستغنی اور برتر خیال نہیں کرتا اور پاؤں باوجود زمین پر رگڑتے رہنے کے اپنے آپ کو ذلیل و خوار خیال نہیں کرتے بلکہ حفظِ بدن کے لئے خوشی خوشی اپنے اپنے فرائض ادا کرتے ہیں اور ترفع و تذلل کے خطرۂ بد کو پاس تک نہیں آنے دیتے +

جب ضعف تعصّب کے باعث قوم کی قوّتِ ربط کمزور پڑ جاتی ہے تو اس کے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ رگ و پے بھی بیکار ہو جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ قومی جسم گھُلنے اور گلنے لگتا ہے۔ جیسے کہ اعصاب اور رگ و پے کے سست ہوتے ہوتے ایک دن شخصی بدن فنا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قومی رُوح بھی تحلیل ہوتی جاتی ہے۔ اور آخر کار رُوح کلی فنا ہو جاتی ہے اور قوم کی ہیئتِ اجتماعیہ اعضائے بدن کی طرح ناپید ہو جاتی ہے۔ اگر اس کے کچھ اجزار باقی رہے تو وہ اجزار میت کی طرح پراگندہ رہتے ہیں اور عام قاعدہ کائنات کے بموجب کسی اور بدن (قوم) کا جز بن جاتے ہیں یا موت ہی کے قبضہ میں پڑے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ دوبارہ زندگی میں دوسری روح اُن میں ڈالی جاتی ہے۔ (سنۃ اللہ التی قد خلت من قبل)

جب کسی قوم میں عصبیت کمزور ہو جاتی ہے تو اللہ تعالےٰ اسے سست اور نکمّی کر دیتا ہے اور افرادِ قوم رُوح کُلّی کے بیکار ہو جانے کی وجہ سے ایک دوسرے کے حال سے غافل ہو جاتے ہیں اور یہ غفلت رفتہ رفتہ سابقہ روابط و تعلّقات کو کاٹتی رہتی ہے اور لوگ ایک دوسرے سے مُنہ پھیرتے اور الگ ہوتے جاتے ہیں۔ اس وقت غیروں کو مداخلت کا موقع ملتا ہے اور جب تک کہ دوبارہ خدائے تعالےٰ قوم کو قوم نہ بنانا چاہے کوئی اس قوم کی بگڑی کو بنانے والا کھڑا نہیں ہوتا۔

ہاں جیسے اور تمام فضائل نفسانی کا وسط درجۂ اعتدال اور اس کے دو اطراف افراط و تفریط ہوتے ہیں ویسے ہی تعصّب کے بھی یہ تینوں درجے ہیں۔ (اعتدال و تفریط کی) کی حالت میں تعصّب اور اس کے نتائج کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ ہم بیان کر چکے۔ تفریط کی طرح افراط کا درجہ بھی مذموم ہے۔ جو ظلم و جور پر قوم کو آمادہ کرتا ہے تعصّب

میں افراط کرنے والا انانیت سے مدافعت کرتا ہے لیکن جا بیجا اور بیجا بھی اور وہ اپنی ہی عصبیت کو اعزاز و کرامت کا مستحق سمجھتا ہے اور غیر کو نہایت ذلت اور غیریت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کا کوئی حق نہیں سمجھتا اور نہ اس کے عہد و پیمان کا خیال رکھتا ہے اور یوں جادۂ حد اعتدال سے خارج ہو جاتا ہے اور تعصب کا نفع نقصان سے بدل جاتا ہے اور قوم کی آبرو جاتی رہتی ہے بلکہ مجد و شرف کی جڑ کٹ جاتی ہے کیونکہ عدل ہی ہیئت اجتماعیہ کا اصلِ عظیم ہے اور وہی قومی زندگی کا مدار ہے اور جو قوت کہ عدل کی مطیع و منقاد ہو کر نہیں رہتی اسے زوال کا روزِ سیاہ دیکھنا پڑتا ہے یہی افراط تعصب کی حد ہے اور ہر عاقل کے نزدیک ناپسندیدہ و نامحمود ہے ؎

تعصب کا اطلاق جیسے حمیت قومی پر ہوتا ہے جو نسبی ارتباط اور ایک جگہ رہنے سے پیدا ہوتی ہے اسی طرح صلۂ دین و اتحاد مذہب سے لوگوں میں ایک روح سی پیدا ہو جاتی ہے اور ابنائے ملت کی نصرت اور حمایت پر آمادہ کرتی ہے ۔ اسے بھی تعصب ہی کہتے ہیں ۔ مقلدین فرنگ بھی تعصب کو ہلاکت و تباہی کا باعث اور خرابیوں کا سرچشمہ کہتے ہیں اور ایک آنکھ اسے دیکھ نہیں سکتے ۔ لیکن ان کی یہ نفرت و کراہت کوئی عاقلانہ فعل نہیں ۔ کیونکہ وہ اتحاد اور انانیت جس سے بکھرے ہوئے جڑ جائیں اور وحدتِ حاصلہ ان کو دفع نقصان و کسب کمال کی راہ پر لا ڈالے کسی طرح کیوں نہ قائم ہو مختلف اللسان نہیں ہو سکتی ۔ دین سے قائم ہو یا نسب سے ۔ یہ دونوں ربط و تعلق اقوام مختلفہ میں رہے اور رہیں ۔ اور ان میں سے ہر ایک کے عالم میں ایسے مہتم بالشان واقعات و آثار ظہور میں آئے جو انسانی دنیا کے لئے باعثِ ناز و افتخار ہیں اور جیسے ایک رشتہ دار بحالت تعصب دوسرے رشتہ دار کی مدد کرتا ہے اور ضرورت کے وقت اس کی طرف سے مدافعت پر آمادہ ہوتا ہے ویسے ہی ایک دیندار بھی اپنے ہم مذہب دیندار کی نصرت و اعانت کرتا ہے اور از روئے عقل ان دونوں کی مدافعت و معاونت میں کوئی فرق نہیں

ہے۔ اس لئے مذہبی تعصّب بھی جو اُصول عقائد نفسانی کے اتفاق و اتحاد سے پیدا ہوتا ہے جب تک کہ اعتدال پر رہے اور اہل مذہب کو غیروں کی ہتک حرمت نقض عہد اور جور و ستم پر آمادہ نہ کرے۔ تعصّب نسبی کی طرح محمود ہے اور فضائل انسانی میں سے بہت بڑی فضیلت ہے اور قومی تعصّب سے زیادہ نفع رساں ہی نہیں بلکہ زیادہ مقدس اور برتر ہے اور تمام روابط و تعلّقات سے ارفع و اعلےٰ ہے۔ جس وقت کہ مذہبی تعصّب مستحکم ہوگا اہل مذہب کو اوجِ سیادت اور ذروہ مجد و شرافت تک پہنچائیگا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ تمام قواء پر دینی قوت غالب ہو اور قومی خواہشوں پر غالب آجائے۔ یہانتک کہ قومی خیالات کو قریبًا مٹادے جیسے کہ مذہب اسلام میں عصبیت مذہبی عصبیت نسبی پر غالب آئی اور قوم کو نسیًا منسیًا کر دیا۔

ہم نے مذہبی عصبیت کو ابھی اس لئے مقدس ترین رابطہ اتحاد قرار دیا ہے کہ وہ جیسے اشخاص و افراد پراگندہ کے اختلاف کو مٹا کر انکے عزم و مقاصد افعال و اعمال کو متحد کرتا ہے۔ اسی طرح وہ ایک قوم کے متعدد قبائل بلکہ اقوام مختلفہ کی منافرت و مفاخرت باہمی کو بھی مٹا دیتا ہے۔ اگرچہ ان کا وطن ان کی زبان انکی عادت کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو اور صورت و شکل میں تباین کیوں نہ ہو اور ان سب کے مختلف خیالات و ارادات کو ایک نقطہ پر جمع کر دیتا ہے اور یہی مجد و شرافت و ترقی و تمدّن اور یادگار کی دیرپا زندگی کی اصل بنیاد ہے یہی بڑا کام مذہبی عصبیت کے سپرد کیا گیا ہے۔ اور تاریخ شاہد حال ہے کہ اس نے اپنا کام پورا کیا اور عقل بھی مانتی ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہئے اور ہوا ہے۔ یہ امر عظیم الشان رابطہ قومی سے نہ آجتک ہوا اور نہ ہوسکتا ہے۔ مگر ان دنوں لوگ ہیں کہ مذہبی تعصّب کی بُرائی پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اور اس غلط خیال میں پڑے ہوئے ہیں کہ حمیت دینیہ جو برادران دینی کی اعانت اور ابتلا میں واصد نجات دہندہ ہے اہل دین کو کمال تمدّن

کی طرف بڑھنے اور نورِ علم و معرفت کے حاصل کرنے سے روکتی ہے اور ان کو جہالت کے اندھیرے کنوئیں میں دھکیلتی ہے۔ اور انہیں غیر مذہب والوں پر ظلم و ستم کرنے پر برانگیختہ کرتی ہے۔ ان لوگوں کی رائے میں استیصال مفاسد اور تکمیل مصالح کی کوئی تدبیر ہے تو صرف یہی کہ عصبیت مذہبی کا نام و نشان نہ رہے اور نفوس بشریہ عقائد کی حکومت سے باہر نکل جائیں اور سب سے زیادہ اس تعصب کے ساتھ مسلمانوں کو بدنام کیا جاتا ہے اور تمام من گھڑت نظام تعصب ان کے سر تھوپے جاتے ہیں۔ لیکن جھوٹے ہیں یہ یاوہ گو اور نادان ہیں نہیں جانتے کہ مذہب ہی نفوس انسانی کا پہلا اور کامل تر معلم ہے جو کسبِ علوم اور توسیع معارف کی ہدایت کرتا ہے۔ اور رحم مجسم ادیب ہے۔ اور دانا ترین مودب ہے۔ جو انسانی ارواح کو آداب حسنہ اور اخلاق شریفہ کے زیور سے آراستہ کرتا ہے اور نفوس کو جادۂ عدل و اعتدال پر قائم کرتا ہے اور شفقت و احساس کے رحم کو ابھارتا ہے۔ حضور مثلاً اسلام جس نے عرب کی خشونت پسند قسی القلب اور وحشی قوم کو پستی سے اٹھا کر معراج کمال پر پہنچایا اور تھوڑی سی مدت میں حکمت و تمدن کے زینہ پر دور تک چڑھا دیا۔ ہاں جیسے عصبیت قومی کو افراط لاحق ہوتی ہے بعض اوقات مذہبی عصبیت بھی افراط کو پہنچ جاتی ہے اور ظلم و جور کا باعث بلکہ بعض اوقات ایک مذہب والوں کو دوسرے مذہب والوں کے مٹانے اور ناپید کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ جیسا کہ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں مغرب نے مشرق پر محض خونریزی اور مخالفین کے مٹانے اور فنا کرنے کے لئے چڑھائی کی نہ کہ فتوحات اور دعوت مذہب کے لئے اور جیسے سپین والوں نے اندلس کے مسلمانوں کے ساتھ کیا اور جیسے ان دونوں واقعات سے پہلے عیسائیوں نے اپنی بڑھتی ہوئی شوکت کے زمانہ میں یہود کو بیت المقدس میں جمع کرکے جلا دیا تھا۔ لیکن مذہبی عصبیت کی یہ افراط چونکہ اصول

مذہب کے خلاف ہے اس لئے زیادہ طول نہیں کھینچتی اور جلدی ہی اہلِ دین ایسے اصول کی طرف رجوع ہوجاتے ہیں جو امن و رحم و عدل کے فوائد پر مبنی ہیں مسلمانوں میں بھی بعض گروہ گذشتہ زمانہ میں مذہبی تعصب میں افراط پر پہنچ گئے تھے لیکن اس درجہ تک ان کا تعصب کبھی بھی نہیں پہنچا کہ اُنھوں نے اپنے خلاف مذہب والوں کو بالکل ہلاک کردیا ہو اور زمین کو اُن سے خالی کرنے کے دواعی مدِنظر ہوں۔ چنانچہ اسلامی تاریخ میں ایسے واقعات کا کہیں پتہ نشان تک نہیں ہے خصوصاً اس وقت کے بعد سے جبکہ مسلمانوں نے جزیرہ نمائے عرب سے باہر نکل کر حکمرانی شروع کی۔ ہمارے اس دعوی کی دلیل اس سے بڑھکر اور کیا ہوسکتی ہے۔ کہ اسلامی ممالک میں اب تک مختلف مذاہب کے لوگ موجود ہیں اور اس زمانہ سے آجتک اپنے اخلاق و عقائد پر کاربند چلے آتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی طاقت کا وہ عنفوان تھا اور غیر مذہبوں کی طاقتیں نڈھال ہورہی تھیں۔ ہاں مسلمان توسیع فتوحات کے شیفتہ تھے اور مقابل کے ساتھ بشدّت و سختی پیش آتے تھے لیکن باوجود اس کے مذاہب کی عزت و حرمت کرتے تھے۔ اور غیروں سے جو عہد پیمان کرتے تھے اس سے کبھی نہ پھرتے تھے اور جو غیر مذہب والے انکے مطیع و منقاد ہوجاتے تھے انکے حقوق کو پہچانتے اور انکی رعایت کرتے تھے۔ اور کسی حال میں اُن پر ظلم و ستم نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہانتک کہ اُن کا عقیدہ تھا کہ جو ہمارے ذمہ اور اطاعت میں آگیا جو فائدہ ہمارا ہے اس کا فائدہ ہے اور جو نقصان اسکا ہے وہ ہمارا نقصان ہے۔ غیروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں کبھی وہ عدل کو ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ واقعات شاذہ و نادرہ امرِ خلاف کو ثابت نہیں کرسکتے۔ اسلئے کہ انسانی طبیعتیں کمزور ہیں۔ کسی وقت بتقاضائے بشریت زیادتی بھی ہوجاتی ہے چنانچہ تاریخ شاہد حال ہے کہ ابتدائے اسلام سے آجتک مسلمانوں نے اہلبیت

واستحقاق کے ہوتے ہوئے غیر مذہب والوں کے لئے بربنائے اختلاف مذہبی انکے تقدم و ترقی میں عوائق پیدا نہیں کیئے بلکہ دل کھول کر ان کو اعلیٰ مناصب ومراتب پر مقرر کیا۔ اسلامی طاقت کا شباب تھا اور غیر مذہب والے اعلےٰ سے اعلےٰ عہدے پاتے تھے۔ اور اب بھی یہی حال ہے۔ مغربی سلطنتیں باوجود علم و تمدن کے بڑھ جانے اور ہزارہا سال زمانہ کے آگے نکل جانے کے بھی ابھی اس درجہ کے عدل وانصاف پر نہیں پہنچ سکیں۔ بُرا ہو اُن لوگوں کا جو یہ کہتے اور سمجھتے ہیں کہ مسلمان مذہبی تعصّب کی بنا پر اپنے سے غیر مذہب والوں کو ان کے واجب حقوق سے محروم رکھتے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی طاقت وجبروت کے زمانہ میں بھی کبھی غیروں کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا۔ الّا ماشاء اللہ۔ حالانکہ اس وقت ان کی عظمت کا سکّہ بیٹھا ہوا تھا اور ان کی فتوحات کا چار دانگ عالم میں غلغلہ پڑا ہوا تھا اور انکی طبیعتیں توسیع فتوحات پر مبذول تھیں اور نئی نئی فتحیں حاصل کرتے تھے ہاں اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ اگر کوئی قبول کرتا تو کرتا نہیں تو بجائے اس کے ایک قاعدہ کے مطابق اس پر مالیہ لگا دیتے جو دوسری سلطنتوں کے خراج کا قائم مقام ہوتا تھا۔ اس مالیہ کی شرطیں بھی ایسی ہی معتدل ہوتی تھیں کہ کسی پر گراں نہ ہوں۔ (ان شروط کے ذکر کا موقع نہیں کتب نقہ سے دیکھنی چاہئیں) برخلاف اس کے رومی اور یونانی اپنی شوکت کے زمانہ میں جس زمین پر قدم رکھتے وہاں کے باشندوں کو اپنا سابقہ مذہب چھوڑنے اور عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ چنانچہ مصر وشام میں ہی نہیں بلکہ تمام فرنگستان میں بھی اُنہوں نے اپنا یہی قاعدہ برتا ؂

سیاق کلام ہم کو اصل بحث سے دُور کھینچ لایا ہے اب ہم پھر تعصب کے متعلق بحث شروع کرتے ہیں؟ کوئی عقلمند جو عقل سلیم رکھتا ہے معتدل مذہبی تعصب کو بُرا نہیں کہہ سکتا اور نہ قومی اور مذہبی تعصب میں کچھ فرق بتا سکتا ہے۔ اگر کچھ امتیاز

کر سکتا ہے وہی ہے کہ مذہبی تعصب زیادہ مقدس اور پاک اور زیادہ نفع رساں و فائدہ مند ہے۔ جو شخص اس کے خلاف کہے ہمارے نزدیک وہ ہرگز عقلمند کہلانے کا مستحق نہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کہیں اور کونسے اصول و دلیل کی بنا پر لوگ قومی تعصب پر تو فخر و مباہات کرتے ہیں اور مذہبی تعصب کو برا کہتے ہیں اور رذیلت خیال کرتے ہیں۔ ذرا بتائیں کہ ان کا یہ قول تمدن و عمران کے قاعدوں میں سے کونسے قاعدہ کی بنا پر صحیح ہے؟ اصل میں مذہبی تعصب کے بدنام ہونے کی علت یہ ہے کہ یورپین اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں بڑا امر یہی تعلق مذہبی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اسلامی عصبیت اعتقاد سے پیدا اور قائم ہوتی ہے اور ان کے دندان آز اسلامی ممالک پر دراز تھے اور اب بھی ہیں اسی لیے انہوں نے مسلمانوں میں تعصب کی برائی کرنا شروع کر دی اور اس رابطۂ مقدس کے ترک کر دینے کو بہترین فضیلت کی صورت میں دکھاتے ہیں تاکہ اس تدبیر سے اسلام کی عالیشان عمارت کی نیو کو کمزور کر کے ایک دن اسے بالکل گرا دیں اور مسلمانوں کی جماعتوں کو الگ الگ کر دیں اسلیے وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں قومیت و عصبیت سوائے دین و اعتقاد کے اور کچھ نہیں۔ اس کوشش میں یورپین قوموں نے بعض ممالک اسلامی میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کر لی اور برابر کوششیں ہو رہی ہیں طرح طرح سے مذہبی عصبیت کی برائی کے خیال مسلمانوں کے دلوں میں بٹھائے جاتے ہیں حتیٰ کہ بہت سے نادان مسلمان خود بھی اپنی جہالت و نادانی سے مذہبی تعصب کو برا سمجھکر اسکے برخلاف اپنی آواز بلند کرتے ہیں اور مسلمانوں کو عصبیت دینیہ سے متنفر و بیزار بنا کر بدخواہوں کی غرض کو پورا کر رہے ہیں۔ حالانکہ عصبیت دینیہ پہلے ہی سے انمیں ضعیف ہو چکی تھی۔ یہ لوگ رہی سہی کو بھی مٹانا چاہتے ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ اسکی جگہ رسم ارتباط بھی جس کی مدح و ستائش میں ہر وقت وہ رطب اللسان رہتے ہیں حمق و سفاہت کی وجہ سے آجتک

پیدا نہیں کی۔ ان لوگوں کی مثال اسی طرح ہے جیسے کوئی قبل اسکے کہ اپنے رہنے سہنے کے لئے جگہ تجویز کرے اپنا گھر منہدم کرے اور پھر ناچار کھلے میدانوں میں پڑکر حوادث سماویہ کا ہدف بنے اور عرضہ ہلاکت ہو ۔

یہ تعصب بھی مغربی لیاقت کا ایک ہتھکنڈا ہے جیسے دول یورپ نے بعد تجربہ چلتا ہوا ہتھیار دیکھ کر اس سے کام لینا شروع کیا ہے اور اب تک اس سے بہت فائدہ اٹھا چکی ہیں۔ مصر و ٹرکی میں بھی اسکی سیاحت کا جال بچھا ہوا ہے۔ علوم جدیدہ اور تمدن مغربی کے دلدادہ امرائے اسلام تو بہت سے اسکا شکار ہو چکے ہیں۔ جو لوگ کہ اسلام کو چھوڑ کر زندیق ودہریئے بن چکے ہیں اور صرف صورت و نام کے مسلمان ہیں وہ تو اگر مذہبی تعصب کے متعلق ایسے خیالات فاسدہ رکھتے یا ان کا اظہار کرتے ہوں تو مرہٖ تعجب نہیں لیکن تعجب ہے ان مسلمانوں پر جو اسلامی ایمانی عقائد پر قائم ہیں لیکن مذہبی تعصب کو برا کہتے ہیں۔ اور متعصبوں کو وسائل تمدن سے کام لینے کے ناقابل سمجھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ خود ان باتوں سے جامعیت اسلام کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور اپنی حالت اپنے ہاتھوں بگاڑ رہے ہیں اور مذہبی معتدل تعصب کو معدوم کرکے ملت و قوم کو معدوم کرنا چاہتے ہیں۔ جس کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمان غیروں کے ہاتھ جا پڑیں اور ابدالآباد تک انکی غلامی میں بسر کردیں یا فنا ہو جائیں اور ان لوگوں سے بھی زیادہ تعجب اہل مغرب پر ہے جو اس قسم کے افکار و خیالات پھیلانے میں انتہائی کوشش کرتے ہیں اور مذہبی تعصب کی مذمت اور متعصبوں کو برا کہتے ہوئے نہیں شرماتے جبکہ خود اس قسم کے تعصب میں سب سے پیش پیش ہیں اور سب سے زیادہ دوامی تعصب پر جمے رہنے والے ہیں چنانچہ ان کے سیاسی قواعد میں سے ایک قانون عملی داعیان دین (پادری) کی مساعدت اور مدافعت ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان کے مقابلہ میں کوئی ادنیٰ سی بات

بھی ہو جائے جس سے اجتماع بشری کو کسی طرح چارہ نہیں۔ اگرچہ وہ بات دنیا کے کسی کنارہ پر کیوں نہ ہو تمام مغرب میں کہرام مچ جاتا ہے اور ہر طرف سے دُہائی شروع ہو جاتی ہے کہ لٹ گئے مارے گئے۔ عیسائی دنیا پر مصیبت کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ اتفاق کرو اور آمادۂ تدارک ہو جاؤ۔ اور ایسا انتظام کرو کہ آئندہ ایسا واقعہ پیش نہ آئے تاکہ مذہبی جمعیت کو صدمہ نہ پہنچے۔ اگرچہ دول مغرب قومیت میں مختلف ہیں۔ اور ایک دوسری کی دشمن۔ ایک کی سیاست دوسری کے خلاف ہے اور ایک دوسری کو نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ مگر جہاں کوئی ایسا قومی واقعہ پیش آیا کہ کسی غیر کے ہاتھوں کسی ایک عیسائی سلطنت کو صدمہ پہنچنے کا احتمال ہوا سب متحد ہو جاتی ہیں بلکہ جان تک لڑا دیتی ہیں۔ اگرچہ قضیہ دنیا کے کسی بعید تر حصہ میں کیوں نہ پیش آئے اور قومی وجنسی تعلقات ہی کیوں نہ منقطع ہو جائیں۔ برخلاف اسکے روئے زمین پر فتنہ وفساد کا طوفان آ جائے اور غیر مذہب والوں کے خون میں تمام زمین ڈوب جائے۔ ان کی ہمدردی کی رگ حرکت میں نہیں آتی بلکہ اس کی طرف سے تغافل عیسائی دنیا کا شیوہ ہوتا ہے۔ یہانتک کہ اگر دردناک واقعات انتہا تک پہنچ جائیں تو انکی بلا سے۔ اس وقت یہ لوگ شفقت فطری ورحم طبعی کے جذبات کو ایسا داب داب کر بیٹھتے ہیں۔ گویا غیر مذہب والے انکے نزدیک حیوان سے بدتر اور ناقابل ہمدردی ہیں۔ اور ہرگز اس انسانی نوع میں سے نہیں جنکو یہ مغربی حمایت و نصرت کے لائق سمجھتے ہوں۔ یہ باتیں کچھ یورپ کے مذہبی فرقہ ہی سے مختص نہیں بلکہ دہریئے جو نہ اللہ کو مانتے ہیں اور نہ کتاب ورسول کو وہ زیادہ اِن سے بھی اس معاملہ میں آگے رہتے ہیں اور ان کا دینی تعصب سب سے بڑھا ہوا ہے ہر وقت مذہبی عصبیت کی تقویت میں کوشش کرتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ اہل مغرب میں جو زیادہ آزاد منش اور مسلم ہمدرد بنی نوع انسان ہوگا وہی مجسم مذہبی

تعصب اور غالی فی الافراط ہوگا اور اس کی بات بات سے رہبانیت ٹپکتی ہوگی اور اس کی رُوح پطرس کی رُوح ہوگی۔ مسٹر گلیڈسٹون کے لیکچروں کو پڑھو اور ان سے سبق لو۔ اگر مغربی مذہبی تعصب اعتدال سے تجاوز نہ کرتا تو ہمیں ہرگز کچھ تعرض نہ ہوتا۔ غضب تو یہی ہے کہ خود مغرب کا مذہبی تعصب تو افراط کی حد سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے اور مشرق کو تعلیم دیتا ہے کہ مذہبی تعصب چھوڑ دو حتّیٰ کہ معتدل کا نام بھی نہ لو اور مذہبی تعصب "کیا معتدل اور کیا غیر معتدل" سگ گزیدہ اشتی اور قابلِ نفرت ہے۔ بغیر اسکے مشرق ترقی نہیں کرسکتا ؎

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

اے اُمتِ مرحوم! دینی عصبیت ہی تیری زندگی ہے۔ اسکی حفاظت کر۔ یہی تیرا خون ہے اپنے ہاتھوں سے نہ بہا۔ یہی تیری روحِ رواں ہے اس کو ہاتھ سے نہ کھو۔ یہی تیری سعادت ہے۔ موت سے ادنیٰ قیمت پر تو اسے ہرگز نہ بیچ۔ تعصب ہی تیرا رابطہ ہے دھوکا میں نہ آ۔ جھوٹی اور بے سرو پا باتوں سے نہ ڈر۔ اپنے فہم سے وہم کا پردہ اٹھا دے اور دینی ربط کے حبل متین کو ہاتھوں بلکہ دانتوں سے مضبوط پکڑ لے۔ اِسی رابطہ نے تو ترکی کو عربی سے عجمی کو ہندی سے مصری کو مغربی سے ملا رکھا ہے۔ یہی رابطہ تو نسبی رابطہ کا قائم مقام ہے اسی کی بدولت تو ایک کی مصیبت کا دوسرے کو احساس ہوتا ہے۔ اگرچہ دونوں میں بُعد المشرقین کیوں نہ ہو۔ یہی تعلق تو صلۂ رحم سے بھی بڑھکر ہے۔ اسی میں ہی تیری عزت ہے اور اسی میں تیری سیادت۔ اس کو سُست نہ کر۔ ہاں عدل و اعتدال سے بھی قدم ہرگز آگے نہ بڑھا۔ تمدن ہی مدارِ نظامِ عالم ہے اور اسی سے ہیئت اجتماعیہ قائم رہتی ہے۔ وہ قوم کبھی بھی کامیاب نہ ہوگی جو عدل کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ مسلمانو! اللہ سے ڈرو اور اس کے اوامر بجالاؤ

عہد و پیمان پورے کرو اور لوگوں کے حقوق کو پہچانو۔ سب سے اچھا معاملہ رکھو۔ جو منافع و مضار تمہارے اور تمہارے ابنائے وطن کے مشترک ہیں اگرچہ وکسی اَور ملت کے پابند کیوں نہ ہوں ان میں ان کا ساتھ دو۔ کیونکہ تمہاری مصلحتیں ان کی مصلحتوں سے اور ان کی مصلحتیں تمہاری مصلحتوں سے وابستہ ہیں اور ضرور اپنی مذہبی عصبیت کو ظلم و تعدی کا وسیلہ نہ بناؤ۔ اور غیروں کے حقوق پامال نہ کرو۔ تمہارا دین تم کو ان باتوں سے منع کرتا ہے اور سخت عذاب کی خبر دیتا ہے۔ اور تم اپنی عصبیت کو نہ صرف اتنے پر منحصر اور موقوف کر لو کہ چند آدمی اس کی طرف مائل ہو جائیں بلکہ سب مل کر ایک ہو اور پھر قوت و شوکت جمیت و غیرت میں دوسری قوموں کا مقابلہ کرو اور سبقت کے لئے دوڑو۔ اور اپنی تمام قوت صرف کرو۔ اللہ تمہاری قوت بڑھائیگا اور تم کو ذلیل ہونے کے بعد معزز کرے گا۔ علوم نافعہ اور فضائل و کمالات انسانیہ کے حاصل کرنے میں جان توڑ کوشش کرو اور مقابلہ کے اکھاڑہ میں اتر پڑو اور اپنی عصبیت کو اتفاق و اتحاد کا وسیلہ بناؤ اور اپنے دینی بھائیوں کا ہاتھ پکڑ کر پستی سے اٹھاؤ۔ اسکے ساتھ خود تمہارا رتبہ بلند ہوگا۔ بھلائی اور نیکی پر سب مل جاؤ اور باہم مدد کرو۔ اور گناہ اور ظلم پر ہرگز تلوار نہ اٹھاؤ اور نہ امداد و اعانت کا نام لو بلکہ ایسے ارادہ والوں کو بدی کے ارتکاب سے روکو۔ یہی ان کی مدد ہے اور یہی تمہارا فرضِ عین ہے ؎

قانونِ شریعت اور رسم و رواج

اگر کوئی عامی مسلمان زبان سے یہ کہے کہ میں شریعت کا نہیں بلکہ رسم و رواج کا پابند ہوں تو ہمارے علما اس کے ایسا کہنے پر کفر و الحاد اور زندقہ اور ارتداد کا

فتوی لگاتے ہیں۔ لیکن علی طور پر ہر فرقہ اور طبقہ کے مسلمان قانونِ شریعت کو رسم و رواج پر قربان کرتے ہیں۔ اور کسی کو اس امر کا احساس نہیں ہوتا جو حرام چیز رسم و رواج کے طور پر ناجائز سمجھی گئی ہے اس کو تو مسلمانوں نے کفر و اسلام کے مابین حد فاصل قرار دے رکھا ہے۔ حالانکہ ویسی ہی کئی اور چیزیں شرعاً ممنوع اور حرام ہوتی ہیں اور لوگ علانیہ اس کا استعمال کرتے ہیں۔ مگر ان سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ لحم الخنزیر حرام ہے شرعاً مگر رسم و رواج کے رو سے اس کے استعمال سے اس حد تک احتراز کیا جاتا ہے بلکہ مسلمان یہودیوں کی طرح سؤر کا نام لینے سے بھی جھیپتے ہیں۔ شراب بھی حرام ہے جو رواجاً معیوب نہیں۔ بعض مسلمان اسکوشیر مادر کی طرح حلال سمجھکر پیتے ہیں۔ کیا کبھی کسی نے ایسا کرنے والوں کی سوسائٹی سے اجتناب کیا ہے ؟

قوانین شریعت سے اعراض اور رسم و رواج کی پابندی مسلمانوں کے دلوں میں یہاں تک سمائی ہوئی ہے کہ جہاں اڑہائی روپیہ سینکڑہ زکواۃ دینا نہایت مشکل معلوم دیتا ہے اور اس سے بچنے کے واسطے سینکڑوں حیلے حوالے تراشے جاتے ہیں وہاں شادی و مرگ کی تقریبوں پر ناک کٹنے کے خوف سے ہزاروں روپیہ قرض لیکر خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ غور کرو۔ زکواۃ دینا خدا کا حکم ہے۔ اور اگر اس حکم کی کما حقہ تعمیل کی جائے تو مسلمانوں کے پاس ایک کثیر رقم جمع ہو جائے جو قومی فنڈ کا کام دے سکے بلکہ یہی ایک قومی فنڈ مسلمانوں کے تمام نہیں تو اکثر قومی کاموں کا کفیل بن سکتا ہے۔ شادی و مرگ پر جو روپیہ خرچ کیا جاتا ہے وہ محض رسم و رواج کی پابندی ہے۔ اور جن رسوم پر یہ روپیہ خرچ کرتے ہیں ان سب کی بنا توہمات پر ہوتی ہے۔ ان میں بعض بدعت پر مبنی ہوتے ہیں اور بعض تو شرک و کفر

تک منجر ہوتے ہیں۔ ان رسوم کی پابندی میں مسلمان روپیہ خرچ کرنے والے خاندان کی بربادی تک کی پروا نہیں کرتے۔ اور نہ انہیں اس بات کا خیال ہوتا ہے۔ کہ آیا ایسی باتوں کی پابندی میں ہمارا ایمان و اسلام قائم رہتا ہے یا نہیں۔ گویا خدا کے حکم کو رسم و رواج کی پابندی پر قربان کیا جاتا ہے وَمَاقَدَرُواللہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ؏

یہ بات عام طور پر مشاہدہ میں آچکی ہے کہ لوگ شریعت کے احکام کی پروا نہیں کرتے۔ لیکن اہل دنیا کی رسم و رواج اور برادری کا بڑا پاس کرتے ہیں۔ دیکھو حکیم سنائی اس واقعہ سے نصیحت کا کیا پہلو پیدا کرتے ہیں ؎

ترا یزداں ہمی گوید کہ در دنیا مخور بادہ ترا ترسا ہمی گوید کہ در صفرا مخور حلوا
زبہر دیں تو نگزاری حرام از دست بیزارے ولیک از بہر تن مانی حلال از گفتہ ترسا

یعنی خدا نے حکم دیا ہے کہ شراب نہ پیو اور عیسائی (ڈاکٹر) کہتا ہے کہ صفرا میں حلوا نہ کھاؤ۔ حلوہ حلال چیز تھی۔ اس کو تم نے ایک ڈاکٹر کے کہنے سے چھوڑ دیا۔ اور شراب جس کو تم خود بھی حرام سمجھتے ہو اور وہ مضر صحت بھی ہے۔ خدا کے کہنے سے نہیں چھوڑتے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے۔ کہ تم خدا کے حکم کو ایک ڈاکٹر کی بات کے برابر بھی نہیں سمجھتے ؏

جھٹکے کا گوشت حرام ہے اور اسکی حرمت سور کے گوشت کی طرح موکد برسم و رواج بھی ہے۔ اسی بنا پر مسلمان جھٹکے کے گوشت کو چھونے سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا جھٹکے کے جانور کے چمڑے کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ اکثر مسلمان اس کے چمڑے سے ایسی نفرت کرتے ہیں جیسی سور کے چمڑے سے کی جاتی ہے۔ لیکن بعض آزاد خیال مسلمان اس نفرت کو شریعت کی پیروی پر محمول نہیں کرتے۔ بلکہ اس کو رسم و رواج کی پابندی پر مبنی سمجھتے ہیں ؏

قدیم سے سنت اللہ یوں جاری ہے کہ جب نئی شریعت آئی تو اس کا ملکی رواج

سے مقابلہ کیا جاتا ہے اسلئے کہ پہلی شریعت کے امتداد اور بعد کے سبب سے اس میں طرح طرح کے افراط و تفریط اور قسم قسم کی کمی بیشی کو دخل ہو جاتا ہے۔ اور اس صورت میں اصلی صراط مستقیم پر لوگوں کو چلانا گویا ان سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے اور جب ایسی حالت قوم کی ہوا کرتی ہے تو اس وقت خدا کی طرف سے شریعت کی تجدید کی ضرورت داعی ہوتی ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کو مبعوث ہونے کے وقت یہی دقت پیش آتی تھی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے ہی وقت میں مبعوث ہوئے کہ تمام مذاہب حقہ اور باطلہ میں طرح طرح کی کمی بیشی آگئی تھی اسلئے آپ کو سخت مقابلہ کا موقع ہوا۔ جو لوگ مشرف با اسلام ہوئے۔ گو انہوں نے شریعت کو نہایت نیک نیتی اور سچے اعتقاد سے لبیک کہا۔ اور دل و جان سے اس کے گرویدہ ہوئے۔ مگر عورتوں کے گروہ پر وہ بھی پورا پورا شریعت کا سکہ نہ بٹھا سکے۔ ان کی جہالت اور دینی نقصان نے بعض پرانے رسوم سے ان کو پورے طور پر باز نہ رکھا چنانچہ کسی عزیز و اقارب کے فوت ہونے پر چلانا۔ بین کی رسم بہت کم موقوف ہو سکی چنانچہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سے ان کے متعلقین کے نوحہ و شور و گریہ پر آنحضرت صلعم نے جب دیکھا کہ یہ باز نہیں آتیں تو فرمایا کہ ان کے منہ میں مٹی ڈالدو۔ اور یہ بھی فرمایا کہ یہ جہالت کی رسم میری امت سے مفقود نہ ہوگی۔ عرب کی حالت تو پھر بھی بہت کچھ سدھر گئی۔ تمام رسوم قبیحہ شرکیہ وغیرہ دور ہوگئیں۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ شیطان عرب کے علاقہ سے ناامید ہو گیا ہے کہ اس کی پرستش کیجاوے۔ ہندوستان میں بھی جب اسلام آیا تو اُسنے اگرچہ پورے طور پر اپنا سکہ جمایا مگر بہت سے رسوم کا بقایا صدیوں کے گذر جانے پر بدستور چلا آتا ہے۔ چنانچہ لباس اور شادی اور غمی کے رسوم حتیٰ کہ حقوق اللہ کے ترک میں اکثر اہل اسلام قدیم رسوم کے پابند ہیں۔ منجملہ ان کے مسئلہ میراث اور

شادی اور غمی اور لباس قابلِ غور ہیں ؎

میراث

سب سے مہتم بالشان رواج جو کہ شریعت کے خلاف بعض مسلمانوں میں جاری ہے وہ یہ ہے کہ بیٹیوں اور بہنوں کو میراث سے محروم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اہلِ اسلام کے زمینداروں میں اسی پر عمل ہے حکومت نے بھی اسی کو قانون قرار دیا۔ حکومت کو تو اس کی ضرورت نہ تھی۔ مگر خود مسلمانوں نے ہی اس مخالف شریعت رواج کو نہیں چھوڑا۔ کیسے غضب کی بات ہے کہ شریعت اسلامی تو بیٹیوں اور بہنوں کو وارث قرار دیتی ہے اور یہ نام کے مسلمان ان کو محروم رکھتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید میں میراث کی تقسیم کے بعد ساتھ ہی یہ فرمایا ہے تلک حدود اللہ ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنّٰتٍ تجری من تحتہا الانہٰر خٰلدین فیہا وذٰلک الفوز العظیم ومن یعص اللہ ورسولہ ویتعد حدودہ یدخلہ نارا خالدًا فیہا ولہ عذاب مھین[1] پس ایسا برا رواج جس میں حدود اللہ سے تجاوز پایا جائے۔ اگر صراحتاً اسکو جائز اور صحیح مانا جائے تو بلاشبہ انکار حکم خداوندی لازم آئیگا جس کو شرعی الفاظ میں کفر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کے دائمی عذاب کی وعید آچکی ہے۔ اور اگر ناجائز سمجھا جائے مگر محض قوم کا رواج قرار دیکر اس کا اتباع کیا جائے تو فسق میں ضرور داخل ہوگا۔ بہرحال مسلمانوں کو اس کا ترک لازم ہے اور مسلمان اس رواج کی وجہ سے خود نقصان اٹھاتے ہیں۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے کہ باوجود بیٹی کے موجود ہونے کے دور کے رشتہ دار زمین اور جائداد پر قابض ہوجاتے ہیں اور والدین

---

[1] یہ خدائی حدیں ہیں جو کوئی شخص خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کریگا خدا اسکو ایسے باغوں میں داخل کریگا جسکے نیچے نہریں بہتی ہونگی اور یہ بڑی کامیابی ہوگی۔ اور جو خدا اور اسکے رسول کی نافرمانی کریگا اور حدود سے تجاوز کریگا تو اسکو خدا دوزخ میں ڈالیگا جس میں وہ ہمیشہ رہیگا اور اسکو ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا ؎

ہاتھ سے اس دنیا سے چل دیتے ہیں۔ کردنی خویش آمدنی پیش کا مضمون صادق آتا ہے سچ ہے شریعت حقہ کا قانون ایسا بہتر اور عمدہ ہے کہ اس سے بہتر ہونا ممکن نہیں یورپ میں جائداد بڑے بیٹے کے نام ہو جاتی ہے۔ ہمارے بعض نوجوان یورپ کے مہذب تعلیم یافتہ بھی چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں یہ قانون جاری ہو۔ مگر افسوس کہ انہوں نے قانونِ قرآنی کا کچھ پاس نہیں رکھا۔ رفتار زمانہ کے مطابق اس میں کانٹ چھانٹ کرنے کی آئے دن تجویزیں سوچتے رہتے ہیں۔ حالانکہ اس میں بڑی مصلحت یہ تھی کہ ہر ایک وارث اپنے حصہ کا مالک و متصرف ہوتا ہے۔ اسکو ہر طرح کا اختیار ہے۔ اگر اس کو با اختیار نہ بنایا جائے تو بعض دفعہ اس کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور بڑے بھائی کا بیجا تصرف اس کے حق واجب کو پامال کرتا ہے۔ مگر یہ خیال عموماً ظاہر کیا جاتا ہے کہ بصورت تقسیم ہر ایک اپنے اپنے حصہ کو برباد کردیگا۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا بڑے بیٹے کے نام ہونے سے جیسا کہ بعض کا خیال ہے یہ احتمال اٹھ جاتا ہے۔ بلکہ پھر تو اور بھی قوی احتمال ہے کیونکہ ایک شخص ہی کے نام تمام جائداد ہونے سے پورا احتمال ہے کہ وہ اسکو بری طرح تصرف[لہ]

لہ مگر ایک بد اعتقاد نیچری صرف اسی بات پر کٹ حجتی سے باز نہیں آ سکتا۔ کیونکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ بذریعہ قواعد یا قانون ملکی بڑے بیٹے کے اختیارات کو محدود کیا جا سکتا ہے جس سے وہ بیدل پابندی قواعد یا قانون کوئی ناجائز تصرف جائداد مشترکہ میں نہ کر سکے اور ممکن ہے کہ وہ بعض نظائر اس قسم کے پیش کر کے اپنے دعویٰ کو مضبوط کرے سو اس کے جواب میں ہم یہ کہینگے کہ بیشک یہ صحیح ہے۔ مگر ذرا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ صورت بھی کلی طور پر حفظ جائداد کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ یہ امر بہرحال مسلّم ہے کہ شخصی ضرورتیں اور شخصی عزم اور ارادہ اپنے علیحدہ علیحدہ حدود میں محدود ہوتے ہیں۔ اور ان میں بلحاظ کیفیت اور کمیت کے یکسانیت کا بہت کم خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ اسلئے یہ کبھی قرین قیاس نہیں کہ اختلاف ضرورت اور اختلاف عزم و ارادہ جو فطری امور ہیں اپنے اپنے مقتضا پر عمل نہ کریں۔ اور اگر بذریعہ قواعد یا قانون انکے عمل کو روکا جائیگا تو وہ کسی دوسری صورت میں اپنا برا اثر ظاہر کئے بغیر نہیں رہینگے۔ جنکے برے نتائج انسانی اخلاق اور طرز معاشرت میں ظہور پذیر ہو کر سلسلہ اتحاد عام کو توڑ ڈالینگے۔ یہ ایک ایسا واضح امر ہے جس سے کوئی سلیم الطبع آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ اور چند ایک نظائر کا پیش کر دینا خصم کیلئے اس وقت حجت ہو سکتا ہے جبکہ اس امر کی خوب چھان بین کر لیجائے۔

بقیہ صفحہ ۱۳۳

نہیں لائے اور مال مفت دل بےرحم پر عمل کرے۔ اور اگر عدل و رحم کا احتمال بڑے بیٹے میں ہے تو ہر ایک کے لئے کیوں اس احتمال کو ترجیح نہیں دی جاتی کہ وہ مال کو بری طرح خرچ کرے گا۔ لیکن اگر شریعت کے مطابق ہر ایک مسلمان عمل کرے تو پھر کوئی ضرورت نہیں کہ تمام مال بڑے بیٹے کے قبضہ میں رہے اور چھوٹے کو اس کا دست نگر بنایا جائے جو اپنے باپ سے وہی نسبت رکھتا ہے جو بڑا بھائی۔ اور اگر شریعت کی پابندی نہیں تو پھر چھوٹے وارثوں کو محروم رکھنا محض حماقت ہے۔ بہرحال حدود اللہ کی پابندی لازم ہے جس سے کسی مسلمان کا مسلمان بنا رہنا پایا جاتا ہے۔ صرف وہمی اور خیالی امور کی بنا پر قرآنی اور خدائی قانون کا بدل دینا مسلمان کی شان سے بعید ہے۔ اور سچ پوچھو تو اسی قانون الٰہی یعنی قرآنی حدود و احکام کے ترک عمل سے مسلمان کی بہت

بقیہ صفحہ ۱۳۲ کہ جو صورت اشتراک جائداد کسی قوم میں مسلم ہو چکی ہے۔ اس میں مذکورہ بالا فطری تقاضات کوئی کسی قسم کے برے نتائج پیدا نہیں ہوتے یا یہ صورت حال ہمارے مطلب کی تائید کرتی ہے کیونکہ تمام قوانین ہمیشہ سے دن بدن تبدیل ہوتے رہتے ہیں یا کسی نئی صورت میں بدلتے رہتے ہیں اور جب کسی نئی صورت میں چند ایک غلطیوں کا پتہ لگ جاتا ہے تو ان میں پھر ترمیم یا تنسیخ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ امر کافی حجت ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں کہ مجوزہ صورت اشتراک گو بظاہر چند ایک مصالح پر مشتمل ہو مگر بدیہی ہے کہ اسکے جو نتائج جو فطرتاً پیدا ہوتے ہیں یا آخر قومی زوال کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ اور اخلاقی نقصانات کا موجب ہو کر انسانی ہمدردی کو بالکل دور کر دیتے ہیں۔ برخلاف اسکے اگر جب ترکہ کسی متوفی کا بموجب احکام شریعت اسلام تقسیم کیا جائے تو اس میں ہر ایک شخص اپنی جائداد کو اپنی حسب مرضی استعمال کر سکتا ہے اور اپنی طبعی آزادی کو جو بصورت اشتراک زائل ہو جاتی ہے۔ رکھ سکتا ہے کوئی وجہ نہیں کہ کیوں محدود اشتراک جائداد کسی قبیلہ کے افراد کو صرف ایک ہی دائرہ میں محدود رکھا جائے۔ جبکہ حالات طبعی اس امر کے متقاضی ہیں کہ مختلف افراد مختلف طور پر سرمایہ ملکی کو صرف کر کے اپنی دولت بڑھائیں اور اگر یہ کہا جائے کہ قانوناً ہر ایک کی ضرورت کا لحاظ رکھا جا کر اسی جائداد سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص زیادہ منتفع ہو اور دوسرا کم تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول یہ احتیاط محض خیالی ہے۔ اور اگر ایسا ہو بھی تو ایک پشت کے بعد اس پر عمل درآمد مشکل بلکہ محال ہو جائیگا کیونکہ افراد کے بڑھنے پر ان کی ضروریات بڑھیں گی اور جائداد منتقل نہیں ہو گی۔ اور اگر کہا جائے کہ افراد کے بڑھنے پر ساتھ ساتھ جائداد میں بھی ترقی ہوتی چلی جائیگی۔ اور اس لئے تمام افراد کی ضروریات گو وہ کیسی ہی مختلف ہوں اس جائداد مشترکہ سے پوری ہو سکیں گی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ یقینی امر نہیں کہ جائداد اسی نسبت سے ترقی کرے جس نسبت سے کسی قبیلہ کے افراد ترقی کرتے ہیں۔ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو اسی طرح تیسری یا چوتھی نسل کے لوگ اپنے اپنے ترقی طبعیہ کے عمل میں نہایت ہی ناقابل ہو جائیں گے کیونکہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جب اسے ضروریات آسانی میسر ہوں تو مشقت و محنت میں پڑنا گوارا نہیں کرتی۔ یہ بات ... نسل تک تو ممکن ہے کہ ... ہو مگر اس طرح اصلی نسلیں یقیناً ایسی ہی ہونگی۔ بہرصورت تقسیم جائداد کا اسلامی مسئلہ ایسا جامع اور مکمل ہے جو ہمیشہ نتائج بہبود پر مشتمل ہے۔ اور جو قومی ترقی اور انسانی فطری آزادی اور شخصی حقوق کی نگہداشت میں تمام اقوام کے قانون تقسیم جائداد سے سبقت لے گیا ہے۔

داو بار کے گڑھے میں جا گرے ہیں۔ اور لطف یہ کہ قومی ترقی احکام الٰہی کو ترک کرنے ہی میں سمجھی گئی ہے نعوذ باللہ۔

نکاح شادی کے موقعہ پر اکثر مسلمان ہنود کی رسموں پر عملدرآمد کرتے نظر آتے ہیں۔ جن کا کتاب و سنت میں کہیں پتہ نہیں ملتا۔ شادی پر جو جو بدعات قبیحہ ظہور پذیر ہوتی ہیں ان کا عملدرآمد بڑے بڑے اونچے شریف خاندانوں میں بھی ہے۔ سہرا کا رواج بالکل ہندوؤں سے لیا گیا ہے۔ سہرے کے مضمون کو ہندی شاعروں نے کس کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ مگر عرب میں مطلقاً اب تک اس کو کوئی جانتا تک بھی نہیں۔ علیٰ ہذا کنگناں یعنی گاناں باندھنا۔ لوہے کی چھڑی یا چھری کا پکڑنا۔ اور جب شادی کے دن قریب ہوں تو تیل چڑھنے کی رسم اور جب دولہا دلہن اپنے سسرال میں جائیں تو دروازہ پر تیل کا گرانا اور عورتوں کا ایسے موقعہ پر فحش الفاظ سے واہیات گیت گانا اور رونمائی کے وقت مقررہ رسوم عمل میں لانا ناچ رنگ اور آتشبازی اور باجے وغیرہ کا جو فضول اور اسراف کے علاوہ برباد کن رسمیں ہیں وغیرہ وغیرہ ان سب بدعات[1] کا ہر ایک مسلمان کو بالعموم اور اہل علم کو بالخصوص انسداد کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ سب بدعات مشرکین سے اخذ کئے گئے ہیں اور اسلام جیسے پاک دین کے لیئے موجب ننگ و عار ہیں۔ شریعت نے نہایت سادہ طور پر شادی نکاح کا دستور قائم کر دیا ہے جس پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ اس میں کوئی امر ایسا جائز نہیں رکھا گیا جو شرعی یا اخلاقی طور پر ناپسند رکھا گیا ہو۔ اور نہ اس دستور پر چلنے سے کسی کو کسی قسم کی زحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج کل بجاجی

[1] بات تو ٹھیک ہے مگر مردوں کو تو ممکن ہے کہ کسی حد تک بچا لیا جائے لیکن عورتوں کو ایسے رسوم قبیحہ سے روکے رکھنا اگر ناممکن نہیں تو اسکے دشوار ہونے میں کیا شک ہے درحقیقت ایسے رسوم کی اشاعت عورتوں ہی کے ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے۔ جو کسی کی بھی نہیں سنتا۔ ۱۲ منہ

کی رسم صرف نام آوری کے لئے کی جاتی ہے۔ گو اس میں شادی والے کا دیوالہ نکل جائے مگر لوگوں کے واہ واہ اور تحسین آوری کرانے اور اپنی بڑائی قائم رکھنے کو خواہ نخواہ روپیہ قرض لیکر بھی کرتے ہیں مگر سنّت سے صرف اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے نکاح کے بعد دعوتِ ولیمہ فرمائی ہے اور اس میں بھی مختصر کھانا کھجوریں اور میوہ ہوتا تھا۔ اور بڑی دعوت ولیمہ مسنونہ حضرت ام المومنین زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح میں ہوئی تھی جس میں روٹی گوشت کھلایا تھا۔ بہرحال ولیمہ کی رسم سنت کے موافق ہے۔ مگر وہ بھی اپنی حیثیت کے مطابق ہونی چاہیئے نہ اسراف ہو نہ بتذیر۔

نیوتا یا تنبولی کی رسم بھی محض ایک رواج ہے اور بظاہر آیہ ولا تمنن تستکثر کے منافی معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اگر بطور عطیہ بغرض ازدیادِ محبت بلانیت معاوضہ ایسے موقع پر دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ؀

غمی میت کے دفن کے وقت بعض رسوم خلاف شریعت جاری ہیں مثلاً چھاتیوں کا پیٹنا اور بین کرنا۔ بالوں کا نوچنا جنکی صریح ممانعت حدیث میں آئی ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لیس منا من ضرب الخدود[۱] وشق الجیوب ودعا بدعوۃ الجاھلیۃ (مشکوٰۃ)۔

اب یہاں سے محرّم[۲] کی بدعات کو قیاس کیجیئے امام حسینؑ کی شہادت کے واقعہ پر کیسے ماتم ہوتا ہے۔ ایسی رسموں کا رواج شریعتِ اسلامیہ کے بالکل برخلاف ہے کیسے اندھیر کی بات ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم[۳] یہ فرمائیں کہ جو

---

[۱] یعنی جو عورتیں منہ پیٹتی اور گریبانوں کو پھاڑتی ہیں اور جہالت کے بین کرتی ہیں وہ ہم میں سے نہیں ہیں [۲] مسلمانوں نے رسوم محرّم کو ہندوؤں کے دسہرہ سے پیچھے نہیں رہنے دیا۔ [۳] اگر ہندو ایسے رسوم کو بجا لائیں تو حرام اور اگر مسلمان ایسا کریں تو جائز؟ سچ تو یہ ہے کہ اگر حضرات آئمہ اہل بیت زندہ ہو کر مسلمانوں کی ان کافرانہ رسوم کا ملاحظہ فرمادیں تو یقیناً وہ ان لوگوں کے سلام سے لاحول پڑھکر اپنی برءیت ظاہر کریں۔ ۱۲ منہ

ایسا ماتم کرے وہ ہم میں سے نہیں - اور مسلمان ہیں کہ ایسے ماتم کو موجب مغفرت وثواب دارین سمجھتے ہیں - ہاں ایسے واقعہ کے ذکر کے وقت یا اپنے کسی عزیز کے فوت ہونے پر صرف آنسو بہانا اور غمزدہ ہونا کچھ مضائقہ نہیں رکھتا - بلکہ یہ تو رحمت ہے ایسے حادثہ سے دل کا نرم ہونا ایک طبعی امر ہے - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صاحبزادہ کے انتقال پر آبدیدہ ہو گئے تھے - امام زین العابدین رضی اللہ عنہ اپنے والد کے واقعہ جانکاہ کو یاد کر کے بیہوش ہو جایا کرتے - اور ایسا اوقات پانی پینے کے وقت گلاس میں آنسو گرایا کرتے تھے - اپنے والد ماجد کے پیاسے شہید ہونے کو یاد کر کے روتے - باقی رسوم محض نمود کے لئے جو بعض جگہ مروج ہیں کہ ادھر مردہ گھر میں پڑا ہے اور ادھر برادری نے گھیرا کہ اس قدر کھانڈ اور میدہ اور گھی ہو اور حلوہ تیار ہو - جو قبل از اٹھانے مردہ کے ملا ور دلیتیوں وغیرہ کو کھلایا جائے - حالانکہ یہ رسم بھی محض رواج ہے - چاہئے یہ کہ اس روز اس گھر میں کچھ کھایا نہ جائے - برادری کسی دوست کو اس روز کھانا ماتم کے گھر والوں کے پاس بھیجنا چاہئے - چنانچہ یہ دستور بھی ہے اور بعد اس کے البتہ یہ جو رسم تیجا اور ساتا اور چہلم اور ششماہی اور برسی ہے اس کو گو بدعت کہہ سکتے ہیں مگر سیئہ نہیں بلکہ حسنہ[1] رکیونکہ اس میں ایصال ثواب مقصود ہوتا ہے - اور حدیث میں ہے کہ مردہ غریب کی طرح ہوتا ہے اس لئے شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی سورہ اذا السماء انشقت کی تفسیر میں جہاں مردہ کے حالات لکھے ہیں لکھا ہے کہ پہلے وقت میں مردہ کو ایصال ثواب کی سخت ضرورت ہوتی ہے اس لئے لوگ چہلم بلکہ برس تک ایصال ثواب کرتے رہیں ۔

ہاں البتہ بھاجی کی روٹی جو ایسے موقعوں پر تقسیم ہوتی ہے یہ رسم قبیح ہے

[1] دن کا مقرر کرنا ضروری نہیں ۱۲ منہ

...ں کو ترک کر دینا چاہیے جس سے مُردہ کو کوئی فائدہ نہیں - اور محض نام و نمود کے ...لئے کی جاتی ہے - بلکہ مستحقین غربا کو کھانا کھلانا چاہیئے ؞

وضع وقطع لباس

وضع و قطع میں ہر ایک قوم کا ایک شعار ہوتا ہے - دیکھو قوم سکھ ہیں ان کے گرو نے ایک شعار قائم کر دیا کہ سر بال کسی جگہ کے بھی ہوں ہرگز نہ لینا - چنانچہ اس پر وہ سختی سے پابند ہیں کبھی ترک نہیں کرتے - علی ہذا ہنود ہیں چوٹی کا رکھنا - اسلام نے بھی اپنا شعار قائم کیا - اور سنت ابراہیمی کے مطابق رسم ختنہ اور حجامت اور مونچھوں کا کٹوانا اور داڑھی کا بڑھانا اور لباس کے آداب کا لحاظ رکھنا - مگر مُلکی رواج نے اس پر بھی قابو پایا - ریاستوں میں دیکھو کہ اسی قسم کا رواج مرغوب طبائع ہے - عموماً عمامہ رنگین یا دوہرا عمامہ ریاست کی وضع کا مسلمان باندھتے ہیں - حیدرآباد میں جا کر دیکھو کہ وہاں بھی ریاست کا خاص لباس ہے جو عموماً پہنا جاتا ہے - ہمارے پنجاب میں آجکل خصوصاً مغربیت کا زیادہ زور ہے اور عموماً لوگ اسی کے دلدادہ ہو رہے ہیں - وضع قطع لباس عموماً مغربی طرز پر ہوتا جاتا ہے - انگریزی خوان عموماً داڑھی منڈھانے اور مونچھوں کے بڑھانے پر مائل ہیں اور بایں ہمہ اس کو گناہ نہیں سمجھتے کوٹ پتلون وغیرہ لباس کے فریفتہ ہیں - سچ ہے الناس علے دین ملوکہم کا مقولہ بہت درست ہے - اور پھر اس میں طرح طرح کی جدتیں نکلتی جاتی ہیں - غرضیکہ ان لوگوں نے قومی شعار کے فلسفہ کو بالائے طاق رکھ دیا ہے - چاہیئے تو یہ تھا کہ ہر ایک قوم کی وردی جدا ہو جس سے امتیاز ہو سکے مگر نہیں یہاں تو مقصود ہے جدت طرازی - الغرض شریعت نے جو وضع و قطع اور شعار اسلامی مقرر کر دیا ہے اُس کے مطابق چلنا اہل اسلام کا شیوہ ہونا چاہیئے - بعض کمینہ فطرت لوگ

سلہ یعنی لوگ اپنے بادشاہوں کے طریقہ پر ہوا کرتے ہیں ۱۲ منہ

ایسے بھی ہیں جو داڑھی اور لباس کے متعلق اکثر اوقات تا ہنجار تمسخر ایک دیا کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو احکام شریعت کا جوا گردن سے اتارے بیٹھے ہیں۔ شرعاً یہ واجب التعزیر ہیں ؛

اِسلام اور حُریّت

خلاصِ حافظ ازاں زلفِ تا بدار مباد
کہ بستگانِ کمند تو رستگار انند (حافظ)

اس وقت عام خیال یہ ہے کہ مذہب ایک قسم کی قید ہے اور پابندی مذہب بالعموم مانع ترقی ہے۔ افسوس تو یہ ہے۔ کہ بعض تعلیم یافتہ مغربی روشنی کے دلدادہ مسلمان بھی اسی خیالِ غلط میں مبتلا ہیں۔ اِسی بنا پر آزادی یورپ کی جابجا مدح سرائی ہے۔ اور قید مذہب سے آزادی حاصل کرنے کا سبق دیا جاتا ہے ہمارا مطلب بیاں آزادی کے مختلف پہلوؤں کو بالاجمال دکھلانے کا ہے۔ اور بعض سلف صالحین کے حالات اور ان کی روشن زندگی سے اس کا ثبوت دینا ہے کہ اسلام نے کس قدر آزادئ خیالات کی عملی قوتیں عطا کیں اور کس طرح زندہ مثالیں ان اصول پر کاربند ہونے کی وجہ سے پیدا کرکے دنیا کو دکھلا دیں۔ اور اپنی صداقت کا عملی ثبوت دیا ؛

آزادی کے مفہوم میں آزادی خیال۔ آزادی قول اور آزادی عمل داخل ہیں اور یہی مہتم بالشان مسائل ہیں جو آجکل بہت زور کے ساتھ معرض بحث میں آرہے ہیں۔

آزادی کی بنا مسئلہ مساوات حقوق بنی آدم پر مبنی ہے یعنی ہر ایک انسان

بلحاظ رنگ و قوم و ملک حقوق میں مساوی ہے اور فطرتاً سبکو ایک ہی قوائے عقلی و عملی دیئے گئے ہیں۔ ان کے تصرف کرنے۔ ترقی دینے اور استفادہ حاصل کرنے کا ہر ایک یکساں حق رکھتا ہے۔ یہی حقوق طبعی یا پیدائشی کے نام سے موسوم ہیں اور آزادی کے مدعیان کو سب سے پہلے یہی حقوق تسلیم کرنا پڑتے ہیں ؛

مگر چونکہ انسان مدنی الطبع ہے لہذا عملی تعلقات زندگی میں ہر شخص کے ذاتی حقوق نفع عامہ خلائق کے تابع ہیں۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اگر کسی فرد کی ذاتی آزادی عامہ خلائق کے خلاف اور مضرت رساں ثابت ہوتی ہے تو وہ شخص اس آزادی سے مستفید ہونے کا بحیثیت مدنی الطبع ہونے کے مجاز نہیں ہو سکتا کیونکہ مدنی الطبع ہونا اس کا امتیازی جوہر ہے۔ اسی اصول پر سرخیل فلاسفہ یعنی ارسطا طالیس نے آزادی کو عمل نیک تسلیم کیا ہے۔ اور اس حد تک ہر شخص کی آزادی کو مقید کیا ہے اور خودغرضی کی مذمت کی ہے کیونکہ خودغرضی انہیں قوانین کی خلاف ورزی کا نام ہے ورنہ فطرت میں ہر انسان اپنے قیام حیات اور جلب منفعت اور آزادانہ عمل نوعی پر مجبور ہے ؛

سوسائٹی اور انسان کے باہمی تعلقات کا مسئلہ نہایت قابل غور اور بحث طلب ہے اب سوال یہ ہے کہ عمل نیک سے کیا مطلب ہے اور اس کی شناخت کیا ہے۔ یہ واقعی دلچسپ مسئلہ ہے کیونکہ ہر شخص کی آزادی اسی اصل اصول کی تابع ہے۔ اس جگہ یہ امر ظاہر کر دینا قرین مصلحت ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ آزادی اور پابندی قواعد باہم دو متضاد امر ہیں اور اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو آزادی کسی قانون یا اصول کی پابند نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ خیال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جو آزادی اور مطلق العنانی میں فرق نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کی آزادی (حقیقی اور جائز آزادی) ایک سلسلۂ قواعد کے تابع ہے۔ جب حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو آزادی مطلق العنانی بن جاتی ہے جو موجب ہلاکت ہے ؛

کسی قانون فطرت کے تابع ہونا آزادی میں رخنہ انداز نہیں ہوسکتا۔ اور جو لوگ کسی معقول جائز قانون (شرعی یا عرفی) کو مانع آزادی خیال کرتے ہیں۔ وہ صراط مستقیم سے انحراف کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسے قواعد کسی فرد واحد کے جابرانہ طور پر ذاتی غرض کے حصول کے واسطے وضع نہیں کئے جاتے بلکہ خود حضرت انسان کی ہیئات نفسانیہ کا نتیجہ ہیں جو اسکے لئے موجب صلاح و فلاح ہیں۔ غور و فکر سے ایسے قواعد کا منشا سمجھ میں آسکتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کلام الٰہی میں ارشاد ہوتا ہے کہ زمینی اور آسمانی کائنات میں غور کرو کیونکہ ایسا غور و خوض فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ دیکھو حدیث کل مولود یولد علی الفطرۃ جس کو محدث دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ ہر ایک قسم کی آزادی کی حد معین ہے جس کے اندر کوئی شخص آزاد رہ سکتا ہے اور اِس حد سے زیادہ تجاوز نہیں کرسکتا باایںہمہ مذکورہ بالا حد کی آزادی کو انسان مدت العمر میں بھی حاصل نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اِسی حد و غایت کی تکمیل کو ایک مقصد اہم مانا گیا ہے۔ بعض آثار میں وارد ہوا ہے یا بنی آدم اِن لکم معالم فانتھوا الی معالمکم وان لکم نہایۃً فانتھوا الی نہایتکم۔ یہ الفاظ صاف طور پر اِنسان کو ایک حد معین تک محدود رہنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ انسان کی اعلےٰ سے اعلےٰ ترقی یہ ہے کہ وہ ہیئات نفسانیہ کی حد تکمیل تک رسائی حاصل کرے اور یہ مقام انسان کو اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جبکہ وہ قوائے بہیمیہ کو قوائے ملکیہ کے تابع رکھ سکے یعنی مقصود بالذات کی تکمیل میں جن خواہشات کا پورا کرنا حارج و مضر ہو اُن سے بچنا چاہئے اور انہیں خواہشات کا نام شرعًا اور عرفًا گناہ ہے۔ اور جو امور حصول مقصود بالذات میں معین ہوں وہ عمل خیر و سعادت ہیں۔ ملاحظہ ہو تعریف بِرّ و اثم[۲] جس کو شاہ ولی اللہ صاحب نے بدیں الفاظ قلمبند کیا ہے:۔

[۱] اے اولادِ آدم تمہارے لئے حدود کے نشانات ہیں سو انہیں تک محدود رہو اور ایک غایت ہے اس سے آگے نہ بڑھو ۱۲ منہ۔ [۲] نیکی اور گناہ ۔ ۱۲ منہ۔

البر کل عمل یفعلہ الانسان قضیۃ لانقیادہ للملاء الاعلیٰ وضمحلالہ تلقی الالہام من اللہ وصیرورتہ فانیا فی مراد الحق وکل عمل یجازی علیہ خیرًا فی الدنیا والاخرۃ وکل عمل یُصلح الارتفاقات التی بنی علیہا نظاما للانسان وکل عمل یفید حالۃ الانقیاد ویرفع الحجب والاثم کل عمل یفعلہ الانسان قضیۃ لانقیادہ للشیطان وصیرورتہ فانیا فی مرادہ وکل عمل یجزی علیہ شر فی الدنیا والاخرۃ وکل عمل یفسد الارتفاقات وکل عمل یفید قضیۃ متضادۃ للانقیاد ویولد الحجب +

اس جگہ سے ایک نہایت ضروری امر یہ ثابت ہوتا ہے کہ مطلقًا ہر خواہش کا فنا کرنا اور اپنے روزانہ زندگی کی خواہشوں کو چھوڑ دینا صحیح اُصول زندگی کے خلاف ہے۔ اِسی وجہ سے حدیث شریف میں ارشاد ہے لا رھبانیۃ فی الاسلام اور یہی اسلامی اخلاق کا معیار ہے۔ اسلام کا اُصول وہ ہے جو شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے ان السعادۃ الحقیقیۃ ھی انقیاد البہیمیۃ للنفس الناطقۃ واتباع الھوی للعقل وکون النفس الناطقۃ قاھرۃ علی البہیمیۃ والعقل غالب علی الھوی وسائر الخصوصیات مُلغاۃ (حجۃ اللہ البالغہ - باب مبحث السعادۃ) +

یورپ کے بعض فلاسفروں کا بھی یہی خیال ہے اور ہمارے اسلام کے مایۂ ناز حجۃ الاسلام غزالی نے احیاء العلوم میں پانچویں صدی ہجری ہی میں اس مسئلہ کو بڑے زور شور سے لکھا کہ نعمتِ حقیقی مقصود کو پا لینے کا نام ہے اور دیگر اشیاء مثل مال و دولت و جاہ و حشم و حکومت و اولاد وغیرہ بوجہ مقصود بالذات کے حصول میں معاون ہونے کے نعمت ہیں۔ اور اس کے تفاوت مدارج ہیں وہی نسبت قرب سے اعتبار سے ہے۔ وسیلہ سے مراد وہ امر ہے جو تکمیل ہیئات نفسانیہ میں ممد ہو ملکہ ع

عاشقاں ہردم رضائے دوست میدانند دوست

؎

وعدۂ دیدار چوں آمد بجنت لاجرم عاشقاں جنت برائے دوست میدانند

عاشقانِ جمالِ حقیقی کا تو یہ قول ہے ان کان الجنتہ بدون جمالہ ووصالہ فواویلاہ وان کان الجحیم مع وصالہ وجمالہ فواشوقاہ ؎

از سر کوئش اگر سوئے بہشتم می برند
پائے ننہم کاندریں جا وعدۂ دیدار نیست

نعمہائے آخروی کو بھی اُنہوں نے اسی قانون کے تابع کر دیا ہے یعنی مسلمانوں کا مقصد اصلی حصولِ جنت نہیں ہے۔ اور نہ وہ اس کے طالب ہیں چنانچہ حضرت رابعہ بصریہ سے بھی یہی مروی ہے یا یوں کہو کہ اصل مقصد تکمیل ہیئات نفسانیہ ہے جس کو مذہبی اصطلاح میں معرفت رضائے حق کہا گیا ہے۔ کیونکہ باری تعالے کا مقصد خلق انسان سے یہی ہے وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ اسی خیال پر اس آیت میں عبادت کی تفسیر معرفت الہٰی سے کیا کرتے ہیں۔ عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے جس میں حقیقتاً ہر امر جو تحصیل وتکمیل رضائے حق کا موجب ہو داخل ہے اور اسی وجہ سے اہلِ معرفت اور مردانِ خدا کے ہاں ادنیٰ سے ادنیٰ کام مثلاً کھانا پینا وغیرہ بھی مفہوم عبادت میں داخل ہیں۔ کیونکہ وہ خواہش نفس کی خاطر کسی عمل کو بجا نہیں لاتے بلکہ ان کا ہر ایک فعل مقصد حقیقی کے حصول کی خاطر ہوا کرتا ہے

مذہب ایک صراط مستقیم ہے جو اسی مذکورہ بالا اصل عظیم کی بنا پر انسان کی راہنمائی کرتا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر۔ امر معروف ونہی عن المنکر۔ یہی دو اصول اسلام کے راہنما ہیں آزادی خیال مفہوم آزادی کا پہلا مسئلہ ہے۔ جس میں عقاید حقہ اور ترقی خیا

بھی شامل ہیں۔ جن کا ثمرہ مختلف حقوق کا اعتراف اور اصلاح تمدن و معاشرت اور نظام اجتماع انسانی کا قائم کرنا ہے۔ حصۂ عقائد میں سب سے بڑا رکن توحید ذات باری ہے۔ جس میں اصولاً و فروعاً ذرا بھی شرک کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ نہانی دماغ کا معراج ۔۔ حقیقت توحید کا کماحقہ ادراک کرنا ہے۔ پھر تعلق عبودیت و الوہیت کا مرحلہ ہے۔ جس کی بناء پر بحکم نحن اقرب الیہ من حبل الورید بندہ بلا واسطہ بارگاہ رب العزت میں عرض حاجات کرسکتا ہے ؎

اتصالے بے تکیف بے قیاس ٭ ہست رب الناس را با جان ناس

پھر معبود بھی کیسا جو ہر وقت حاضر و ناظر اپنی رحمت کاملہ سے ادعونی استجب لکم کا حکم ارشاد فرماتا ہے۔ ہماری ہر حالت کا نگران و متولی ہے مگر ہمارا رجوع کرنا شرط اولین ہے۔ طریق عبادت ایسا بنایا زمندانہ مخلصانہ اور طرہ یہ کہ باوجود سادہ اور بے تکلف ہونے کے قلب مومن کو نور ایمان سے بھر دیتا ہے۔ کیا کوئی اور مذہب اس سے بہتر طریقۂ عبادت پیش کرسکتا ہے؟ تحصیل علم کی تاکید بحکم اطلبوا العلم ولوکان بالصین مرد و عورت دونوں پر مذہباً یکساں ہے۔ جس نے بوعلی سینا اور بوحنیفہ شافعی جیسے مجتہدین اور احمد و بخاری جیسے محدثین اور غزالی و رازی جیسے متکلمین پیدا کئے۔ جو اسلامی کتب آزادی تعلیم کا مایۂ ناز ہیں۔ تصوف۔ فلسفہ۔ تاریخ۔ ہیئت۔ ریاضی۔ فقہ سیاست۔ صرف و نحو۔ ادبیات۔ جدل و مناظرہ۔ منطق۔ کیمیا وغیرہ علوم میں مسلمانوں نے دوسری اور تیسری صدی میں کافی ترقی کرلی۔ بغداد۔ غرناطہ۔ قرطبہ۔ شیراز مرکز علوم و فنون تھے۔ یہاں علوم و فنون کے حاصل کرنے میں کسی قسم کے قیود و شرائط عائد نہیں کئے گئے تھے۔ کیونکہ اسلام اشاعت علوم پر اجرت و معاوضہ کو جائز نہیں رکھتا۔ چنانچہ آج تک بھی اکثر حضرات اکابر علما اپنے تلامذہ کو محض خالصاً لوجہ اللہ تعلیم دیتے رہے بلکہ بعض حضرات کی نسبت مروی ہے کہ وہ مفلس تلامذہ کی امداد اپنی گرہ سے کیا کرتے اور اب بھی اسکی

چند ایک مثالیں موجود ہیں۔ حقوق مساوات و اخوت بنی آدم جو ترقی کا پہلا زینہ ہے اسلام نے اس اصول پر کاربند ہونے کی عملی مثالیں دیں۔ غلام و مالک کا درجہ اس نے برابر کر دیا۔ ذمی و مسلم برابر۔ حرمت خون دونوں کی یکساں قرار دی گئی۔ حضرت ابوبکر نے غلامی کی قید سے آزادی دلانے کی پہلی مثال قائم کی۔ حضرت عمر فاروق کے سفر بیت المقدس سے کون ناواقف ہے؟ جس میں آپ نے اپنے ایک غلام کو اپنے ساتھ کا شریک رنج و راحت سمجھا۔ خود پیدل چلتے تھے اور اس کی باری پر اس کو سوار کرتے تھے اور اسی اسلامی شان و شوکت سے بیت المقدس تشریف لے گئے اور عملاً دکھا دیا کہ اسلام نے ہمیں ایسی پاک روشن زندگی کی تعلیم دی ہے۔ اور اسی تعلیم کا نتیجہ تھا جس نے بے تکلفانہ مخلصانہ طرزِ عمل سے عالم بھر کو مسخر کر لیا۔ آج جو لوگ آزادی کا غلط مفہوم قرار دے کر مغربی اقوام کی مطلق العنانی کو بطور نظیر پیش کیا کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مقدس اسلام نے انسان کے ہر شعبہ زندگی کے متعلق ایسے احکام پیش کئے ہیں۔ جنکی پابندی سے اگرچہ بظاہر انسان مقید ہوتا ہے مگر اس کے نتیجہ میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے انسان کو ایک آزادی کی ایسی نعمت عطا کی ہے جس کے حصول پر وہ اپنے معبود حقیقی کے سوا ہر ایک قسم کی غلامی سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاتا ہے۔

مساوات

اسلام نے قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ ہر شخص خدا کے نزدیک برابر ہے۔ خدا آدمیوں کی صورتوں اور وضعوں کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ اِن کے دلوں کو دیکھتا ہے خدا کی رحمت اس کے لئے ہے جو اس کی اطاعت کرے۔ خواہ وہ حبشی غلام ہو اور عذاب اس کے لئے ہے جو نافرمانی کرے خواہ وہ قریشی النسل ہو۔ غنی و فقیر

محتاج و امیر۔ آزاد و غلام میں کوئی فرق نہیں۔ اور اگر ہے تو صرف تقویٰ سے ہے فرمایا۔ اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد و عورت کر کے پیدا کیا۔ اور تمہیں گروہ اور خاندان بنائے تاکہ تم باہم شناخت کر سکو۔ خدا کے نزدیک تم لوگوں میں زیادہ بزرگ وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ اس ارشاد سے خدا نے افراد میں سے ہر موہوم امتیاز کو اٹھا دیا اور کسی کو کسی پر صاحب تسلط نہیں بنایا۔ بجز اس تسلط کے جس کی حدود کی شریعت نے دفع اذیت و حفظ امن کے لئے تعیین کر دی۔ اس کے علاوہ انسان پر کوئی حاکم اور گماشتہ نہیں ہے ہے تو اکیلا خدا ہے۔ ہم میں اور خدا میں کوئی حجاب یا واسطہ حائل نہیں ہے۔ فرمایا اے پیغمبر تم فقط نصیحت کرنے والے ہو کسی پر مسلط نہیں ہو۔ نہ جوگی ہیں نہ رشی ہیں نہ اسقف نہ پادری نہ موبد نہ پوپ کہ لوگوں کو پروردگار عالم کا مقرب بنائیں۔ اس قاعدہ سے وہ سب روکاوٹیں جو دوسرے مذہب کے پیشواؤں نے عقل اور انسان کی طبعی آزادی کو بیکار رکھنے کے لئے وضع کی تھیں زائل ہو گئیں مثلاً یہ دعویٰ کہ خدا اور بندوں کے درمیان گناہ کی مغفرت کے لئے یہ لوگ واسطہ ہیں یا بعض حرام چیزیں کچھ روپیہ لیکر حلال کر سکتے ہیں۔ اور لوگوں کو مذہبی کتابوں کے پڑھنے سے باز رکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح اور سب مفاسد جن میں دوسری قومیں اپنی دینی کتابوں کی بعض عبارتوں کی وجہ سے مبتلا تھیں۔ یہ وہ مفاسد ہیں جنکا منبع یا غلط خیال کر کے ظہور اسلام کے بعد بھی کئی صدیوں تک اسی پر عمل کرتی چلی آئیں۔ ظہور اسلام پر بعض قوموں کو مذکورہ بالا مفاسد کی اصلاح کا خیال پیدا ہو گیا۔ کیونکہ اسلام نے اپنی پاک تعلیم سے ہر مسلمان کو اس امر کا پابند کر دیا کہ وہ خود خدا کی مقدس کتاب کو پڑھے۔ اور خود غور و خوض سے کام لے جس پر کسی قسم کی قیود و شرائط عائد نہیں کی گئیں۔ مگر دیگر اقوام میں قبل از اسلام اپنی اپنی مذہبی کتابوں سے آزادی بلا امتیاز شخصیت نہیں دیگئی تھی۔ اسلام کورانہ تقلید کی مذمت کرتا ہے

اور بے حجت کسی کی پیروی کرنے سے روکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے جو اتارا ہے اُس کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ ہم اس طریقہ کا اتباع کرینگے جن پر ہم نے اپنے آبا و اجداد کو پایا ہے خواہ ان کے آباو اجداد کچھ نہ جانتے ہوں۔ اور نہ ہی ہدایت پر ہوں۔ اور اس جملہ کے مطابق کہ کہنے والے کی بات میں غور کرکے سچ کو جھوٹ سے الگ کرے اور کہنے والے کو نہ دیکھے حکم دیا کہ میرے ان بندوں کو بشارت دو جو بات سنتے ہیں تو اُس میں سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں اُن لوگوں کو خدا نے ہدایت کی اور یہی لوگ دانشمند ہیں۔ کونسا اور مذہب ہے جس نے یہ باتیں پیش کی ہوں؟

الغرض صرف اسلام ہی ایک ایسا پاک مذہب ہے جس نے تمام افراد انسانی کو فطرت الٰہیہ کی ایک سطح پر بلا امتیاز شاہ و گدا کھڑا کرکے ایک ہی حکم عام کا پابند ٹھہرایا۔ اور یہی ایک اصل عظیم انسانی دنیا کی آنے والی نسلوں کے لئے مایۂ فخر و نازبنتا نظر آرہا ہے اور وہ وقت قریب آرہا ہے کہ دنیا بھر کے تمام ملیا پھوس مذاہب اسلام کے بحر ناپیدا کنار میں داخل ہوکر بے نام و نشان ہو جائیں مگر اس کے لئے ابھی کچھ عرصہ درکار ہے۔ ہاں آثار الٰہیہ نمودار ہو چکے ہیں جنہیں سوا دقیق النظر اصحاب کے کوئی شخص نہیں دیکھ سکتا ۔

حقوق الرجال والنساء

ذیل کا مضمون نہایت قابل غور ہے۔ اور غور سے مطالعہ کرنیوالوں کے لئے بہت سے شبہات کے رفع کرنے کا موجب ہو سکتا ہے ۔

کیا فطرت نے مرد اور عورت کو یکساں حقوق دئے ہیں

اس مسئلہ

کے طے ہونے پر بعض دیگر اہم مسائل کا بھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً مسئلہ تعلیم نسواں حکم پردہ وغیرہ۔ اس موضوع پر بہت سے اصحاب مخالف وموافق لکھ چکے ہیں۔ اور بحکم ؎ کل حزب بما لدیہم فرحون ، اپنی اپنی رائے پر جمے بیٹھے ہیں۔ ہم حکم پردہ اور تعلیم نسواں پر آئندہ مفصل بحث کریں گے۔ اس جگہ ہمیں عنوان مذکورہ بالا پر کچھ کہنا ہے۔

اس عنوان کے متعلق مفصلہ ذیل وجوہ قابل بحث ہیں :۔

(۱) صحیفۂ فطرت یا یوں کہو کہ مظاہر قدرت میں اشیائے موجودات کی گوناگونی کا نقشہ ایک ایسا دلچسپ نظارہ ہے جو ایک عارف محقق کے لیئے بیشمار علمی خزانوں کا ذخیرہ ہے۔ اسی بیش بہا علمی ذخیرہ کی دوسری صورت مختلف قوموں کے وہ علوم وفنون ہیں جو ہر ایک قوم کے زمانۂ ترقی میں مدون کیئے جاتے ہیں اور کیئے جا رہے ہیں۔ موجودات کی گوناگونی جس کو عربی زبان میں تنوع الکائنات کہہ سکتے ہیں اثبات توحید کا پہلا زینہ ہے مگر مجھے اس وقت اس پہلو سے بحث کرنا مدنظر نہیں۔ یہاں صرف اس امر کو زیر بحث لانا مقصود ہے کہ اشیائے عالم میں ہم ایک ترتیب پاتے ہیں جس سے تمام موجودات مادی باوجود بعض امور میں مشترک ہونے کے اپنے علیحدہ علیحدہ خواص بھی رکھتے ہیں۔ سب سے اول ہم جمادی اشیاء کی جماعت بندی کرتے ہیں تو ہمیں بخوبی یقین حاصل ہوجاتا ہے کہ ایک ہی نوع کی اشیاء میں گو وہ اپنے اوصاف میں مشترک ہوں مگر ان میں قوت وضعف اوصاف کے رو سے بیّن فرق پایا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا حیوانی جنس کے انواع کی جماعت بندی سے ہمیں واضح ہوجاتا ہے کہ ایک ہی نوع کے افراد مختلفہ باوجود متشابہ الاوصاف ہونے کے ایک رتبہ میں نہیں ہیں اور یہ ایک ایسا امر ہے جس کی اصلیت سے ہم بروئے مشاہدہ وتجربہ کسی طرح انکار نہیں کرسکتے ۔

؎ ہر ایک فریق اپنے اپنے خیال پر اترا رہا ہے۔ ۱۲

(۲) تذکیر و تانیث کا فرق صرف حیوانی موجودات تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ فرق تمام مادی اشیاء میں پایا جاتا ہے۔ حیوانات میں تو ظاہر ہے مگر نباتات اور جمادات میں کسی قدر خفی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ فرق ہر ایک قسم کی موجودات میں علیحدہ علیحدہ صورت میں پایا جاتا ہے۔ نباتات میں علم نباتات کے علماء نے تذکیر و تانیث کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے۔ اور اشیائے جمادی میں بھی برو‌ئے بعض حالات اس امر کی اصلیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ قرآن مجید اس کی تصدیق کرتا ہے ؛

اور عقلی دلیل ہمارے پاس اس مسئلہ میں یہ ہے کہ تذکیر و تانیث کا فرق اس اصل پر مبنی ہے کہ عالم کائنات میں ایک شے دوسری شے میں اپنا اثر پیدا کرتی ہے اور اس سے خاص خاص نتائج ظہور میں آتے ہیں۔ یعنی ایک چیز میں قوت فاعلہ اور دوسری میں منفعلہ موجود ہے۔ اور اس فعل و انفعال یا تاثیر و تاثیر سے کارخانہ قدرت کی گوناگونی کا سلسلہ قائم ہے۔ اسلئے ایک ہی نوع کی دو چیزوں میں جب ہم یہ بات دیکھ لیں کہ ایک چیز نے اپنی طبعی حالت کے رو سے دوسری چیز میں کسی قسم کا اثر پیدا کیا ہے اور وہ دوسری چیز اس اثر کو قبول کرکے کسی نتیجہ کا مصدر بن گئی ہے تو بلاشبہ ان میں تذکیر و تانیث کا تعلق تسلیم کرنے پر ہم مجبور ہو جائینگے۔ پس صرف طبعی خاصہ کے مطابق ایک چیز کا دوسری ہمجنس چیز میں اثر کرکے اس کو خاص نتیجہ ضروریہ کا مصدر بنا دینا۔ امتیاز تذکیر و تانیث کی دلیل ہے۔ البتہ تذکیر و تانیث کا مفہوم مختلف نوع کی اشیاء میں ایک ہی صورت میں جلوہ گر نہیں ہوگا۔ بلکہ اس صورت میں جو ہر ایک نوع کے ساتھ حکیم مطلق نے خاص کر دی ہے ؛

(۳) ماسبق سے اتنا تو معلوم ہو چکا ہے۔ کہ ایک ہی نوع کے افراد میں

بلحاظ قوت وضعف اوصاف کے فرق ہوتا ہے۔ اور یہ بات بالکل واضح ہے جس میں کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ مگر کیا کسی نوع کے مذکر و مونث میں بھی بلحاظ قوت وضعف اوصاف کے فرق ہوتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہمیں کسی قدر انسانی جسم کی بناوٹ اور اس سے قوا کے طریق عمل کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ گو بعض اہل فلسفہ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ انسانی قوائے فطری کی قوت و ضعف انسانی جسم کی بناوٹ پر منحصر ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ تجربہ نے کسی حد تک اس خیال کی تصدیق کر دی ہے اور عملدرآمد میں اس کلیہ کو بطور امر واقع کے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کہ انسان کی جسمی بناوٹ کو قوائے فطریہ کی قوت وضعف میں پورا پورا دخل ہے۔ یہ مسئلہ کہ دماغ میں مختلف قوائے ذہنیہ کے لئے مختلف مقامات مقرر ہیں اکثر حکماء یونان کا خیال تھا۔ اس خیال کو اہل عرب نے حکمائے یونان سے حاصل کیا۔ موجودہ زمانہ میں علمائے یورپ میں سینٹ آسٹن وغیرہ بھی اس کے قائل ہوتے ہیں۔ مگر مجھے اس موقعہ پر اس خیال کی تصدیق و تکذیب کرنا مقصود نہیں کیونکہ میرے موجودہ مبحث سے خارج ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ دماغ کی قدرتی بناوٹ اور اُس کی حالت ذہنی ہمارے فطری افعال پر پورا پورا اثر رکھتے ہیں الغرض جسمانی ساخت کو انسانی حرکات اور ارادوں میں بڑا دخل ہے۔ اس خیال کو قریباً تمام اہل فلسفہ اور اہل تشریح ابدان کے علماء تسلیم کر چکے ہیں۔ اب ہم نئی تحقیقات کے رو سے ہی اس اصل کی صحت کو مرد اور عورت کے قوائے فطریہ پر جانچتے ہیں +

پانچ سال کی عمر تک مرد اور عورت کا تناسب اعضاء چنداں بدلتا نہیں۔ پانچ سال کے بعد مرد اور عورت کے اعضاء میں کسی قدر فرق ہونا محسوس ہوتا شروع ہوتا ہے۔ اور فطرت تذکیر و تانیث کے اختلاف کو زیادہ ظاہر کرنا شروع

کردیتی ہے۔ جوانی میں جب اعضاء پوری دست حاصل کرچکتے ہیں) یہ فرق بدرجۂ غایت محسوس ہوتا ہے۔ عورت اور مرد کے قد میں ۹۸۔ اور ۱۰۰ کی نسبت لڑکپن تک رہتی ہے۔ جوانی میں مرد اور عورت کی نسبت اوسطاً ۱۶۔ اور ۱۵ کی ہوتی ہے۔ وزن کے متعلق کوئی نسبت قائم نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ عورت ۱۶ برس اور مرد ۱۹ برس کے بعد بیقاعدہ ترقی گوشت واعصاب میں کرتے ہیں۔ مگر یہ مانی ہوئی بات ہے کہ عورت کا وزن مرد سے کم رہتا ہے ؎

پیدائش کے وقت مرد کا وزن عورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ ہڈیاں زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ اعصاب زیادہ چست حرکت کی لیاقت رکھتے ہیں۔ عورت میں اعضاء کی گولائی مرد سے زیادہ ہوتی ہے اور گوشت اور ہڈیوں کی نشیب و فراز چربی سے ہموار ہوتی ہے۔ مرد کے اعصاب عورت سے بہت زیادہ زبردست ہوتے ہیں جنکی وجہ سے مرد کی طاقت عورت سے نہ صرف ذاتی بلکہ اضافی حیثیت سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بچپن میں مرد اور عورت کی طاقت کا تناسب ۳۰ اور ۴ کا ہوتا ہے۔ جوان ہوکر ۹۹ اور ۵۵ کی نسبت ہوجاتی ہے اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ نو دس برس کا بچہ ہاتھوں پر کھڑا ہوجاتا ہے اسی عمر کی لڑکی نہیں ہوسکتی۔ عورت میں خون کم اور پتلا ہوتا ہے۔ یعنی خون کی گولیاں جنکو کارپس کلنر کہتے ہیں عورت میں کم اور چھوٹی ہوتی ہیں۔ اس کی مقررہ تعداد مرد میں پچاس لاکھ گولیاں فی مکعب ملی میٹر عورت میں پنتالیس لاکھ گولیاں فی مکعب ملی میٹر ہیں اور مرد میں بڑی ہوتی ہیں۔ مرد اور عورت کے دماغ کے وزن میں ۱۴ اور ۱۲ کی نسبت ہوتی ہے۔ اور یہ نسبت تقریباً ماں کے پیٹ سے لیکر آخر وقت تک رہتی ہے۔ دل کا وزن مرد اور عورت کا ۱۹۔ اور ۱۷ کی نسبت رکھتا ہے۔ اور عورت میں بہ نسبت مرد کے دل زیادہ حرکت کرتا ہے۔ اور اس لحاظ سے

عورت کی نبض فی منٹ ۸۰ دفعہ حرکت کرتی ہے۔ مرد کی ۷۰ دفعہ اور عورت بہ نسبت مرد کے جلدی جلدی سانس لیتی ہے۔ چونکہ عورت کا قد چھوٹا وزن کم۔ دل و دماغ کم وزن کم۔ خون پتلا اور کم ہوتا ہے۔ اِس لئے اسکی خوراک بہ نسبت مرد کے بہت کم ہونی چاہیئے اور یہ در اصل ایسا ہی ہے۔ یہ سب امور عورت کی کمزوری پر دال ہیں ٭

ہر روز کے تجربہ سے یہ ثابت ہے کہ دُنیا کی کشمکش زندگی کی کفالت و آرام خوف و اُمید و خوشی پر تحمل کرنے اور ان تمام حالتوں میں جن میں انسان کی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ اعصاب جسمانی و دماغی مدد دیتے ہیں۔ جس شخص کے اعصاب زیادہ مضبوط اور محفوظ ہوتے ہیں وہ اپنی حالت دوسرے شخص سے زندگی کی کشمکش میں زیادہ لائق ہوتا ہے۔ اختلافات جسمانی کا کچھ اثر عورت اور مرد کی زندگی میں ظاہر ہوتا ہے وہ ہر شخص اپنے ملاحظہ میں لا سکتا ہے۔ ہر ایک شخص یہ بات جانتا ہے کہ عورت کمزور ہوتی ہے اور مرد طاقتور۔ عورت قد میں اوسطاً کم ہوتی ہے۔ مرد لمبا ہوتا ہے۔ لیکن اگر زیادہ غور کیا جائے۔ تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جذبات۔ حواس و حرکات میں بھی عورت اور مرد میں فرق ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ مرد کو اپنے اعضاء کی مضبوطی حرکات کی چستی۔ تیزی۔ طاقت کی زیادتی اور اعصاب کی زبردستی سے اس بات کا یقین دل میں ہوتا ہے کہ انسان کی دونو نوعوں میں زیادہ کارآمد میں ہی ہوں۔ اور یہ تعلیم فطرتی اور موروثی طور پر مرد کے دماغ میں موجود ہے اِسلئے جو ترجیح اس کو قدرت کاملہ نے فی الحقیقت دی ہے۔ اس سے فائدہ اُٹھانا اور عورت کو حتی الامکان اس سے معطل رکھنا جزو مردانگی سمجھتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ قوت فیصلہ۔ ضبط۔ نفاست۔ مذاق اور رائے کی صحت میں مرد عورت پر فائق ہے۔ مگر جذبات و احساس میں عورت مرد پر غالب

ہے ۔ جسمانی خواہشیں مثلاً بھوک ۔ پیاس وغیرہ عورت میں کم ہوتی ہیں اور مرد میں زیادہ ۔ کیونکہ مرد کے اعضاء وسیع ہیں اور غذا کا تقاضا بڑی شدت سے کرتے ہیں ۔ عورت بھوک ۔ پیاس کا تحمل خوب کرتی ہے ۔ ذرا ذرا سی بات پر عورت کو غش آجاتا ہے اسلئے کہ عورت کا احساس بہت تیز ہے بوجہ غفلت اعصاب اس میں جذبات کا تحمل نہیں ہے ۔ عورتوں میں بعض قدرتی لیاقتیں ایسی موجود ہیں جو اس کمی کی تلافی کر دیتی ہیں ۔ عورتیں زندگی کے انقلابات کو بہت اچھی طرح سہار لیتی ہیں ۔ اور اپنی گذران اپنے میلان طبع اور مشاغل کو ان انقلابات کے موافق بنا لیتی ہیں ۔ اگرچہ مرد بھی اس سے عاری نہیں لیکن عورت اس کام کے لئے بنائی گئی ہے اور مرد کو بننا پڑتا ہے ۔ مثلاً بیاہی ہوئی لڑکیاں جلدی اپنے سسرال کی خو بو اختیار کر لیتی ہیں اور مرد گھر داماد بنکر مشکل سے گذارہ کرتا ہے ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مرد کی طبیعت تشریح طلب اور جزو بین ہوتی ہے وہ جو کچھ دنیا میں دیکھتا ہے اسکو ایک اصول کے ماتحت لانا چاہتا ہے مگر عورت اپنے اصول کو ایک دوسرے اور غالب اصول کے ماتحت کر لیتی ہے ۔ اور اس ذریعہ سے اس کمزور مخلوق کی زندگی آرام سے گذر جاتی ہے

(۵) مختلف اقوام کا خیال بھی اس امر کی تائید کرتا ہے ۔ کہ مرد اور عورت کے قوار فطریہ اپنی عملی کارروائی میں ایک ہی معیار نہیں رکھتے بلکہ ہر زمانہ میں مرد اور عورت کے کارنامے علیحدہ علیحدہ حیثیت میں رکھے گئے ہیں ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عورت میں وہ سب قوار فطریہ جو مرد میں پائے جاتے ہیں موجود ہوتے ہیں ۔ مگر ہمیں عموم تناسب میں گفتگو کرنا مناسب ہے جنکی نسبت تاریخی شہادتیں برابر اس امر کی تائید کرتی ہیں کہ عورت فطرتاً اپنے طریق عمل میں مرد کے طریق عمل کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی خاص عورت کسی

جس وصف میں ایسا کمال رکھتی ہو۔ کہ اکثر مرد بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکتے ہوں۔
مگر اس امر سے ہمارے دعویٰ فوقیت مرد میں کچھ فرق نہیں آتا۔ کیونکہ مقابلہ جنس
مرد کا جنس عورت سے ہے نہ کسی خاص مرد کا کسی خاص عورت سے۔ اور ہم
بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہر ایک وصف مرد میں بدرجہ کمال موجود ہوتا ہے اور
عورت میں بدرجہ ناقص بلکہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ مرد میں وہ قویٰ فطریہ بدرجہ کمال
موجود ہوتے ہیں جو قوت فاعلہ کے ذیل میں آ سکتے ہیں مگر وہ قوائے فطریہ جو قوت منفعلہ
کے ذیل میں شمار ہوتے ہیں عورت میں بدرجہ کمال موجود ہوتے ہیں اور مرد میں بدرجہ
ناقص اور مرد کی فوقیت کے ثابت کرنے کا مدار صرف اسی امر پر ہے کہ وہ قوتِ
فاعلہ میں عورت کی نسبت زیادہ کمال رکھتا ہے۔ کیونکہ فوقیت کسی کمال پر موقوف
ہوتی ہے اور کمال قوتِ فاعلہ کا نتیجہ ہے نہ قوتِ منفعلہ کا۔ مثلاً وصف شجاعت
میں جب مرد اور عورت کی نسبت گفتگو کی جائے تو ہم بڑے تجربہ اس امر کو
پایہ ثبوت تک پہنچا سکینگے کہ جنس مرد کے کارنامے لاکھوں گنا جنس عورت کی
نسبت بڑھے ہوئے ہیں۔ علیٰ ہذا جب وصف استقلال رائے میں گفتگو کریں
تو بھی مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ تجربہ اس امر پر شاہد ہے کہ
عورت بہت جلد اپنے مرکز رائے سے ہٹ جاتی ہے۔ اور یہ امر مسلم ہے کہ وصف
شجاعت اور استقلال رائے ہر دو قوت فاعلہ کا نتیجہ ہیں نہ قوت منفعلہ کا۔ کیونکہ
قوتِ منفعلہ کا عمل یہ ہے کہ وہ کسی خارجی چیز کے اثر سے صاحب قوت کے اثر
کو قبول کرنے کا موقعہ دے۔ چنانچہ شجاعت کی ضد جبن اور استقلال رائے کی ضد
تغیر الرائے کا مادہ عورت میں بڑھا ہوا ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا امر ہے جو آجکل
روزمرہ تجربہ و مشاہدہ میں پایہ ثبوت تک پہنچ چکا ہے۔ اخلاقی کمزوری عورت
میں مرد کی نسبت بالعموم ہے۔ چونکہ معترض اس مقام پر اعتراض پیش کر سکتا

ہے کہ صدیوں کی طرز معاشرت نے جو عورتوں کو محدود الاختیار رکھا ہے اور عورتوں کو ایسا بنادیا ہے - اگر مردوں کی طرح انہیں وسیع اختیار دیا جائے تو عورتیں مردوں کی طرح ہر ایک وصف میں کامل ثابت ہوں - اسلئے ہم صرف اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ تک محدود نہیں رہنے بلکہ اس امر کے متعلق ہم ایسے زمانے کے تاریخی کارناموں کی طرف رجوع کرتے ہیں جس میں عموماً انسانی تمدن وطرز معاشرت کے قوا عد کی پابندی مرد اور عورت کو یکساں طور پر کرنا ضروری تھی - یا یوں کہو کہ جو جائز اختیارات مرد کو حاصل تھے وہی عورت کو بھی حاصل تھے - مگر اس زمانہ کے کارناموں کی فہرست میں بھی مردوں کے نامور لوگوں کی تعداد عموماً عورتوں کی نسبت بڑھی ہوئی نظر آتی ہے - ایسے تاریخی نظائر کے متعلق میرے خیال میں اہل عرب کی تاریخ کی طرف ہمیں رجوع کرنے سے زیادہ سہولت ہوگی - کیونکہ انسان کی مفصل تاریخ مل سکنے کا زمانہ لگ بڑھ دو ہزار برس سے زیادہ متجاوز نہیں ہوسکتا اور اس سے پہلے زمانے کے تاریخی حالات پر ایک عام تاریکی کا کمبل تنا ہوا ہے - اور اگر کچھ حالات مل سکتے ہیں تو وہ نہایت ہی مشتبہ ہیں - اور آسمانی کتب زیادہ تفصیل نہیں کرتیں - اہل عرب کو میں نے اسلئے مخصوص کیا ہے کہ منجملہ دیگر اقوام کے یہ زیادہ عاری تھے - اسلئے قرین قیاس ہے کہ فطری جذبات کا ظہور بروجہ کمال ہوتا ہوگا چنانچہ تاریخ اسکی موید ہے - ایسے حالات میں یہ بالکل صحیح ہے کہ مرد اور عورت کو بلا لحاظ کسی قسم کے قانون ملکی اور احکام شرعی اپنے طبعی مقتضیات کے اظہار کا موقع ملتا ہوگا - پس اسی صورت میں مرد اور عورت کے کمالات کا مقابلہ بھی صحیح ہوسکتا ہے - کیونکہ زمانہ تہذیب و تمدن میں اس زمانہ کو معترض قطعی تسلیم نہیں کرسکتا بلکہ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مذہبی احکام کی پابندی نے مرد اور عورت میں فرق پیدا کردیا ہے اور اگر انہیں یکساں حقوق

بٹے جاتے تو یکساں کمالات کے مالک ہوتے۔

اس قسم کا مقابلہ صرف اہل عرب ہی سے مخصوص نہیں بلکہ ہر ایک قوم کی ابتدائی حالت میں جبکہ تہذیب و ترقی کا پرتو ان پر نہ پڑا ہو ممکن ہے کیونکہ تمام قومیں ابتدائی حالت میں قریبًا قریبًا ایک سی ہوتی ہیں مگر اہل عرب بالخصوص اپنی فطری حالت کے صدیوں تک پابند رہے ہیں اور کسی قسم کی بیرونی حکومت سے متاثر نہیں ہوئے جو انہیں انکی طبعی روش سے علیحدہ کر دیتی اور انکی طبعی روش جیساکہ زمانہ جاہلیت کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے یہ تھی کہ مرد اور عورت کے فرائض میں ایک نمایاں حد فاصل قائم تھی جس سے ایک فلسفی دماغ کا آدمی سمجھ سکتا ہے کہ اس حد فاصل کا قائم کرنا کسی ملکی یا مذہبی دباؤ کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ اس قانون فطرت پر مبنی تھا جس کو خداوند کریم نے اپنی حکمت کاملہ کے رو سے مرد اور عورت کی جسمانی اور روحانی تربیت کے لئے ایک خاص تناسب پر قائم کیا ہے۔ یہ خیال کہ صرف کسی ناترقی یافتہ زمانہ میں مرد اور عورت کے فطری قوٰی کو یکساں حالت میں تسلیم نہیں کیا گیا۔ ہر ایک زمانے کے مردوں اور عورتوں پر امتحانًا دیکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جن ممالک میں علوم و فنون کو آج پوری ترقی حاصل ہے اور عورتوں کو بلا امتیاز مردوں کے ساتھ ملکر یکساں طور پر ترقی کرنے کا حق حاصل ہے وہاں بھی مرد اور عورت کے عملی نتائج ایک ہی درجے پر تسلیم نہیں کئے گئے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ فطرت ہر ایک کو اسکی طبعی حالت سے آگے متجاوز نہیں ہونے دیتی اسلئے ہمارا یہ دعوٰی کہ مرد اور عورت کے حقوق کو یکساں ملحوظ نہیں رکھا جانا چاہئے عین منشار فطرت کے مطابق ہے اور جو شخص اس بداہت کا انکار کرتا ہے اس کو چاہئے کہ دلیل پیش کرے محض یاوہ گوئی سے کوئی بات ثابت نہیں ہو سکتی۔ بقینًا ہمارے دعوٰی کا منکر ایک ایسے پہلو کو اختیار

کرتا ہے جس کے ثبوت سے وہ کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ جبکہ ہم بالمشاہدہ اس امر کا یقین رکھتے ہیں کہ ایک ہی نوع کے افراد کائنات ہیں گوناگونی تمیز کا ہونا فطرت کے لا انتہاہی عجائبات کا یقینی ثبوت ہے۔ تو کیونکر ہم اس امر کو صحیح تسلیم کرسکتے ہیں کہ ایک ہی نوع کے مذکر و مؤنث کی فطرت میں کچھ تفاوت نہیں رکھا گیا۔ انّ ھٰذا لشیئٌ عجاب ؎

(۶) اب آؤ ذرا اہل فلسفہ کی بکواس سے ہٹ کر جناب باری عز اسمہٗ کے کلام پاک سے اس دعوےٰ کے متعلق دلائل کا پتہ لگائیں جو بمضمون انہ لقول فصل وما ھو بالھزل قطعی فیصلہ ہے اور جس پر ہمارا ایمان کوہ ہمالیہ کی جڑوں سے بھی کہیں زیادہ مضبوط ہے ولوکرہ الکافرون۔ قرآن پاک میں مرد اور عورت کی فطرت کو بالکل واضح الفاظ میں متفاوت بیان کیا گیا ہے اور جس میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔

(۱) باآنکہ احکام شرعی کی پابندی کی مرد اور عورت کو یکساں تکلیف دی گئی ہے مگر جا بجا خطاب امر و نواہی مردوں کو کیا گیا ہے اور اسی خطاب میں عورتیں بھی داخل سمجھی جاتی ہیں۔ یاایھا الذین امنوا۔ اقیموا۔ اتوا۔ اتقوا۔ یتقون۔ منفقین۔ اسجدوا۔ ارکعوا۔ لا تقربوا قولوا۔ لا تدخلوا۔ وغیرہ ذالک۔ صرف مذکر صیغے ہیں۔ مگر عورتیں اس مفہوم میں شامل ہیں اور یہ امر صحیح طور پر دلالت کرتا ہے کہ مرد کو عورت پر فضیلت ہے۔ اور منشار فضیلت تفاوت فطرت کے سوا اور کیا ہے۔ بعض مواقع پر عورتوں کو علیحدہ بھی خطاب ہوا ہے۔ مگر وہ محل ہی بالخصوص عورتوں کی تصریح کا تھا ؎

(۲) ایک مرد کی شہادت کو وہی وزن دیا جاتا ہے جو دو عورتوں کی شہادت گواہی کی وجہ بجز عورت کے ضعیف الفطرۃ ہونے کے اور کیا ہوسکتی ہے۔ اور

ا ینہمہ عورت کی نسبت علیحدہ حکم دیا کہ اگر ایک ادائے شہادت میں غلطی کر جائے تو دوسری اُسکو یاد دلائے۔ مگر مرد کی نسبت بالتصریح ایسا نہیں کہا جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ عورتوں کو قواء دماغیہ مردوں کے برابر نہیں دئے گئے۔

(۳) تقسیم وراثت میں مذکر اور مؤنث کی نسبت حصص کو للذکر مثل حظ الانثیین کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ اس حکم میں گو دیگر اسرار مخفی ہیں۔ جو ہمارے اس مبحث سے غیر متعلق ہیں۔ مگر مرد کے فطرۃً قوی الاستحقاق ہونے پر بھی ہے جس سے اس کی ترجیح عورت پر ثابت ہوتی ہے۔

(۴) طلاق کا اختیار صرف مرد ہی کی ذات تک محدود ہے اور یہ مرد کی فضیلت پر صریح طور پر دلالت کرتا ہے اور اس حکم میں جو بیشمار مصالح مدنظر ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ عورت مرد کی نسبت ضعیف الفطرۃ ہے بات بات پر بگڑ کر غیر مستقل الرائے ہو جاتی ہے مگر مرد وسیع حوصلہ اور زیادہ انجام بین ہوتا ہے اسلئے سوا مجبورانہ حالت کے کبھی طلاق پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اگر ہمارے بعض کج اندیش اور ناواقفان شریعت کی رائے پر عمل کر کے طلاق کا اختیار مرد اور عورت کو یکساں طور پر دیا جاوے۔ تو غالبًا اسی فیصدی عورتیں ہیں جو نکل بھاگیں گی[1]۔ اور اس کی وجہ بجز ان کی کمزوری فطرت کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ وہ حالات جن میں عورت کو بھی طلاق حاصل کرنے کا اختیار حاصل ہے وہ خاص صورتیں ہیں۔ ان سے ہمارے دعویٰ میں فرق نہیں آتا۔

(۵) قرآن مجید نے کسی عورت کے نبی ہونے کی خبر نہیں دی۔ اور نہ کسی دیگر آسمانی کتاب میں کسی عورت کا نبی ہونا مذکور ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ نبوت

---

[1] بعض ایسے حضرات یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر تعلیم نسواں کی ترقی ہو جاوے تو عورتوں کو اس قسم کی دوری کا موقع نہیں ملیگا۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ فطرت کو بدلنا محال ہے ہمیں کئی ایک ایسی مثالیں معلوم ہیں کہ پڑھی مہذب عورتیں بدکار ثابت ہوئی ہیں۔ ممالک مغربی کی حالت کو دیکھو تو جہاں تہذیب کا آفتاب چمکتا ہے مگر اولاد الزنا کی وہ کثرت ہے کہ توبہ ہی بھلی ۱۲ منہ

ایک منصب عظیم ہے جس کے انصرام کے لئے تمام قوائے فطریہ کا بوجہ کمال مخلوق ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ تمام انبیاء علیہم السلام ظاہری اور باطنی قوا میں اپنے دیگر ابنائے جنس سے بڑھے ہوئے تھے۔ کتب سیر و احادیث میں اس کی بہتیری مثالیں ملینگی ؛

(۶) قرآن مجید میں صاف لکھا ہے الرجال قوامون علے النساء جس سے بالکل مسئلہ زیر بحث کی توضیح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مردوں کو عورتوں پر تسلط کرنا اور انہیں ان کی ہر ایک قسم کی بہبودی کا متکفل قرار دینا اس امر کی صاف دلیل ہے کہ مرد کو عورت پر فطرۃً فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ کامل کو ناقص پر غالب رکھنا بالکل قانون فطرت کے مطابق ہے مگر برعکس کبھی نہیں ہوتا ؛

(۷) قرآن مجید میں لکھا ہے ولا تنسوا الفضل بینکم - ان الفاظ سے تو قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ مرد کو خداوند کریم نے عورت پر فضیلت بخشی ہے ؛

(۸) قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے اَوَمَنْ ینشؤ فی الحلیۃ وھو فی الخصام غیر مبین - اس آیت سے بھی حسب شرح صدر وہی بات ثابت ہوتی ہے ؛

(۹) قرآن مجید فرماتا ہے نساؤکم حرث لکم - ان الفاظ میں مرد اور عورت کی جو حیثیت بیان کی گئی ہے وہ لفظ حرث (کھیتی) سے بخوبی ظاہر ہے کیونکہ مالک اور مملوک کا تعلق صاف طور پر مرد کی فضیلت پر شاہد ہے ؛

(۱۰) قرآن مجید فرماتا ہے اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ گو یہ جملہ حکایتاً جناب باری نے ارشاد فرمایا ہے مگر اس کی تصدیق میں تجربہ و مشاہدہ کافی دلیل ہے جس سے عورت کی کمزوری

لہ کفار فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے انکے اس خیال سے رد میں خداوند تعالےٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ عجیب جاہل لوگ ہیں کہ اپنے لیے تو بیٹا پسند کرتے ہیں اور خدا کے لئے بیٹی حالانکہ خدا بیٹے اور بیٹی ہر دو سے بری ہے اور اس آیت میں فرمایا کہ اناث کو جو زیوروں میں پرورش پاتی ہیں اور قوت بیانیہ سے بالکل بے بہرہ ہوتی ہیں خدا کی اولاد قرار دیتے ہیں - یعنی اول تو خدا کی اولاد قرار دینا اور پھر اولاد بھی بیٹیاں جو فطرتاً ناقص ہوتی ہیں ۱۲ منہ

فطرت کا ثبوت ملتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ قرآن نے شیطان کے کید و مکر و حیلہ کو ضعیف کیا ہے ٭

(۱۱) قرآن مجید نے نعمائے بہشت کے بیان میں حور کا بیان کیا ہے۔ جن کا وعدہ متقی اور پرہیزگار لوگوں کے لیئے ہوا ہے۔ مگر کہیں عورتوں کے لیئے نوجوان خوبصورت شوہروں کا ذکر نہیں آیا۔ گو ضمناً یہ امر ثابت ہے کہ پاکباز نیک عورتوں کو نیک مردوں کے ساتھ رہنا ہوگا۔ مگر مردوں کے لیئے بالاہتمام اس امر کا ذکر کرنا مرد کی فضیلت کو ظاہر کرتا ہے ٭

(۱۲) سلسلۂ بنی آدم کے آغاز میں پہلے مذکر کا وجود ہے اور عورت کا بعد والفضل للمتقدم ٭

مذکورہ بالا وجوہ ایسے ہیں جو میرے دعوے کے ثبوت میں حجت قاطعہ ہیں جس میں کسی کو کلام کا موقع نہیں ملسکتا۔ اب ناظرین ذرا انصاف کریں کہ ہم قرآن مجید کی سنیں جسکی تائید میں تجربہ اور مشاہدہ بھی موجود ہیں یا کسی لغوگو کی بکواس کو جو نہ تو شریعت آسمانی سے ثابت ہے نہ بروئے فطرت انسانی۔ اور غور کرو تو شریعت اور فطرت کوئی دو چیزیں نہیں بلکہ وہ فی الحقیقت ایک ہی ہیں تتبع آیات سے ممکن ہے کہ کوئی صاحب اور بھی وجوہ تجویز کرسکیں ٭

ایک دفعہ ایک نیچری نے اپنے ایک مضمون میں عورت کو مرد پر فضیلت دیتے ہوئے قرآن مجید کی آیت ولیس الذکر کالانثی[1] کو بیان کیا تھا۔ اول تو یہ لوگ ہمیشہ ایک ٹیڑھی بات پیش کرنے کے عادی ہیں اور ملحدان یورپ کو مثابلہ کلام الٰہی حجت تسلیم کرکے اللہ اور اللہ کے رسول برحق کے کلام کی تکذیب کرنا اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ دوم بڑی بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو بلا علوم عربیہ حل کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود بھی گمراہ ہوجاتے ہیں

[1] نہ مرد عورت کی طرح نہیں ہوا منہ

اور بیچارے ناواقفوں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ۰

اِن الفاظ سے ہرگز مدعی کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا - یہ آیت عمران والد مریم کی بیوی کے قصہ میں وارد ہوئی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ والدہ مریم علیہا السلام نے نذر مان رکھی تھی کہ خدایا اگر میرے ہاں بیٹا ہوگا تو میں اسے بیت المقدس کی خدمت میں لگا دونگی - تقدیر الٰہی سے لڑکی (مریم) پیدا ہوئی تو آپ کو رنج ہوا اور دل میں کہا کہ خدایا یہ تو لڑکی ہے اب کیا ہو - اس پر خداوند کریم نے بطور اظہار امر واقعہ اس امر کو بیان کیا ہے کہ عمران کی بیوی اظہار افسوس کرتی ہے - مگر اسکو یہ معلوم نہیں کہ جس مذکر مفروض کی وہ اُمید کرتی تھی یہ مونث (لڑکی) اس سے کہیں بہتر ہے - کیونکہ جو مصلحت خداوند کریم کو اس لڑکی کے پیدا کرنے میں مدنظر تھی وہ لڑکا ہونے کی صورت میں پیدا نہ ہوتی - اس لئے خداوند کریم کی حکمت کاملہ اسی کی مقتضی تھی - گویا مطلب یہ ہے کہ یہ خاص لڑکی جو پیدا ہوئی ہے بہ نسبت اس خاص لڑکے کے جس کی خواہش زوجہ عمران کرتی تھی بھلی ہے -

مدعی نے الف و لام عہد کی حقیقت کو تو سمجھا نہیں مگر غلط استدلال سے عوام الناس کو دھوکا دینے بیٹھ گیا ۰ الغرض اس آیت سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ مطلق عورت کو مطلق مرد پر فضیلت ہے. بلکہ خاص مونث اور خاص مذکر کا مقابلہ کیا گیا ہے اور اِس لئے ہم نے شروع مضمون میں لکھ دیا ہے کہ مرد کو عورت پر فضیلت دینے میں جنس کا مقابلہ جنس سے کرنا مقصود ہے نہ کسی خاص مرد کا کسی خاص عورت سے - کیونکہ یہ امر بالکل واضح ہے کہ سینکڑوں ایسی لطیف الفطرت عورتیں ہیں جو سینکڑوں جاہل اور کمزور فطرت مردوں پر فضیلت رکھتی ہیں مگر اس سے ہمارا دعویٰ باطل نہیں ہوتا ۰

مذکورہ بالا سطور سے ہم اس نتیجہ تک بآسانی پہنچ سکتے ہیں کہ جب مرد

اور عورت کی فطرت ایک نہیں بلکہ ہر دو میں نمایاں تفاوت موجود ہے۔ تو کیسے ہو سکتا ہے کہ تمدن و معاشرت کی ضرورتوں میں ہر دو کے حقوق کو یکساں بیان کیا جائے بلکہ جس فطرت نے ہمیں ان میں ایسے تفاوت کا علم دیا ہے وہی فطرت ہمیں یہ بھی سبق دیتی ہے کہ ہر دو کے حقوق میں ایک حد فاصل قائم ہونی چاہیے۔ اور اگر تم اس تفاوت حقوق کو تسلیم نہیں کرتے اور ہر دو کو بلا امتیاز ایک ہی ترقی کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہو تو کوشش کرو کہ مرد بھی بچے جنا کریں۔ اور اگر تم اس امر کو قواعد فطرت کے رو سے ناممکن خیال کرتے ہو تو باقی کے دوسرے صفات خلقیہ میں ہر دو کو کیوں مساوی رکھتے ہو

اسلام میں رہبانیت نہیں

جس شخص نے قبل از اسلام مروجہ مذاہب اہل عالم پر کبھی غور کیا ہوگا۔ اسے معلوم ہوگا کہ شریعت اسلام کے احکام خواہ عبادات کے متعلق ہوں خواہ معاملات کے متعلق سب میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ نہ تو کوئی ایسا حکم شدید ہو کہ بجز خاص خاص طبائع کے اس کی پابندی سے عام طور پر بعض افراد معذور رہیں اور نہ ایسا نرم اور آسان ہو کہ نفس کو اس کے بجا لانے میں وہ ضروری مشقت برداشت نہ کرنا پڑے جو نفس کی بے اعتدالیوں کی روک تھام کے

ؔ ممکن ہے کہ کوئی کج فہم یہ اعتراض کرے کہ یہ تو قیاس مع الفارق ہے کیونکہ مرد میں ... قابلیت ہی نہیں اور عورت میں ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ قیاس مع الفارق نہیں کیونکہ جس طرح کسی ... نہیں لا سکتے اسی طرح ناقص فطری کو ہم کامل نہیں بنا سکتے۔ اسلئے جہاں فطرۃً مرد کے ... نقصانات کو تعلیم و تربیت سے بلا عیکمالی پورا نہیں کر سکتی۔ مگر مرد ... فطری اور نقصان فطری میں ہے ... عورت کو چونکہ تولید لازمی ہے اور بچہ قریباً دو اڑھائی سال تک ... خون چوستا رہتا ہے۔ جس لئے اسکے فطری نقصان میں اور بھی زیادتی ہو جاتی ہے اور خون کو ... کی طاقت میں دخل ہے اسے اصول طب جاننے والے بخوبی جانتے ہیں ۱۲ منہ

لئے واجب ہے۔ شریعت اسلامی انہیں احکام پر مشتمل ہے جن پر سابقہ انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں مشتمل تھیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ احکام جن میں کچھ شدت تھی یا کسی نے انہیں اصلی صورت سے کسی دوسری صورت میں بدل دیا تھا۔ اسلام نے انہیں دنیا کے سامنے سہل کر کے پیش کیا یا متبدل احکام کو انکی اصلی صورت میں ظاہر کیا۔ حاصل یہ ہے کہ اسلامی احکام شریعت نہایت معتدل اور متوسط واقع ہوئے ہیں قال اللہ تعالےٰ "وکذلک جعلنکم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علے الناس"

دین و دنیا کے تعلقات کو اسلام نے اس خوبی کے ساتھ جمع کیا ہے کہ کوئی اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم اس سے بہتر احکام نہیں بنا سکتی۔ دنیا پرست قوموں نے دین کو فراموش کر دیا اور آخرت سے انکار کر کے حظوظِ نفسانی میں مبتلا ہو گئیں۔ اور تارکانِ دنیا نے انسانی قوتوں کو معطل چھوڑ دیا جس سے وہ تمدن اور اخلاق کی ضرورتوں کو جن کے بغیر تکمیل نفس نہیں ہو سکتی بالکل انداز کر دیتے ہیں۔ اسلام ان ہر دو قسم کے خیالات کو برا سمجھتا ہے۔ اگر دنیا پرست لوگ دماغی اور جسمانی قوتوں کو عمل میں لا کر حصولِ لذات کے پیچھے لگے رہتے ہیں تو کچھ شک نہیں کہ روحانی قوتوں کو ضرور معطل چھوڑ دیتے ہیں اور روحانیت کے مقامات سے بالکل محروم رہتے ہیں اور اسلئے انہیں معرفت ذات باری سے کچھ تعلق نہیں۔ ایسی قومیں حیوانات اور جمادات سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتیں یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے مولےٰ سے عمر بھر ناآشنا رہ کر بالآخر مردار ہو جاتے ہیں اور "من کان فی ھٰذہٖ اعمیٰ فھو فی الاٰخرۃ اعمیٰ" کا صحیح مورد ہیں۔ برخلاف انکے تارکانِ دنیا کی یہ حالت ہے کہ بظاہر ترک دنیا کرتے ہیں مگر درحقیقت نہ تو دنیا ان سے چھوٹتی ہے اور نہ وہ دنیا کو چھوڑ سکتے ہیں ترک دنیا محض ایک لفظ ہے جس کا مصداق ناممکن ہے۔ ہر ایک قوم میں ایسے لوگ ہوتے آئے ہیں جو ترکِ دنیا کی تعلیم دیتے رہے اور باوجود قطع تعلقات کے

اپنے مصارف زندگی کا بوجھ دوسروں کے سر پر ڈالتے رہے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اصولِ تمدّن کے رُو سے ایسے لوگ بہت مضر ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ تمدّن کی فطرت میں امداد و استمداد کا مفہوم داخل ہے۔ اور یہ لوگ غیروں سے استمداد تو کرتے ہیں مگر کسی قسم کی امداد نہیں کرتے۔ اس لئے ان کا وجود کسی صورت میں بھی نوعِ انسان کے لئے مفید نہیں ہے۔ اس قسم کی بے معنی رہبانیت اہلِ کتاب نے اختیار کرلی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے بالفاظ "ورھبانیۃ ابتدعوھا" اہلِ اسلام کو اس سے روک دیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ان لوگوں نے اپنی فطرت سے اس کو رواج دینا شروع کردیا۔ اللہ تعالےٰ کو فطرتِ انسانی کا دینی اور دنیاوی کمالات میں ترقی کرنا منظور تھا۔ اور رہبانیت سے قوائے فطریہ کا معطل چھوڑنا لازم آتا ہے۔ اور جو مذہب اس قسم کی تعلیم دے انسانی کمالات کے لئے سخت مضر ثابت ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ بعض اہلِ اسلام بھی اپنی جہالت سے رہبانیت کے مؤید ہیں اور اس کو معرفت ذاتِ باری کا ذریعہ گردانتے ہیں۔ حالانکہ تعلیم قرآن و سنّت کے منشاء کی صریح خلاف ورزی ہے۔ قرآنی تعلیم نہایت زور کے ساتھ ایسے غلط خیال کو رد کرتی ہے۔ قرآن مجید اور سنّت میں جہاں دُنیا اور دُنیا کی لذّتوں اور آرائشوں کی مذمّت وارد ہے وہاں یہ سمجھنا کہ اسلامی شریعت قطعِ تعلّقات کا حکم دیتی ہے سراسر جہالت اور سخت نادانی ہے بلکہ اس مذمّت کا اصل منشاء یہ ہے کہ وہ لوگ جو دُنیا کی لذّتوں میں مبتلا ہوکر آخرت کو بھول جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور فرائض و سنن کی پابندی نہیں کرتے اس امر سے آگاہ ہو جائیں کہ دنیوی لذّتیں فی الحقیقت انسان کے لئے کوئی حقیقی کمال نہیں ہو سکتیں بلکہ یہ سب عالمِ آخرت کی صلاح و فلاح کے اسباب ہیں۔ چونکہ غفلت انسانی فطرت میں داخل ہے اس لئے بار بار ان

ناپائدار لذّتوں کے انجام سے اِنسان کو آگاہ کیا گیا تاکہ وہ چشمِ بصیرت سے اپنے مقصود بالذّات کو دیکھ لے اور اِن اسباب سے بروجۂ شریعت متمتع ہو سو اس خیال پر دُنیا کی مذمّت واقعی صحیح خیال ہے۔ مگر یہ مطلب نہیں کہ تم دُنیا سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ جاؤ۔ تجربہ سے ثابت ہے کہ جس شخص کو سامانِ معیشت بافراغت میسّر نہیں آتا وہ ہمیشہ امورِ دین میں ادھورا یا بالکل قاصر رہتا ہے۔

ابن جوزی رحمہ اللہ اپنی کتاب تلبیس ابلیس میں ایسے جاہل تارکانِ دُنیا کی نسبت لکھتے ہیں کہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو قرآن و سُنّت سے بےخبر ہوتے ہیں کسی سے دُنیا کی مذمّت سُنکر اِس بات پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ دُنیا کو ترک کردیں اور وہ یہ نہیں جانتے کہ اُس دُنیا سے جس کی مذمّت کی جاتی ہے کیا مراد ہے؟ ایسے لوگ اس خیال پر دُنیا کو ترک کر دیتے ہیں کہ آخرت میں انہیں نجات مِلجائیگی۔ سو وہ یونہی وحشیوں کی طرح مُنہ اُٹھا کر پہاڑوں میں نِکل جاتے ہیں اور جمعہ و جماعت اور مجلسِ علم سے علیحدہ ہو کر وحشی بن جاتے ہیں اور شیطان اُنکے ذہن میں یہ بات جما دیتا ہے کہ یہی زُہد کی حقیقت ہے اور اِس روش کے ساتھ جب کسی بزرگ کی نسبت بھی ایسا سُن پاتے ہیں تو اُن کا یہ خیال اور بھی پختہ ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسا شخص اپنی اولاد کی بھی کچھ پروا نہیں کرتا اور والدین کی بھی کچھ نہیں مانتا۔ اور اِن سب کے حقوق کو نظر انداز کرکے عزلت اختیار کر لیتا ہے۔ حالانکہ حقوق العباد نہایت ضروری ہیں جن کی نسبت قرآن و سنّت میں بڑی تاکید آچکی ہے مگر یہ سب خرابی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ایسے شخص کو علم نہیں ہوتا۔ اگر وہ کسی اہل شریعت کے پاس بیٹھا ہوتا تو اِس امر کو سمجھ لیتا کہ دُنیا فی حد ذاتہا کوئی بُری چیز نہیں بھلا وہ چیز کیونکر بُری ہو سکتی ہے جس کی نسبت اللہ تعالےٰ بار ہا اپنے بندوں

بنا اظہار احسان کرتا ہے اور انسان کے لئے ایسے اسباب اس میں موجود ہیں جن سے وہ اپنی دینی و دنیوی زندگی کی اصلاح کر سکتا ہے بلکہ حصول معرفت الٰہی کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ کیونکہ علم و عبادت بدوں اسکے ممکن نہیں۔ ہاں مذموم امر فقط یہ ہے کہ انسان اسباب دنیوی میں خلاف شریعت تصرف کرے جس سے نفس کو محض حصول لذت اور رعونت مدنظر ہو جیسے اکثر اہل دنیا کا وتیرہ ہے۔ ایسے شخص کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس طرح بے زاد و توشہ جنگلوں اور پہاڑوں میں چلے جانا خلاف شریعت امر ہے۔ جناب رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم قبل از بعثت غار حرا میں اپنا زاد و توشہ گھر سے لیجا کر عبادت الٰہی میں مشغول ہوا کرتے۔ موسیٰ علیہ السلام جب خضر علیہ السلام کے ملنے کو گئے تو مچھلی وغیرہ اپنی غذا کا سامان ساتھ لے گئے۔ اصحاب کہف جب ظالم مشرک سے بھاگ کر ایک غار میں جا چھپے تو انکے پاس اپنے زاد کے لئے دراہم موجود تھے بعض سلف سے مروی ہے کہ وہ عبادت کے لئے پہاڑ پر چلے گئے تو سفیان ثوری رحمہ اللہ انہیں اور انہیں ساتھ شہر کو لے گئے۔ بعض زاہدوں کی نسبت مروی ہے کہ انہوں نے حلوا کھانا ترک کر رکھا تھا محض اس خیال پر کہ مجھ سے اس نعمت کا شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ خواجہ حسن بصری رحمہ اللہ نے سن کر کہا کہ یہ شخص احمق ہے۔ کیا یہ سرد پانی کا شکر ادا کر سکتا ہے؟ سفیان ثوری علیہ الرحمۃ جب سفر کو جاتے تو اپنے ساتھ گوشت بریاں، درفالودہ اور نفیس غذا لیجایا کرتے۔ کیا نہیں ایسی باتوں سے زہد باطل ہو سکتا ہے؟ انسان کو یہ یقین کر لینا چاہئے کہ نفس بمنزلہ سواری کے ہے۔ اس کے ساتھ اعتدال سے سلوک کرنا چاہئے تاکہ منزل پر پہنچے ضروری ہے کہ مفید چیزوں کو بروجہ شریعت حاصل کرے اور ضرر سے بچتا رہے مثلاً پیٹ بھر کر کھانا منع ہے کیونکہ قرآن مجید نے اس کی ممانعت کی ہے اور

حصول لذت کا دلدادہ نہ ہو جائے۔ کیونکہ اس سے بالآخر بدن کو اذیت پہنچتی ہے اور دین میں بھی مضر ہے ٭

بعض لوگ زہد کے مفہوم میں ان امور مسنونہ کو بھی ترک کر دیتے ہیں جو انسان کے کمال کا موجب ہیں۔ مثلاً عام طور پر نکاح اور خانہ داری کو منافی محبت الٰہی خیال کیا گیا ہے اور کئی ایک جاہل متصوفہ اپنے معتقدین کو انہیں خیالات کی تعلیم دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسے خیالات مخالفت قرآن و حدیث پر مبنی ہیں۔ قرآن مجید نے بیوی کو مردوں کے لئے بطور اظہار احسان کے ذکر فرمایا ہے قال اللہ تعالیٰ جعل لکم من انفسکم ازواجا .... الخ یعنی اللہ تعالےٰ نے تمہیں میں سے تمہارے لئے جوڑے پیدا کئے ہیں تاکہ تم ان سے آرام پاؤ اور تم میں مودت اور رحمت پیدا ہو۔ غور کرو کہ انسانی تمدن و معاشرت کی صحت کے لئے نکاح کس قدر مصلحتوں اور رغبتوں کا جامع ہے اور جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں کہاں تک شریعت اور عقل کے پیچھے لاٹھی لئے پھرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ مروی ہے کہ جناب پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک دینار وہ ہے کہ تم خدا کی راہ میں صرف کرتے ہو۔ ایک دینار وہ ہے کہ تم صدقہ کرتے ہو۔ ایک دینار وہ ہے کہ غلام کے لئے خرچ کرتے ہو۔ اور ایک دینار وہ ہے جو تم اپنے اہل و عیال پر صرف کرتے ہو۔ سب سے افضل وہی دینار ہے جو اپنے اہل و عیال پر صرف کرتے ہو۔ اور حضرت عمرؓ کی نسبت مروی ہے کہ آپ فرماتے کہ اگر میں ایسی حالت میں مر جاؤں کہ اپنی محنت و سعی سے روزی تلاش کر رہا ہوں تو مجھ کو اس سے زیادہ پسند ہے کہ خدا کی راہ میں غازی ہو کر مروں ٭

بھلا نکاح کی مصلحت کو شریعت حقّہ کیونکر نظر انداز کر سکتی تھی جبکہ خود ان کی سنّت میں نکاح کو بتاکید ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا "تناکحوا تناسلوا

نکاح کرو اور نسل بڑھاؤ ٭

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض متصوفہ ترک نکاح کی تلقین کرتے ہیں اور خود بھی نکاح سے محترز رہتے ہیں تاکہ زاہد مشہور ہوں اور عوام الناس ایسے صوفی کی بہت تعظیم کیا کرتے ہیں جس کے ہاں بیوی نہ ہو۔ چنانچہ بارہا ایسے لوگوں سے سنا گیا ہے کہ فلاں بزرگ نے عمر بھر کبھی عورت کی شکل بھی نہیں دیکھی حالانکہ یہ رہبانیت ہے جس کو اسلامی شریعت قطعاً جائز نہیں رکھتی ٭

مگر تعجب خیز یہ امر ہے کہ انہیں حضرات میں سے بعض لوگوں کی نسبت نہایت دردناک واقعات گوش زد ہوتے ہیں اور بالآخر ذلیل ہو کر اپنی عاقبت تباہ کر لیتے ہیں چونکہ قانون شرعی کی مخالفت کرتے ہیں اور قوائے فطریہ کو ان کے مقتضےٰ سے روکتے ہیں لئے ضروری ہے کہ وہ ایسی پاداش میں مبتلا ہوں۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ کم علم اور جاہل متصوفہ نے حقیقت شریعت کو نہ سمجھ کر اس قسم کے بیہودہ خیالات لوگوں کے ذہن نشین کر دئے ہوتے ہیں اور شریعت پر عامل ہونے کو زہد کا منافی قرار دیتے ہیں حالانکہ زہد کی حقیقت صرف یہ ہے کہ دنیوی لذات میں پڑ کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے دور نہ جا پڑے اور بجز محبت الٰہی کے کسی دوسری چیز سے ایسی وابستگی پیدا نہ کر لے جس سے مقاصد شرعیہ میں خلل آئے۔ اگر جاہل اور کم علم لوگ اس قسم کے خلاف شریعت خیالات کو رواج نہ دیتے تو تصوف کبھی بدنام نہ ہوتا۔ حالانکہ اوائل متصوفہ کی تعلیم میں ایسی باتیں ہرگز نہیں تھیں بلکہ وہ جابجا اس امر کی تصریح کرتے ہیں کہ محافظت باطن کے ساتھ ظواہر احکام شریعت کو لازم سمجھنا چاہئے۔ جب تک کسی امر کا کتاب و سنت کے معیار پر موازنہ نہ کیا جائے اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ ابو سلیمان دارانی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ میرے دل پر بہت سی باتیں اپنے اجتہاد اور مکاشفہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مگر جب تک میں ان ہر دو گواہ عدل (کتاب و سنت) کی شہادت نہیں لے لیتا انکو کوئی اعتبار نہیں دیتا۔

اسی طرح حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ ہمارا علم (تصوف) کتاب و سنّت کے ساتھ مضبوط کیا گیا ہے۔ اور جس علم پر کتاب و سنّت شاہد نہیں اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں۔ بہر صورت عام متصوفہ کی ایسی باتیں جو قرآن و سنّت کے مخالف ہوں محض جاہلانہ حسنِ ظن سے قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتیں۔

ناظرین یہ بھی یاد رکھیں کہ یہ وبا اسلام میں کچھ تو فلسفہ الٰہیات کی تعلیم سے داخل ہوئی اور کچھ نصاریٰ سے۔ مگر علمائے کتاب و سنّت نے ہمیشہ اس قسم کے بدعات کو روکا ہے اور ایسے لوگوں کی سخت مخالفت کی ہے۔ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ سب سے پہلے کتاب و سنّت کا فیصلہ طلب کرے کیونکہ کوئی امر کتاب و سنّت سے باہر نہیں اور صحابہ کے حالاتِ زندگی سے آگاہ ہونا اس بارہ میں رہبر کامل کا کام دیتا ہے "والتوفیق من اللہ تعالیٰ"۔

اس امر کا سراغ لگانا بہت دشوار ہے کہ دنیا میں رہبانیت کی ابتدا کب ہوئی۔ کہتے ہیں کہ پہلے پہل یہود کے فرقہ اسینیہ نے (گو موجودہ بائیبل میں پہلے دو فرقوں کا ذکر ہے مگر یوسیفس مؤرخ یہودی نے جو ۳۷ ہجری میں پیدا ہوا تھا فرقہ اسینیہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ تمام تین فرقے تھے۔ فریسیہ۔ صدوقیہ۔ اسینیہ) مصر و فلسطین میں رہبانیت کی بنیاد ڈالی تھی۔ بعد ازاں نصاریٰ نے اسے از سرِ نو زندہ کیا نصاریٰ میں رہبانیت کی پہلی مثال ملک مصر میں ملتی ہے۔ انطونی اعظم[1] باشندہ طیرہ[2] نے گھر بار چھوڑ کر بحیرہ قلزم کے متصل کوہ قلزم پر سکونت اختیار کی۔ اس راہب کی کوشش سے لیبیا کے ریگستان اور طیبہ کی چٹانوں اور دریائے نیل کے شہروں میں راہبوں کی آبادی جلد جلد قائم ہو گئی۔ اس کے مرید ملک حبشہ میں بھی پھیل گئے قریباً ۳۳۰ء میں پولس

[1] انطونی اعظم ایک سو پانچ برس کی عمر میں ۳۵۶ھ میں مرا [2] مصر کے حصہ علیا میں طیرہ ایک شہر تھا جسکے ایک سو دروازہ تھے اب صرف اس کے کھنڈر باقی ہیں ۱۲ء

یومی کے مرید پچومیس نے جزیرہ تابنہ واقع دریائے نیل میں راہبوں کے لئے سب سے پہلی خانقاہ بنائی - اسی نے راہبوں کے لئے قواعد تیار کئے - اور اس کی اہبین نے عورتوں کے لئے الگ خانقاہ بنائی - پچومیوس کی کوشش سے اس جزیرہ میں راہبوں کی تعداد ایک ہزار چار سو ہوگئی - اس کی دیکھا دیکھی (تھیامون) نے بھی سکندریہ کے جنوب کی طرف کوہ نطرون پر ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی اور تھوڑی سی مدت میں پانچہزار راہب وہاں جمع ہوگئے - پھر مکاریوس راہب نے جبال نطرون و دریائے نیل کے درمیان بہت سی خانقاہیں بنائیں - اس طرح زن و مرد کی ایک تعداد کثیر نے رہبانیت اختیار کر لی - صرف شہر اوکسی رنکس کی خانقاہوں میں دس ہزار عورتیں اور بیس ہزار لوگ رہتے تھے - مصر میں رہبان کی کثرت کا اندازہ اس امر سے لگ سکتا ہے کہ شاہ ویلنس[1] کو فوجی خدمت کے لئے آدمی نہیں مل سکتے تھے اس لئے اس نے حکم دیدیا تھا کہ آئندہ راہبوں سے بھی فوجی خدمت لی جایا کرے ؛

ملک شام و ایشیائے کوچک اور بحیرۂ اسود کے جنوبی سواحل نے بھی رہبانیت میں مصر کا اقتدا کیا - ہلاریون (متوفی ۳۷۱ء) جس نے سکندریہ میں تعلیم پائی تھی اور اعظم مذکور کے ساتھ دو ماہ تک مصر کے جنگل میں بھی رہا تھا اپنے وطن فلسطین میں آکر ۳۰۶ء میں پندرہ برس کی عمر میں غازا کے جنوب کی طرف صحرا میں راہب بن بیٹھا اور اس نے بہت سی خانقاہیں بنائیں - جب وہ فلسطین کی خانقاہوں کا معائنہ کیا کرتا تھا تو دو تین ہزار راہب اس کے ساتھ ہوا کرتے تھے - اور یستا تبوس اسقف سطیہ نے آرمینیا میں رہبانیت کو ترقی دی - باسیلیوس (متوفی ۳۷۹ء) نے ۳۶۰ء میں صوبۂ پانتس[2] میں رہبانیت کی بنیاد ڈالی اور بحیرۂ اسود کے جنوبی

[1] ویلنس ایک رومی شاہنشاہ تھا جو ۳۷۸ء میں قتل ہوا ؛
[2] ایشیائے کوچک کا شمال مشرقی صوبہ پانتس کہلاتا ہے ؛

سواحل پر بہت سی خانقاہیں بنائیں اور ان کے انتظام کے لئے قواعد تیار کیے

مشرق کی طرح مغرب میں بھی رہبانیت کی بڑی اشاعت ہوئی۔ اتھاناسیوس سکندریہ (متوفی ۳۷۳ء) جب آریوس[1] کے عقیدہ کی مخالفت کے سبب دوسری دفعہ جلاوطن ہوا تو اُس نے ۳۴۱ء میں روما میں رہبانیت کو پہلے پہل رواج دیا ۳۷۲ء میں مارٹن باشندہ تور نے ملک غالیہ[2] میں رہبانیت قائم کی۔ جب وہ مرا تو دو ہزار مرید اس کے جنازہ کے ساتھ تھے۔ مارٹن کے ہم عصر کاسیانوس نے جو اوائل عمر میں جرمانوس کے ساتھ بیت اللحم کی خانقاہ میں رہ چکا تھا ۴۱۵ء میں مارسیلیا[3] میں خانقاہیں بنائیں۔ بحیرہ روم میں بھی لبران[4] سے لیپاری تک تمام جزائر میں رہبان آباد تھے۔ اسقف امبروس (متوفی ۳۹۷ء) نے میلان واقع اطالیہ میں ایک خانقاہ بنائی اور وہیں اغسطینوس[5] کو عیسائی بنایا۔ اغسطینوس نے اپنے وطن میں آ کر شمالی افریقہ میں رہبانیت قائم کی اور اس کے لئے قوانین بنائے جو بعد میں یورپ کی ہزارہا خانقاہوں کا دستور العمل بنے۔ پیلاجیوس[6] (متولد ۳۶۰ء) ان قوانین کو روما سے انگلستان میں لایا۔ یہ راہب خانقاہ بینگور واقع صوبہ ویلز

---

[1] اریوس (متوفی ۳۳۶ء) کا عقیدہ تھا کہ ابن اللہ مخلوق ہے ازلی نہیں مگر خدا نے اسے الوہیت میں شریک کر لیا ہے [2] زمانہ سابق میں غالیہ یورپ کے ایک ملک کا نام تھا جس میں موجودہ فرانس بلجیم۔ ہالینڈ کا کچھ حصہ۔ جرمنی۔ سوئٹزرلینڈ اور شمالی اطالیہ شامل تھا [3] مرسیلیا یعنی مارسیلز فرانس کا بندرگاہ ہے۔ رومیوں کے زمانہ میں یہ شہر ایسا مشہور تھا کہ سرد والے ملک غالیہ کا ایتھنز اور یونانی ملک تعلیم کہلاتا تھا [4] فرانس کے جنوبی ساحل کے نزدیک دو جزیرے کا نام ہے ایک کو سینٹ مارگرٹ اور دوسرے کو سینٹ ہونورٹ کہتے ہیں ہونورٹ میں اب تک جینید کتیہ رہبان کی ایک خانقاہ ہے جزیرہ لیپاری صقلیہ کے شمال میں واقع ہے [5] اغسطینوس چرچ مسیحی کے آبائے لاطینی میں سب سے بزرگ سمجھا جاتا تھا۔ ۱۳۔ نومبر ۳۵۴ء میں نومیدیا واقع شمالی افریقہ کے قصبہ تغاستہ میں پیدا ہوا۔ اس نے قرطاجنہ میں جو نومیدیا کے مشرق میں ہے تعلیم پائی وہاں سے معاش کی تلاش میں روما گیا بعد ازاں میلان میں علم معانی و بیان مقرر ہو آیا اور وہیں ۳۸۷ء میں عیسائی ہو گیا [6] دوسرے عیسائیوں کی طرح اغسطینوس کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت آدم کا گناہ موروثی ہے جو انسان پیدا ہوتا ہے گناہ اسکے ساتھ ہوتا ہے۔ عیسیٰ مسیح کی الوہیت پر ایمان لانا تمام گناہوں کا کفارہ ہے کیونکہ وہ سب کے گناہوں کے لئے مصلوب ہوئے۔ پیلاجیوس نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ انسان بیگناہ پیدا ہوتا ہے جیسے کہ آدم۔ آدم کے گناہ کا اثر صرف آدم پر ہوا۔ موت گناہ کا کفارہ نہیں ہو سکتی۔ آدم کا گناہ انکی نسل کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔

میں رہتا تھا۔ جہاں دو ہزار سے سے زیادہ راہب تھے۔ اسی خانقاہ سے آئرلینڈ کی وحشی اقوام میں رہبانیت پھیلی۔ سینٹ پیٹرک (متوفی ۴۶۳ء) کے زمانہ میں وہاں کئی خانقاہیں اور مدارس قائم ہو گئے۔ سینٹ بینیدک باشندہ نرسیا (متوفی ۵۴۳ء) نے اوائل عمر میں رہبانیت اختیار کی اور وکووارو واقعہ اطالیہ کی خانقاہ کا سجادہ نشین مقرر ہوا۔ مگر اس خانقاہ کے رہبان کی ریاضت کو کچھ سخت نہ پایا۔ اس لئے اسے چھوڑ دیا اور چند سال ہی بارہ خانقاہیں بنائیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد تقریباً ۵۲۹ء میں اس نے نیپلز کے قریب مونت کاسینو کی بڑی خانقاہ بنائی۔ ۵۴۰ء میں اس نے ایک کتاب موسوم بہ "قوانین خانقاہ" لکھی۔ یہ قوانین بعد میں رہبان کے تمام مغربی فرقوں میں رائج ہو گئے۔ سینٹ اغسطین جو ۵۹۶ء میں پوپ گریگوری کے حکم سے چالیس راہبوں کو ساتھ لے کر انگلستان کو عیسائی بنانے آیا تھا۔ فرقہ بینیدکتیہ کا ایک راہب تھا سینٹ کولمبا (متوفی ۵۹۷ء) نے رہبانیت اختیار کر کے ملک آئرلینڈ میں ۵۴۶ء میں خانقاہ ڈیری اور ۵۵۳ء میں خانقاہ ڈرو بنائی۔ جب ۵۶۳ء میں وہ جلا وطن ہوا تو اپنے بارہ مریدوں کے ساتھ جزیرہ ایونا میں پہنچا اور وہاں ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی خانقاہ ایونا سے کولمبا نے سکاٹ لینڈ کے تمام شمالی حصہ اور شمالی اور مغربی جزائر میں مذہب عیسوی کی منادی کی اور ہر جگہ خانقاہیں بنائیں۔ اس کے ہم عصر و ہم وطن کولمبانوس (متوفی ۶۱۵ء) تقریباً ۵۹۰ء میں فرانس میں پہنچ کر اینگرے اور لکسابا اور فونتین کی خانقاہیں بنائیں۔ فرانس سے ۶۱۰ء میں وہ سوئٹزرلینڈ پہنچا۔ اس کے ایک ہمراہی نے خانقاہ سینٹ گال بنائی۔ وہاں ۶۱۲ء میں اطالیہ پہنچ کر کولمبانوس نے خانقاہ بوبیو بنائی۔ ایونا کی خانقاہ سے رہبانیت آئس لینڈ میں بھی پہنچ گئی۔

راہبوں کی تین قسمیں تھیں۔ سینوبیطہ جو ایک ہی انابیق کے اتحت اکٹھے رہ کر

تھے انکو ریطہ[۱] جو سوسائٹی سے دُور علیحدہ مجاہدہ پسند کرتے تھے سیرائیط[۲] جو ایک جگہ قیام نہ کرتے تھے بلکہ ملک بہ ملک پھرا کرتے تھے رہبان کی خواب وخورش اور طہارت وعبادت کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں مگر ان کی عام حالت کا اندازہ ایک مورخ کے بیان ذیل سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ وہ صلیبوں اور زنجیروں کی تکلیف دہ بوجھ کے نیچے دب جاتے تھے اور اِن کے لاغر اعضار بھاری سخت لوہے کے طوقوں اور کنگنوں اور دستانوں اور ٹانگوں کی بکتر میں جکڑے ہوئے ہوتے تھے۔ مردوں اور عورتوں میں سے بعض ایسے وحشی ولی تھے مشہور جنکے ننگے جسم فقط اِن کے لمبے لمبے بالوں سے ڈھکے ہوتے وہ اپنے آپ کو اس ناشائستہ اور خستہ حالت پر لانا چاہتے۔ جس میں وحشی انسان اور دیگر حیوانات میں تمیز نہیں ہو سکتی اور انکو ریطہ کے ایک بڑے فرقہ کا نام راتعبہ[۱] اس لئے پڑ گیا ہے کہ وہ الجزیرہ[۲] کے کھیتوں میں عام ریوڑ کے ساتھ چرا کرتے تھے۔ وہ اکثر کسی جنگلی حیوان کا بھٹ چھین لیتے تھے جنکے ساتھ وہ بے تکلف مشابہت ظاہر کرتے تھے۔ یا وہ کسی اندھیری غار میں چھپ جاتے جسے ہاتھ کی محنت یا قدرت نے چٹان کو کرید کر بنایا ہوتا۔ طیوہ کی سنگ مرمر کی کانوں میں اب تک اس کے مجاہدہ کی یادگاریں[۳] کندہ ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سب سے کامل راہب بہت سے دن بغیر خوراک کے اور بہت سی راتیں بغیر خواب کے اور بہت سے سال بغیر کلام کے گذار دیتے تھے۔ قابل تعریف وہ انسان (میں اس نام کی ہتک کرتا ہوں[۴]) سمجھا جاتا تھا جو ایسی عجیب طرز کا حجرہ یا نشستگاہ تجویز کرتا جس میں وہ نہایت ہی بے آرامی کی حالت میں موسموں کی شدت کا نشانہ بنتا۔

---

[۱] نسٹ افریم (متوفی قریباً ۳۷۳ء) نے ان چرنے والے رہبوں کی مدح میں ایک رسالہ لکھا ہے [۲] جو ملک دریائے دجلہ وفرات کے مابین ہے اسے الجزیرہ کہتے ہیں انگریزی میں میسوپوٹیمیا بولتے ہیں [۳] یہ کتبے قدیم سریانی حروف میں ہیں جو صیغہ کے عیسائیوں میں مروج تھے ۱۲ [۴] سیمون رہبان کے فرقہ اسطوانیین کا بانی ہے جو تمام عمر کسی پہاڑ یا ستون کی چوٹی پر گذارتے تھے اور نیچے نہ اترتے تھے ۱۲ منہ

رہبانیت کے ان سورماؤں میں سے سیمون اسطوانی (متوفی سنہ ۴۵۹ء) کی ذہانت اور نام ایک ہوائی مجاہدہ کی عجیب ایجاد کے سبب ہمیشہ باقی رہیگا۔ تیرہ سال کی عمر میں یہ نوجوان شامی راہب بھیڑوں کی جگہ گلہ بانی چھوڑکر ایک ریاضت پسند خانقاہ میں داخل ہوا۔ طویل و دشوار شاگردی کے بعد جس میں وہ کئی بار ناپاک خودکشی سے بچا اس نے شہر انطاکیہ کے مشرق کی طرف تقریباً تیس یا چالیس میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ پر سکونت اختیار کی۔ پتھروں کے ایک دائرہ کے اندر جس سے اس نے اپنے تئیں ایک بھاری زنجیر سے جکڑا ہوا تھا۔ وہ ایک ستون[۱] پر چڑھ گیا جو سطح زمین سے بتدریج نو فٹ سے ساٹھ فٹ اونچا بنا لیا گیا تھا۔ اس آخری بلند جگہ میں اس شامی انکوریٹ راہب نے تیس موسم گرما کی حرارت اور اتنی ہی موسم سرما کی برودت کا مقابلہ کیا۔ عادت اور مشق نے اسے سکھا دیا تھا کہ اس خطرناک حالت کو بغیر ڈر یا دوران سر کے کیونکر قائم رکھے اور عبادت کے مختلف اوضاع کو بتدریج کیونکر بجا لائے بعض دفعہ وہ حالتِ قیام میں اپنے بازو پھیلا کر صلیب کی شکل بنائے ہوئے عبادت کیا کرتا تھا۔ مگر جس مشق کا وہ نہایت ہی عادی تھا وہ یہ تھی کہ اپنے لاغر جسم کو اسقدر جھکاتا کہ پیشانی پاؤں پر آ لگتی۔ ایک شوقین تماشائی اس کی مشق کو ایک ہزار دو سو چالیس دفعہ گن کر بے حد حساب سے عاجز رہ گیا اس کے سرین پر ناسور[۲] کی شدت نے اس کی آسمانی زندگی کو کم کر دیا۔ مگر اس میں خلل انداز

[۱] اوینگریوس مورخ (متولد سنہ ۵۳۶ء) لکھتا ہے کہ اس ستون کی چوٹی کا محیط دو ہاتھ تھا یعنی ۳ فٹ تھا۔ مگر اس قدر تنگ محیط درایت واقعات اور فن عمارت کے قواعد کے خلاف ہے۔ جن لوگوں نے اسے نیچے سے دیکھا تو آسانی سے دھوکا کھا گئے ہونگے ۱۲ منہ

[۲] مجھے اس قدیم بہتان کو چھپانا نہ چاہئے جو اس ناسور کی اصلیت کے بارہ میں مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن شیطان نے فرشتہ کی شکل میں اس سے آکر کہا کہ الیاس کی طرح آپ آتشین رتھ میں بیٹھکر آسمان پر چلیں۔ اس ولی نے سنتے ہی قدم اٹھایا اور شیطان نے اسکے غرور کے سبب اس کو سزا دینے کا موقع پایا۔ ۱۲ منہ

نہ ہو سکی۔ اس صابر راہب نے جان دیدی مگر ستون سے نیچے نہ اُترا۔ اگر کوئی شہزادہ
متلوّن مزاجی سے ایسا عذاب دے تو اسے ظالم خیال کرینگے۔ مگر ظالم کے اختیار
باہر ہے کہ مظلوموں کو طویل و المناک زندگی کی سزا دے۔ یہ اختیاری شہادت بتدریج
حواس ظاہری[1] و باطنی کو ضرور ہی نیست و نابود کر دیتی ہوگی۔ اور یہ بھی قیاس میں نہیں آسکتا
کہ وہ خبطی جو اپنے آپ کو عذاب دیتے ہیں دیگر اشخاص سے محبت رکھنے کے قابل ہیں
سنگدلی اور بیرحمی ہر ایک مکان و زمان کے راہبوں کا مابہ الامتیاز ہے۔ ان کی سخت
بے پروائی جس میں ذاتی دوستی سے شاذ و نادر تخفیف ہو سکتی ہے مذہبی نفرت کے
سبب اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور ان کے بے رحم جوش نے تفتیش[2] کے پاک
عہدے کو سختی سے سرانجام دیا ہے +

راہب اولیا جن کو دیکھکر فلسفی کے دل میں صرف حقارت و رحم پیدا ہوتا ہے
ادنےٰ و اعلےٰ ان کی تعظیم بلکہ قریبًا عبادت کرتے تھے فرانس اور ہندوستان سے
زایرین کے لگاتار گروہ سیمیون کے مقدس ستون کو سلام کرتے تھے۔ اقوام مشرقین
اس کی دعا کا شرف حاصل کرنے کے لئے مسلح ہو کر آپس میں جھگڑ پڑتیں۔ عرب و فارس
کی ملکہ نے شکریہ کے ساتھ اس کی فوق العادۃ پارسائی کا اعتراف کیا اور شاہ تھیوڈ
وسیوس اصغر ملک و ملت کے نہایت ہی ضروری کاموں میں اس فرشتہ سیرت راہب
سے مشورہ لیتا تھا۔ اس کی لاش بطریق مشرق کے سردار کل چھ اسقف۔ اکیس[3] توابون

[1] چھٹی صدی مسیحی میں یروشلم میں ان نفس کش راہبوں کے لئے ایک شفاخانہ بنایا گیا جنکے حواس جاتے رہتے تھے
[2] محکمہ تفتیش کو رومن کیتھولک پوپ انوسینٹ سوم نے بارھویں صدی مسیحی کے اخیر میں بدعتیوں کی تعزیر و قتل کیلئے قائم کیا تھا۔ فرانس۔ اطالیہ۔ پرتگال و سپانیہ میں یہ محکمہ قرنوں جاری رہا۔ اس محکمہ کی کاروائی میں رہبان کے دو فرقہ دو مینیکیہ وغیرہ نے بہت مدد دی۔ انکے ظلم و ستم کی تفصیل کے لئے ایک علیحدہ کتاب چاہئے۔ فقط ہسپانیہ میں تیس ہزار آدمی زندہ جلائے گئے تھے
[3] چنانچہ قرآن مجید میں ہے اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم وما امروا الا لیعبدوا الٰہا واحدا لا الٰہ الا ھو سبحانہ عما یشرکون (ترجمہ) انہوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو پروردگار بنا رکھا ہے سوا اللہ کے اور مسیح ابن مریم کو حالانکہ انہیں حکم دئے گئے تھے کہ بندگی کریں ایک معبود کی نہیں کوئی معبود سوائے اس کے پاک ہے اسکو اس چیز سے کہ شرک کرتے ہیں۔ انتہیٰ۔ رہبان اپنے حجروں سے نکلکر بیت المقدس کو جایا کرتے تھے (باقی ص...)

حکام فوجداری اور چھ ہزار سپاہ کے باقاعدہ جمگھٹے کے ساتھ کوہ طلیبنیب سے نقل کی گئی - اور
انطاکیہ نے اسکی ہڈیوں کو اپنی عالیشان آرائش اور محکم پناہ سمجھ کر انکی تعظیم و تکریم کی
نئے ہر دلعزیز انکو ریلطہ راہبوں نے بتدریج حواریل اور شہیدوں کی شہرت کو بھی مات
دیا مسیحی دُنیا انکے مزارات کے آگے سجدہ کرتی تھی اور وہ معجزے جو ان کے تبرکات کی
طرف منسوب کئے جاتے تھے کم از کم تعداد و مدت میں انکی زندگیوں کے رُوحانی سوانح
سے زیادہ تھے مگر ان کے سوانح کے سنہری افسانہ کو اُن کے اہل غرض بھائیوں کی چالاک
خوش اعتقادی زیب و زینت دیدیتی تھی - اور بھولے بھالے لوگ آسانی سے مان جاتے
تھے کہ کسی مصری یا شامی راہب کا نہایت ہی خفیف وہم دُنیا کے ابدی قوانین توڑنے
کے لئے کافی ہے - یہ خدا کے پیارے چھونے یا بولنے یا دُور کے پیام سے پُرانی
بیماریوں کا علاج کر دیا کرتے تھے اور نہایت ہی سرکش جن بھوت کو آسیب رسیدہ
ارواح یا اجسام سے نکال دیا کرتے تھے - وہ جنگل کے شیروں اور سانپوں کو بیدھڑک
بلایا کرتے یا رعونت سے حکم دیا کرتے - خشک تنے کو پھونک مار کر سبز کر دیتے - پانی کی
سطح پر لوہا ٹھہرا دیتے - مگرمچھ کی پیٹھ پر دریائے نیل کو عبور کر جاتے - اور تفریح طبع کے
لئے آگ کی بھٹی میں چلتے تھے - ان مبالغہ آمیز قصّوں نے جن سے نظم کی بندش معلوم
ہوتی ہے مگر اعلیٰ لیاقت ظاہر نہیں ہوتی عیسائیوں کے عقل و عقیدے اور اخلاق پر
اثر ڈالا ہے - خوش اعتقادی نے انکے باطنی قویٰ کو بگاڑ دیا اور نکما کر دیا - انہوں
تاریخی شہادت میں تحریف کر دی اور باطل پرستی نے آہستہ آہستہ فلسفہ اور سائنس
مخالف روشنی کو بجھا دیا - مذہبی عبادت کا ہر ایک طریق جس پر یہ اولیا چلتے تھے اور
ایک مخفی مسئلہ جس پر ان کا عقیدہ تھا کلام ربانی کی منظوری سے مستند بنایا جاتا تھا

حاشیہ ص۱۷۵ جب واپس آتے تو بچے ان کو مس کرتے اور تبرک کے لئے انکے کپڑوں کو پھاڑ لیتے تھے جیسا کہ
مرعابی ابو العلیس کے اس شعر سے ظاہر ہے ؎

فاذہ کنہ یاخذن بالساق والنسا　　کما شرق الولدان ثوب المقدس　۱۲ منہ

اور راہبوں کی غلامانہ وزنانہ حکومت سے تمام مردانہ خوبیاں دب گئیں ؛

دُنیا اس طرح رہبانیت میں مبتلا تھی کہ جناب سیدنا و مولانا محمد مصطفٰے احمد مجتبےٰ رحمۃ للعالمین شفیع المذنبین سیدِ اولادِ آدم صلے اللہ علیہ وسلّم ایسی شریعت کے ساتھ مبعوث ہوئے جو افراط و تفریط سے خالی اور رہبانیت سے پاک ہے ۔ چنانچہ آیات و احادیث ذیل سے ظاہر ہے :۔

آیات

(۱) ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (ترجمہ) پھر ہم ان کے قدموں پر اپنے پیغمبروں کو پیچھے لائے ۔ اور مریمؑ کے بیٹے عیسےٰ کو پیچھے لائے ۔ اور اس کو انجیل دی ۔ اور ہم نے اُن لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے اس کی پیروی کی شفقت اور رحمت ڈال دی ۔ اور اُنہوں نے رہبانیت کو اپنی طرف سے نکالا ہم نے اس کو اُن پر فرض نہیں کیا تھا مگر خدا کی رضامندی ڈھونڈھنے کے لئے تھی ۔ پس اُنہوں نے اس کی رعایت نہ کی جیسے کہ چاہئے تھی ۔ پس ہم نے اُن کو جو اُن میں سے ایمان لائے اُن کا ثواب دیدیا ۔ اور اُن میں سے بہت فاسق ہیں انتہیٰ ۔ (حدید ۔ ع) ؛

(۲) وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (ترجمہ) اور تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں کیگئی ۔ (حج ۔ ع) ؛

(۳) يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (ترجمہ) اللہ تعالےٰ تم سے آسانی چاہتا ہے اور تم سے سختی نہیں چاہتا (بقرہ ع) ؛

(۴) وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ وَاَحْسِنُوْا

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (ترجمہ) اور اللہ کے رستہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ اور نیکی کرو۔ تحقیق اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے (بقرہ ۲۴ع)

(۵) وَجَاهِدُوا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (ترجمہ) اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرو جیسا کہ چاہیئے۔ اس نے تم کو برگزیدہ کیا اور دین میں تم پر کچھ تنگی نہ کی (حج ۱۰ع)

(۶) قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (ترجمہ) کہہ دو کہ کس نے حرام کی ہے اللہ کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لئے نکالی ہے اور روزی میں سے پاکیزہ چیزیں؟ (اعراف ۴ع)

(۷) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (ترجمہ) اے ایمان والو! پاکیزہ چیزیں جو اللہ نے تمہارے واسطے حلال کی ہیں انہیں حرام نہ کرو (اپنے اوپر) اور حد سے نہ نکلو تحقیق اللہ تعالے حد سے نکل جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ انتہیٰ (مائدہ ۱۲ع) امام بغوی نے معالم التنزیل میں اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے کہ ایک روز نبی صلعم نے وعظ فرمائی۔ اور قیامت کا ذکر کیا۔ پس لوگوں پر رقت طاری ہوگئی اور روئے اور صحابہ میں سے دس بزرگ عثمانؓ بن مظعون جمحی کے گھر میں جمع ہوئے اور وہ یہ ہیں۔ ابوبکر صدیقؓ۔ علیؓ ابن ابی طالبؓ۔ عبداللہ بن مسعودؓ۔ سلمانؓ فارسیؓ۔ عبداللہ بن عمرو ابوذر غفاریؓ۔ سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ۔ مقداد بن اسودؓ۔ معقلؓ بن مقرنؓ۔ انہوں نے باہم مشورہ کیا اور اس پر اتفاق کیا کہ رہبانیت اختیار کریں اور کمبل پہنیں اپنے آلات تناسل کاٹ ڈالیں۔ صائم الدہر ہوں (تمام رات عبادت میں قیام کریں اور فرش پر نہ سوئیں۔ نہ گوشت اور چربی کھائیں۔ نہ عورتوں کے پاس جائیں۔ نہ خوشبو لگائیں اور دنیا میں سیاحت کریں۔ یہ خبر نبی صلعم کو پہنچی۔ آپ عثمان بن مظعون کے گھر تشریف

لیگئیں مگر اس کو نہ پایا - پس آپ کی بابت خولہ (ام حکیم بنت ابی امیہ) سے جو عطارہ یعنی عطر
بیچتی تھی دریافت کیا کہ مجھے عثمان بن مظعون اور اسکے ساتھیوں کی نسبت جو خبر پہنچی ہے
وہ سچ ہے ؟ خولہ نے جھوٹ بولنا برا سمجھا اور یہ بھی گوارا نہ کیا کہ اپنے خاوند کی خبر ظاہر
کر دے - پس بول عرض کی یا رسول اللہ ! اگر عثمان نے آپ کو خبر دی تو بے شک اس
نے سچ کہا - پس حضرت رسالت مآب واپس چلے آئے - جب عثمان بن مظعون گھر آئے
تو ان کی بیوی نے سارا ماجرا کہہ سنایا - اس پر وہ اور اس کے ساتھی جناب رسالتمآب
کی خدمت میں آئے - آپ نے فرمایا - کیا مجھے خبر نہیں دیگئی کہ تم نے فلاں فلاں امر
پر اتفاق کیا ہے ؟ انہوں نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ ! مگر ہم نے نیکی کے سوا اور
نیت نہیں کی - آپ نے فرمایا کہ مجھے اس بات کا حکم نہیں ملا - پھر یوں ارشاد فرمایا
ان لانفسکم علیکم حقا فصوموا وافطروا وقوموا وناموا فانی اقوم وانام
واصوم وافطر واکل اللحم والدسم واتی النساء ومن رغب عن سنتی فلیس
منی یعنی تمہارے نفسوں کا تم پر حق ہے - پس روزہ رکھو اور افطار کرو اور قیام
کرو اور سوؤ - کیونکہ میں قیام کرتا ہوں اور سوتا ہوں اور روزہ رکھتا ہوں اور افطار
کرتا ہوں اور گوشت اور چربی کھاتا ہوں اور عورتوں کے پاس جاتا ہوں - اور
جس نے میری سنت سے روگردانی کی پس وہ مجھ سے نہیں ہے - پھر لوگوں کو جمع
کیا اور ان سے خطاب کیا اور فرمایا ما بال اقوام حرموا النساء والطعام والطیب
والنوم وشھوات الدنیا انی لست امرکم ان تکونوا قسیسین ورھبانا فانہ
لیس دینی ترک اللحم والنساء ولا اتخاذ الصوامع وان سیاحۃ امتی الصوم
ورھبانیتھم الجھاد واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا وحجوا واعتمروا واقیموا
الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وصوموا رمضان واستقیموا لیستقم لکم فانما ھلک من کان
قبلکم بالتشدید شددوا علی انفسھم فشدد اللہ علیھم فاولئک بقایاھم

فی الدیارات والصوامع فانزل اللہ ھذہ الایۃ یا ایھا الذین امنوا لا تحرموا
طیبات ما احل اللہ لکم یعنی کیا حال ہے ان قوموں کا جنہوں نے عورتوں ۔ طعام
خوشبو۔ نبیذ اور دنیا کی شہوتوں کو حرام کر دیا۔ تحقیق میں تم کو حکم نہیں دیتا کہ تمیس
اور راہب بنجاؤ۔ کیونکہ میرا دین گوشت اور عورتوں کو ترک کر دینا نہیں ۔ اور نہ
حجروں میں بیٹھنا تحقیق میری امت کی سیاحت روزہ رکھنا اور انکی رہبانیت جہاد
کرنا ہے ۔ اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ ۔ حج کرو عمرہ
بجالاؤ ۔ نماز قائم کرو ۔ زکوٰۃ دو ۔ رمضان کے روزے رکھو اور استقامت اختیار کرو
تمہارا حال درست رہیگا ۔ جو تم سے پہلے تھے وہ سخت گیری ہی سے ہلاک ہوئے ۔ انہوں
نے اپنی جانوں پر تشدد کیا ۔ اللہ نے ان پر تشدد کیا ۔ انہی کا بقایا خانقاہوں اور حجروں
میں ہیں ۔ پس اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل کی یا ایھا الذین امنوا لا تحرموا طیبات
ما احل اللہ لکم ۔

احادیث (۱) عن ابی ھریرۃ عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم ان الدین یسر ولن یشاد
الدین احد الا غلبہ فسددوا وقاربوا وابشروا واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشیٔ
من الدلجۃ (رواہ البخاری) ترجمہ ۔ ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا
کہ دین آسانی ہے اور ہرگز کوئی شخص دین کے ساتھ غالبہ نہیں کر سکتا (یعنی عمل آسان و جب
کو چھوڑ کر عمل دشوار غیر واجب اختیار نہیں کرتا مگر یہ کہ دین اسپر غالب آتا ہے (یعنی وہ
عاجز ہو جائیگا حتیٰ کہ واجبات کو بھی ادا نہ کرسکیگا ۔ پس طریق مستقیم اختیار کرو ۔ اور اعتدال
رکھو اور اپنی جانوں کو (ثواب عمل) کی خوشخبری دو اور مدد چاہو (امر عبادت میں) دن کے
اول و آخر میں اور تاریکی شب کے کچھ حصہ میں ۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ۔
(مشکوٰۃ باب القصد فی العمل)

(۲) عن انس ابن مالک قال دخل النبی صلعم فاذا الحبل ممدود بین الساریتین

فقال ما هذا الحبل قالوا هذا حبل لزينب فاذا فترت تعلقت فقال النبي صلعم حلوه ليصل احدكم نشاطه فاذا فتر فليقعد (یعنی انس بن مالک سے روایت ہے کہ نبی صلعم داخل ہوئے (مسجد میں) ناگاہ ایک رسی دو ستونوں کے درمیان باندھی ہوئی دیکھی۔ پس آپ نے دریافت کیا کہ یہ رسی کیسی ہے؟ صحابہ نے عرض کی کہ رسی زینب کی ہے۔ پس جب (نماز شب سے) تھک جاتی ہے تو اسے پکڑ لیتی ہے پس نبی صلعم نے فرمایا یہ رسی نہ رہنے دو (ایسا نہ کرو) اس کو کھول دو۔ چاہیے تم میں سے ایک اپنی مدت نشاط تک نماز پڑھے۔ جب تھک جائے تو چاہیے کہ بیٹھ جائے (بخاری کتاب التہجد باب مایکرہ من التشدید فی العبادۃ) ۔

(۳) عن عبد الله بن عمرو بن العاص قال قال رسول الله صلے الله عليه وسلم يا عبد الله الم اخبر انك تصوم النهار وتقوم الليل فقلت بلى يا رسول الله قال لا تفعل صم وافطر وقم ونم فان لجسدك عليك حقا وان لعينك عليك حقا وان لزوجك عليك حقا وان لزورك عليك حقا وان بحسبك ان تصوم من كل شهر ثلثة ايام فان لك بكل حسنة عشر امثالها فاذا ذلك صيام الدهر كله فشددت علي قلت يا رسول الله انى اجد قوة قال فصم صيام نبي الله داود ولا تزد عليه قلت وما كان صيام نبي الله داود قال نصف الدهر وكان عبد الله يقول بعد ما كبر يا ليتني قبلت رخصة النبي صلے الله عليه وسلم (ترجمہ عبداللہ بن عمرو بن عاص راوی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے مجھے فرمایا اے عبداللہ کیا مجھے خبر نہیں دیگئی کہ تو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو عبادت کے لئے قیام کرتا ہے۔ مینے عرض کی ہاں یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا ایسا نہ کر۔ روزہ رکھ اور افطار کر اور رات کو قیام کر اور سو بھی۔ کیونکہ تجھ پر تیرے جسم کا حق ہے۔ اور تجھ پر تیری آنکھ کا حق ہے اور تجھ پر تیری عورت کا حق ہے اور تجھ پر تیرے مہمان کا حق ہے اور تجھے کافی ہے

کہ ہر مہینہ میں تین روزے رکھے۔ پس البتہ ہر نیکی کے عوض تیرے لئے ویسی ہی دس نیکیاں ہیں۔ اِسی طرح سے تیرے لئے تمام صوم دہر کا ثواب ہے۔ پس میں نے اپنی جان پر تشدد کیا اور مجھ پر تشدد کیا گیا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا تب اللہ کے نبی داؤد کا روزہ رکھ اور اس پر زیادہ نہ کر۔ میں نے دریافت کیا کہ اللہ کے نبی داؤد کا روزہ کیا تھا۔ فرمایا صوم دہر کا نصف (ایک دن روزہ رکھنا دوسرے دن نہ رکھنا) اور عبداللہ بن عمرو بن عاص بوڑھے ہوکر کہا کرتے تھے۔ کاش میں نبی صلعم کی رخصت کو قبول کرلیتا۔ (بخاری کتاب الصوم باب حق الجسم فی الصوم) +

(۴) عن ابی جحیفۃ قال اٰخی النبی صلعم بین سلمان وابی الدرداء فزار سلمان ابا الدرداء فرأی ام الدرداء متبذلۃ فقال لھا ما شأنکِ قالت اخوک ابو الدرداء لیس لہ حاجۃ فی الدنیا فجاء ابو الدرداء فصنع لہ طعاما فقال کل فانی صائم قال ما انا اٰکل حتی تاکل فاکل فلما کان اللیل ذھب ابو الدرداء یقوم قال نم فنام ثم ذھب یقوم فقال نم فلما کان من اٰخر اللیل قال سلمان قم الاٰن فصلیا فقال لہ سلمان ان لربک علیک حقا ولنفسک علیک حقا ولاھلک علیک حقا فاعط کل ذی حق حقہ فاتی النبی صلعم فذکر ذالک لہ فقال النبی صلعم صدق سلمان۔ (ترجمہ) ابوجحیفہ رض سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے سلمان اور ابو الدرداء کے درمیان بھائی چارا کرادیا۔ پس سلمان ابوالدرداء کو ملنے گئے ام درداء کو پرانے محنت کے کپڑوں میں دیکھ کر پوچھا کہ تیرا کیا حال ہے؟ اُس نے کہا تیرے بھائی ابوالدرداء کو دُنیا کی کوئی حاجت نہیں۔ پس ابوالدرداء آگئے اور اُس کے لئے کھانا تیار کیا اور کہا کھالے کیونکہ میں روزہ دار ہوں۔ سلمان نے کہا۔ میں نہیں کھانے کا۔ حتیٰ کہ تو بھی کھائے۔ پس ابوالدرداء نے کھایا۔ جب رات ہوئی

تو ابو الدرداء عبادت کے لئے قیام کرنے لگے۔ سلمان نے کہا سو جا۔ پس وہ سو گئے۔ پھر قیام کرنے لگے۔ سلمان نے کہا سو رہو۔ جب اخیر رات ہوئی تو سلمان نے کہا اب اٹھ۔ پس دونوں نے نماز پڑھی۔ سلمان نے اُس سے کہا تیرے رب کا تجھ پر حق ہے تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے اور تیرے اہل کا تجھ پر حق ہے۔ پس ہر ایک حقدار کو اس کا حق ادا کر۔ پس نبی صلعم کی خدمت میں آیا اور آپ سے یہ واقعہ ذکر کیا۔ نبی صلعم نے فرمایا کہ سلمان نے سچ کہا۔ (بخاری۔ کتاب الصوم باب التنکیل لمن اکثر الوصال) ۱۵

(۵) عن انس قال جاء ثلاثۃ رھط الی ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسألون عن عبادۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلما اخبروا بھا کانھم تقالوھا فقالوا این نحن من النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقد غفر اللہ لہ ما تقدم من ذنبہ وما تاخر فقال احدھم اما انا فاصلی اللیل ابدا وقال الآخر انا اصوم النھار ابدا ولا افطر وقال الآخر انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا فجاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الیھم فقال انتم الذین قلتم کذا وکذا اما واللہ انی لاخشاکم للہ واتقاکم لہ لکنی اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ متفق علیہ۔ (ترجمہ) انس سے روایت ہے کہ (صحابہ میں سے) تین شخص نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ازواج مطہرات کے پاس آئے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال پوچھتے تھے۔ پس جب انہیں آنحضرت کی عبادت کی مقدار سے خبر دی گئی گویا انہوں نے اس مقدار کو کم سمجھا۔ پس انہوں نے کہا ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت ہے۔ حالانکہ تحقیق اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخشدئے ہیں۔ پس ان میں سے ایک نے کہا لیکن میں تو ہمیشہ تمام رات نماز پڑھا کرونگا۔ دوسرے نے کہا میں دن کو ہمیشہ روزہ رکھا کرونگا اور کبھی افطار نہیں کرونگا تیسرے نے کہا میں عورتوں سے کنارہ کشی کروں گا۔ پس میں کبھی نکاح نہیں کرونگا۔ نبی صلعم

اُن کی طرف تشریف لائے اور پوچھا کیا تم ہو جنہوں نے ایسا ایسا کہا ہے؟ دیکھو خدا کی قسم! میں تمہاری نسبت خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہوں اور زیادہ پرہیزگار ہوں۔ مگر میں روزہ رکھتا ہوں اور کبھی نہیں بھی رکھتا اور نماز پڑھتا ہوں اور سوتا ہوں اور عورتوں سے نکاح کرتا ہوں۔ پس جو میری سنت سے برگشتہ ہوا وہ میری پیروی کرنے والوں سے نہیں ہے۔ متفق علیہ (مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)۔

(۶) عن انس قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یفطر من الشہر حتی نظن ان لا یصوم منہ شیئاً ویصوم حتی نظن انہ لا یفطر منہ شیئاً وکان لا تشاء ان تراہ من اللیل مصلیاً ۔۔۔ ولا نائماً الا رأیتہ رواہ البخاری (ترجمہ) انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کبھی کسی مہینے میں روزے نہیں رکھتے تھے یہاں تک کہ یہ گمان ہوتا تھا کہ آپ اس مہینہ سے کچھ روزے نہیں رکھینگے اور کبھی روزے رکھتے جاتے کہ یہ گمان ہوتا کہ آپ اس مہینہ سے کچھ دن بھی افطار نہیں کرینگے اور آنحضرتؐ کی یہ حالت تھی کہ (اے مخاطب) تو نہ چاہتا کہ آپ کو رات میں نماز پڑھتے دیکھے مگر یہ کہ تو آپ کو نماز پڑھتے دیکھتا اور تو نہ چاہتا کہ آپ کو خواب کرتے دیکھتا مگر یہ کہ آپ کو خواب کرتے دیکھتا۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے (مشکوٰۃ۔ باب القصد فی العمل)۔ مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کا عمل افراط و تفریط سے خالی تھا۔ نہ تو یہ حالت تھی کہ آپ ہمیشہ افطار کریں جو تفریط ہے اور نہ یہ کہ ہمیشہ صائم رہیں۔ جو افراط ہے اسی طرح رات کو نماز بھی پڑھتے اور آرام بھی فرماتے۔

(۷) عن عائشۃ رض قالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خذوا من الاعمال ما تطیقون فان اللہ لا یمل حتی تملوا متفق علیہ (ترجمہ) عائشہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اعمال میں سے وہ اختیار کرو جسکی تم

طاقت رکھتے ہو۔ کیونکہ خدا (ثواب دینے سے) ملول نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ تم (اِس عمل کے جاری رکھنے سے) ملول نہ ہو جاؤ۔ متفق علیہ (مشکوٰۃ۔ باب القصد فی العمل) ؂

(۸) عن مسروق قال قالت عائشۃ صنع النبی صلعم شیئاً فرخص فیہ فتنزہ عنہ قوم فبلغ ذالک النبی صلعم فخطب فحمد اللہ ثم قال ما بال اقوام یتنزھون عن الشیٔ اصنعہ فواللہ انی اعلمھم باللہ واشدھم لہ خشیۃ (ترجمہ) مسروق سے روایت ہے کہ عائشہ رض نے کہا نبی صلعم نے کچھ عمل کیا۔ پس اس کی رخصت دیدی ایک قوم نے اس عمل سے احتراز کیا۔ یہ خبر نبی صلعم کو پہنچی۔ پس آپ نے خطبہ پڑھا اور اللہ کی حمد کی۔ پھر فرمایا کیا حال ہے ان لوگوں کا جو احتراز کرتے ہیں اس چیز سے جو میں کرتا ہوں؟ اللہ کی قسم البتہ میں انکی نسبت زیادہ عالم باللہ اور اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہوں (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب من لم یواجھہ الناس بالعتاب) ؂

(۹) عن انس ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کان یقول لاتشددوا علے انفسکم فیشدد اللہ علیکم فان قوم شددوا علے انفسھم فشدد اللہ علیھم فتلک بقایاھم فی الصوامع والدیار رھبانیۃ ابتدعوھا ماکتبناھا علیھم رواہ ابوداؤد) ترجمہ۔ انس رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم فرمایا کرتے تھے کہ تم اپنی جانوں پر تشدد نہ کرو کیونکہ اس طرح اللہ تم پر تشدد کریگا۔ پس جس قوم نے اپنی جانوں پر تشدد کیا اللہ نے انپر تشدد کیا۔ حجروں اور خانقاہوں میں انہیں سخت گیروں کے باقی ماندہ ہیں۔ رہبانیت کو انہوں نے اختراع کیا ہم نے اسے انپر فرض نہ کیا تھا۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا (مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

(۱۰) عن عباد بن یعقوب الرواجی انبانا عیسیٰ بن عبد اللہ بن محمد بن علے

حدثنی ابی عن ابیہ عن جدہ عن علی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یحب ان یؤخذ برخصتہ کما یحب ان یؤخذ بعزائمہ ان اللہ بعثنی بالحنیفیۃ السمحۃ ودین ابراھیم ثم قرأ وما جعل علیکم فی الدین من حرج فقال لی ابی یا بنی ما حرج قلت لا ادری قال الضیق (ترجمہ) (بحذف اسناد) حضرت علی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اللہ دوست رکھتا ہے کہ اسکی رخصتوں پر عمل کیا جائے (عزیمت اصل حکم پر عمل کرنا) جیسا کہ وہ دوست رکھتا ہے کہ اس کی عزیمتوں پر عمل کیا جائے۔ تحقیق اللہ تعالےٰ نے مجھے سچے آسان دین ابراہیم کے ساتھ بھیجا ہے وَمَا جَعَلَ علیکم فی الدین من حرج (اور اس نے دین میں تم پر کچھ تنگی نہیں کی) پس مجھ سے میرے باپ نے کہا اے میرے بیٹے! حرج کے کیا معنی ہیں؟ میں نے کہا میں نہیں جانتا۔ کہا تنگی۔ اس حدیث کو حاکم مستدرک میں لایا ہے۔ (کنز العمال جزء ثانی صفحہ ۱۳۶)

(۱۱) ان لکل امۃ سیاحۃ وسیاحۃ امتی الجہاد فی سبیل اللہ وان لکل امۃ رھبانیۃ ورھبانیۃ امتی الرباط فی نحو العدو۔ (ترجمہ) آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ہر امت کے لئے سیاحت ہے۔ اور میری امت کی سیاحت اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا ہے اور ہر امت کے لئے رہبانیت ہے اور میری امت کی رہبانیت دشمن کے مقابلہ میں سرحد پر گھوڑوں کا (جہاد کے لئے) باندھ رکھنا ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے۔ (کنز العمال جزء ثانی صفحہ ۲۵۲)

(۱۲) لکل نبی رھبانیۃ ورھبانیۃ ھذہ الامۃ الجہاد فی سبیل اللہ (ترجمہ) آنحضرت صلعم نے فرمایا ہر نبی کے لئے رہبانیت ہے اور اس امر کی رہبانیت اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا ہے۔ اس حدیث کو امام احمد نے اپنی مسند میں انس سے روایت کیا ہے۔ (کنز العمال جزء ثانی صفحہ ۲۵۲)

(۱۳) عن عائشۃ ان النبی صلعم دخل علیھا وعندھا امرأۃ فقال من ھذہ
قالت فلانۃ لا تنام تذکر من صلاتھا فقال مہ علیکم من العمل ما تطیقون
فواللہ لا یمل اللہ عزوجل حتی تملوا وکان احب الدین الی اللہ مادام علیہ
(ترجمہ) عائشہ رض سے روایت ہے کہ ایک عورت (خولا) تھی۔ آپ نے پوچھا کون ہے
عائشہ رض نے جواب دیا فلاں عورت ہے جو سوتی نہیں اور اس کی نماز کی درازی کا ذکر
کرتی تھی۔ آپ نے فرمایا چھوڑ۔ تم پر وہ عمل لازم ہے جس کی (مداومت کی) تم طاقت
رکھتے ہو۔ اللہ کی قسم! اللہ عزوجل (ثواب دینے سے) ملول نہیں ہوتا یہاں تک کہ تم
(مداومت سے) ملول نہ ہو جاؤ۔ اور اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب وہ طاعت ہے جسپر
طاعت کرنیوالا مداومت کرے۔ (نسائی۔ باب احب الدین الی اللہ عزوجل)۔

(۱۴) عن ابن عباس قال بینا النبی صلعم یخطب اذا ھو برجل قائم فسأل
عنہ فقالوا ابو اسرائیل نذر ان یقوم ولا یقعد ولا یستظل ولا یتکلم ویصوم
فقال النبی صلعم مروہ فلیتکلم ولیستظل ولیقعد ولیتم صومہ رواہ بخاری۔
(ترجمہ) ابن عباس رض سے روایت ہے کہا جبکہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھ رہے
تھے ناگاہ آپ نے ایک کھڑے شخص کو دیکھا۔ پس اسکی نسبت دریافت فرمایا صحابہ نے
نے عرض کی ابو اسرائیل ہے جس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہیگا۔ نہ بیٹھے گا اور نہ
سایہ میں آئیگا اور نہ کلام کرے گا بلکہ روزہ رکھے گا۔ پس نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا کہ اسے حکم دو۔ پس چاہیئے کہ وہ کلام کرے اور سایہ میں آئے اور بیٹھے اور اپنا
روزہ پورا کرے۔ اس کو بخاری نے روایت کیا ہے (مشکوۃ۔ باب فی النذور)۔

(۱۵) عن ابی امامۃ قال خرجنا مع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فی
سریۃ فمر رجل بغار فیہ شئ من ماء وبقل فحدث نفسہ بان یقیم فیہ
ویتخلی من الدنیا فاستاذن رسول اللہ صلعم فی ذلک فقال رسول اللہ صلعم

لم ابعث بالیہودیۃ ولا بالنصرانیۃ ولکنی بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ والذی نفس محمد بیدہ لغدوۃ او روحۃ فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما فیہا ولمقام احدکم فی الصف خیر من صلوٰۃ ستین سنۃ۔ رواہ احمد) ترجمہ۔ ابو امامہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلعم کے ساتھ ایک لشکر میں (جہاد کے لیئے) نکلے۔ پس ایک شخص ایک غار پر گذرا جس میں کچھ پانی اور سبزی تھی۔ اس نے اپنے جی میں کہا کہ میں اس میں قیام کروں اور دُنیا سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ پس اس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس امر کی اجازت طلب کی۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میں یہودیۃ و نصرانیۃ لے کر مبعوث نہیں ہوا بلکہ میں آسان سچے دین کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد صلعم کی جان ہے البتہ صبح کو یا شام کو اللہ تعالےٰ کے راستہ میں چلنا دنیا وما فیہا سے بہتر ہے۔ کسی کا (جہاد کی) صف میں کھڑے ہونا اس کی ساٹھ سال کی نماز سے بہتر ہے۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا۔ (مشکوٰۃ۔ کتاب الجہاد)

(۱۶) عن سعد بن ابی وقاص قال ردّ رسول اللہ صلعم علےٰ عثمان بن مظعون التبتل فلو اذن لہ لاختصینا متفق علیہ (ترجمہ) سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے عثمان بن مظعون کو عورتوں سے کنارہ کشی کی اجازت نہ دی۔ اگر اسے اجازت مِل جاتی تو ہم البتہ از خود خصی ہو جاتے (مشکوٰۃ کتاب النکاح)

(۱۷) عن عثمان بن مظعون قال یا رسول اللہ صلعم ائذن لنا فی الاختصاء فقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لیس منا من خصی ولا اختصی ان خصاء امتی الصیام فقال ائذن لنا فی السیاحۃ فقال ان سیاحۃ امتی الجہاد فی سبیل اللہ فقال ائذن لنا فی الترہب فقال ان ترہب امتی

الجلوس فی المساجد انتظار الصلوٰۃ رواہ فی شرح السنۃ. ترجمہ عثمان بن مظعون رض
روایت ہے کہ اس نے کہا یا رسول اللہ صلعم ہمیں خصی ہونے کی اجازت دیں
پس رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہمارے طریق پر نہیں جو دوسرے کو خصی کرے
نہ ہی وہ جو از خود خصی ہو جائے۔ تحقیق میری اُمت کا خصی ہونا روزہ رکھنا ہے
پس عثمان بن مظعون نے عرض کی کہ آپ ہمیں آفاق گردی ہی کی اجازت دیدیں۔
آپ نے فرمایا میری اُمت کی آفاق گردی خدا کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ پس عثمان
بن مظعون نے عرض کی کہ آپ ہمیں رہبانیت ہی کی اجازت دیدیں۔ آپ نے فرمایا
میری اُمت کی رہبانیت مسجدوں میں نماز کے انتظار کے لئے بیٹھنا ہے۔ اس
حدیث کو امام بغوی نے شرح السنۃ میں روایت کیا ہے۔ (مشکوٰۃ۔ باب المساجد
و موضع الصلوٰۃ) مولانا روم فرماتے ہیں سے

ہین مکن خود را خصی رہباں مشو	زانکہ عفت است شہوت را گرو
بے ہوا نہی از ہوا ممکن نبود	غازی بر مُردگاں نتواں نمود
پس کلوا از بہر دام شہوت است	بعد ازاں لاتسرفوا آں عفت است
چونکہ رنج صبر نبود مر ترا	شرط نبود پس فرو ناید جزا
حبذا آں شرط و شادا آں جزا	آں جزاے دلنواز جاں فزا

(۱۸) ان ھٰذا الدین متین فاوغل فیہ برفق ولا تکرھوا عبادۃ اللہ
الی عبادہ فان المنبت لا یقطع سفرا ولا یستبقی ظھرا (ترجمہ) آنحضرت صلعم نے
فرمایا کہ یہ دین متین ہے پس اس میں نرمی کے ساتھ چل اور اللہ کی عبادت کو اسکے
بندوں پر ناگوار مت کر۔ کیونکہ اپنی سواری کو تکلیف مالایطاق دینے والا نہ تو سفر
کو طے کرتا ہے اور نہ سواری کی پیٹھ باقی چھوڑتا ہے (اسے ہلاک کر دیتا ہے)
اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عائشہ صدیقہ رض سے روایت

کیا ہے۔ (کنز العمال جزء ثانی صث) ؛
احادیث مذکورہ بالا کے علاوہ اور احادیث بھی اس مضمون کے متعلق ہیں جنکے نقل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ تفسیر روح البیان میں آیہ نمبر ۲ کے ذیل میں مذکور ہے کہ حاصل کلام یہ ہوا کہ رہبانیت میں افراط اور لذات وطیّبات سے احتراز تمام اعضائے رئیسہ یعنی دل و دماغ میں ضعف پیدا کرتا ہے۔ دل و دماغ کے ضعف سے قوتِ فکریہ میں خلل آجاتا ہے۔ قوتِ فکریہ کے اختلال سے کمالات متعلقہ قوتِ نظریہ بالکل فوت ہوجاتی ہیں۔ اور کمالات متعلقہ قوۃ علیہ میں نقصان آجاتا ہے۔ کیونکہ ان کا کمال قوتِ نظریہ کے کمال پر موقوف ہے۔ علاوہ ازیں ایسی رہبانیت دنیا کی خرابی اور انقطاع نسل و زراعت کا موجب ہے۔ لہٰذا حکمت الٰہیہ اس امر کی مقتضی ہوئی کہ طیّبات کا استعمال جائز ہو بشرطیکہ اعتدال ملحوظ رہے جیسا کہ ولا تعتدوا سے ظاہر ہے۔ ماکولات کی طرح عبادات و ریاضات میں بھی اعتدال ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ محدث دہلوی نے مشاق فی العبادۃ کے تین قبائح بیان کئے ہیں :۔
اہمال ارتفاقات۔ ملال نفس۔ اشتباہ فی الدین۔ وہ لکھتے ہیں فمن المقاصد الجلیلۃ فی التشریع ان یسد باب التعمق فی الدین لئلا یعضوا علیہا بنواجذہم فیاتی من بعدہم قوم فیظنوا انہا من الطاعات السماویۃ المفروضۃ علیہم ثم تأتی طبقۃ اخری فیصیر الظن عندہم یقینا والمحتمل مطمئنا بہ فیظل الدین محرفا وھو قولہ تعالی رھبانیۃ ن ابتدعوھا ما کتبنا ھا علیھم وایضا فمن ظن من نفسہ وان اقر بخلاف ذالک من لسانہ ان اللہ لا یرضی الا بتلک الطاعات الشاقۃ وانہ لو قصر فی حقہا فقد وقع بینہ وبین تھذیب نفسہ حجاب عظیم وانہ لو فرط فی جنب اللہ فانہ یواخذ

بما ظن ویطالب بالخروج عن التفریط فی جنب الله حسب اعتقاده
فقد انقلبت علومه علیه ضارة مظلمة فلم تقبل طاعاته لعلة فی نفسه
هو قوله صلی الله علیه وسلم ان الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبه

ترجمہ:- امر شریعت کا ایک مقصد اہم خیال کیا گیا ہے کہ احکام دین میں نہایت باریک غور و خوض سے کام نہ لیا جائے تاکہ لوگ اس پر نہایت شدت کے ساتھ عملدرآمد کرنا نہ شروع کر دیں۔ کیونکہ بعد کے آنے والے لوگ یہ گمان کرنے لگینگے کہ انکے خود تجویز کردہ امور آسمانی شریعت کے احکام میں داخل ہیں۔ اور پھر انکے بعد کے طبقہ کے لوگ ان تجویز کردہ احکام کو جو محض ظن پر مبنی تھے یقینی اور قطعی خیال کرنے لگینگے سو اس طرح دین کی اصلی صورت قائم نہ رہیگی۔ اور قرآن مجید میں اس قسم کی تشدد آمیز رہبانیت کے متعلق آیہ رهبانیة ابتدعوها میں ممانعت وارد ہوئی ہے اور نیز جو شخص اپنے ذہن میں یہ خیال کرلے کہ خدائے تعالیٰ سوائے عبادات شاقہ کے راضی نہیں ہوتا اور اگر وہ عبادات شاقہ کے بجا لانے میں کوتاہی کریگا تو اسکے اور خدائے تعالیٰ کے درمیان ایک پردہ حائل ہوجائیگا اور ایسی کوتاہی کی صورت میں اسے مواخذہ کیا جائیگا اور وہ یہ اعتقاد کرے کہ اسے اس تفریط کی بابت مطالبہ کیا جائیگا تو ایسے شخص کے حق میں اسکے علوم موجب مضرت ثابت ہونگے اور اسکے عبادات نفس کی اس برائی کیوجہ سے قابل قبول نہیں رہینگے کیونکہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ دین ہر ایک قسم کی آسانی کا نام ہے اور جو شخص دین کو خود بخود اپنے اوپر سخت بنا لیتا ہے تو بالآخر وہ مغلوب ہوجاتا ہے یعنی احکام کی سختی کی وجہ سے بالآخر اس کو مغلوب ہونا پڑے گا۔

رہبانیت کی نسبت کافی لکھا جاچکا ہے مگر مجھے ترجمہ خوانان اہل ظواہر کیطرف سے اندیشہ ہے کہ کہیں نادانی کے سبب اس مضمون کو پڑھکر تصوف کے برخلاف بیجا بدظنی نہ پھیلائیں لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کی نسبت چند ضروری امور کو سوال وجواب کی صورت میں پیش کئے جائیں۔ والله هو الهادی۔

...مسئلہ سوال ۔ کیا اصل تصوف قرآن وحدیث سے ثابت ہے؟

...جواب :۔ حدیث جبریل میں جو بخاری ومسلم میں موجود ہے حقیقت اسلام و ایمان کے بعد احسان کا ذکر ہے ۔ جس کی تفسیر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمائی ہے ان تعبد الله کانك تراہ فان لم تكن تراہ فانه يراك یعنی احسان و اخلاص یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے ۔ پس اگر تو اس حال پر نہیں کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے تو یوں عبادت کر کہ وہ تجھکو دیکھ رہا ہے ۔ (مشکوٰۃ کتاب الایمان) اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اعمال ظاہری و عقائد کے علاوہ ایک اور کمال ہے جسے احسان سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ یہ احسان اصل تصوف کی طرف اشارہ ہے ۔ اور اثبات ولایت کی قوی دلیل ہے شیخ عبدالحق دہلوی اس حدیث کے تحت میں لکھتے ہیں ۔ بدانکہ مبنائے دین وکمال آں بر فقہ وکلام وتصوف است وایں حدیث شریف بیان ایں ہر سہ مقام کردہ ۔ اسلام اشارت بہ فقہ است کہ متضمن بیان اعمال واحکام شرعیہ فرعیہ است وایمان بہ اعتقادات کہ مسائل اصول کلام اند واحسان اشارت بہ اصل تصوف کہ عبادت از صدق توجہ الی اللہ است وجمیع معانی تصوف کہ مشائخ طریقہ بآں اشارت کردہ اند بایں راجع است و فقہ وتصوف وکلام لازم یکدیگر اند ہیچ یکے بے دیگرے تمامیت نپذیرد وصورت نہ بندد ۔ تصوف بے فقہ صورت نہ بندد زیراکہ احکام الٰہی بے فقہ شناختہ نشود و فقہ بے تصوف تمام نشود زیراکہ عمل بے صدق توجہ تمامیت نپذیرد وہر دو بے ایمان صحیح نگردند بر مثال روح وجسد کہ ہیچ کدامی بے دیگرے وجود نہ گیرد وکمال عمر نپذیرد ازینجا فرمود امام مالک رحمہ اللہ من تصوف ولم یتفقه فقد تزندق ومن تفقه ولم يتصوف فقد تفسق ومن جمع بينهما فقد تحقق ... بجامعیت ایں است باقی ہمہ زیغ وضلال است والتوفیق من اللہ الکریم المتعال (اشعۃ اللمعات) ترجمہ ۔ جان لے کہ دین اور اسکے کمال کی بنیاد فقہ وکلام وتصوف

پرے اور اس حدیث شریف نے ان تینوں مقاموں کا بیان کر دیا ہے۔ اسلام اشارہ ہے فقہ کی طرف جو احکام واعمال شرعیہ فرعیہ کے بیان پر مشتمل ہے۔ اور ایمان اشارہ ہے اعتقادات کی طرف جو اصول کلام کے مسائل ہیں اور احسان اشارہ ہے اصل تصوف کی طرف جس سے مراد صدق توجہ الی اللہ ہے اور تصوف کے تمام معانی جن کی طرف مشائخ طریقہ نے اشارہ کیا ہے۔ اسی معنی کی طرف راجع ہیں۔ اور فقہ وتصوف وکلام ایک دوسرے کے لازم ہیں۔ ان میں سے کوئی بغیر دوسرے کے کمال کو نہیں پہنچتا۔ اور پایا نہیں جاتا۔ فقہ کے بغیر تصوف نہیں پایا جاتا کیونکہ احکام الٰہی فقہ کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے۔ اور تصوف کے بغیر فقہ تمام وکامل نہیں ہوتی کیونکہ عمل بغیر صدق توجہ کے کامل نہیں ہوتا اور فقہ وتصوف دونوں ایمان کے بغیر صحیح نہیں ہوتے جیسا کہ جسم وروح جو ایک دوسرے کے بغیر موجود نہیں ہوتے اور کمال نہیں پاتے۔ اسی سبب سے امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جو شخص صوفی بنا اور فقیہ نہ ہوا۔ پس تحقیق وہ زندیق بن گیا اور جو فقیہ ہوا اور صوفی نہ بنا پس تحقیق وہ فاسق ہوگیا۔ اور جو دونوں کا جامع ہوا پس تحقیق وہ درست ہوا۔ کمال جامعیت یہ ہے۔ باقی سب کجی اور گمراہی ہے۔ والتوفیق من اللہ الکریم المتعال۔ انتہیٰ +

۲- سوال۔ اصل تصوف کو آپ نے حدیث سے تو ثابت کیا۔ قرآن سے بھی ثابت کریں؟

جواب۔ اوامر ونواہی احادیث حقیقت میں قرآن کے امر ونواہی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب (ترجمہ) اور جو چیز رسول تم کو دے اس کو لے لو اور جس سے وہ تم کو منع کرے تم اس سے باز آجاؤ۔ اور اللہ سے ڈرو۔ تحقیق اللہ سخت عذاب والا ہے۔ (سورہ حشر) عن عبد اللہ بن مسعود قال لعن اللہ الواشمات والمستوشمات

والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغيرات خلق الله فجاءته امرأة فقالت انه بلغني انك لعنت كيت وكيت فقال مالي لا العن من لعن رسول الله صلی الله علیہ وسلم ومن هو في كتاب الله فقالت لقد قرأت ما بين اللوحين فما وجدت فيه ما تقول قال لئن كنت قرأتيه لقد وجدتيه - اما قرأت وما اتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا قالت بلى قال فانه قد نهى عنه متفق علیہ (ترجمہ) عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہا لعنت کرے اللہ تعالےٰ خوبصورتی کے لئے بدن گودنے والی اور گدوانے والی اور بال نچوانے والی اور بہ تکلف دانتوں میں فرق وفاصلہ پیدا کرنیوالی عورتوں پر اور اللہ کی پیدائش کو تغیر دینے والی عورتوں پر۔ پس ایک عورت نے آپ کے پاس آکر کہا مجھے خبر پہنچی ہے کہ تو (عورتوں کو) ایسی ایسی لعنت کرتا ہے پس آپ نے فرمایا میں کیونکر لعنت نہ کروں اس پہ جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو۔ اور جو کتاب اللہ (قرآن) میں ملعون ہو۔ پس اس عورت نے کہا البتہ مینے قرآن کو اول سے آخر تک پڑھا ہے۔ میں نے اس میں وہ نہیں پایا جو تو کہتا ہے - آپ نے فرمایا کہ اگر تو قرآن مجید پڑھتی تو بے شک اسے پا لیتی - کیا تو نے نہیں پڑھا - وما اتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا؟ اس عورت نے کہا ہاں - آپ نے فرمایا - پس تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے افعال مذکورہ بالا سے منع فرمایا ہے - متفق علیہ (مشکوٰۃ باب الترجل) اس حدیث سے ہمارا مطلب روز روشن کی طرح واضح ہوگیا پس اصل تصوف قرآن ہی ثابت کرتا ہے - لہٰذا جو شخص تصوف کو برا کہتا ہے وہ خود برا ہے۔

۳- سوال - صوفی کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

جواب - في التعرف انما سموا صوفية لقرب اوصافهم من اوصاف اهل الصفة الذين كانوا على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وقال بعضهم للبسهم الصوف او لصفاء اسرارهم او الصفاء معاملتهم لانهم في الصف الاول بين يدي الله تعالى

ی من السابقین المسارعین فی الخیرات والمبادرین فی الطاعات ثم قال واما من نسبهم الی الصفة والصوف فانه عبر عن ظاهر احوالهم وذلك انهم قوم ترکوا الدنیا وخرجوا عن الاوطان وهجروا الاخدان وساحوا فی البلاد واجاعوا الاکباد واعروا الاجساد ولم یاخذوا من الدنیا الا ما لا یجوز ترکه من ستر عورة وسد جوعة فلخروجهم عن الاوطان سموا غرباء ولکثرة اسفارهم سموا سیاحین ولقلة اکلهم سموا جوعیة ومن تخلیتهم من الاملاك سموا فقراء وللبسهم الثوب الخشن من الشعر والصوف سموا صوفیة ثم هذا کلها احوال اهل الصفة الذین کانوا علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فانهم کانوا غرباء فقراء مهاجرین خرجوا من دیارهم واموالهم ووصفهم ابوهریرة وفضالة بن عبید فقالا کانوا یخرون من الجوع حتی یحسبهم الاعراب مجانین وکان لباسهم الصوف حتی ان کان بعضهم لیعرق فیه فیوجد منه ریح الضان اذا اصابه المطر ۔

(ترجمہ) کتاب تعرف میں ہے کہ صوفیہ اس سبب سے نام رکھا گیا ہے کہ انکے اوصاف اہل صفہ کے اوصاف سے قریب ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھے - اور بعض نے یہ وجہ تسمیہ بیان کی ہے کہ وہ صوف پہنتے ہیں یا انکے اسرار صاف ہیں یا اُن کا معاملہ صاف ہے - کیونکہ وہ اللہ تعالےٰ کے سامنے پہلی صف میں ہیں یعنی نیکیوں میں سبقت لے جانیوالوں اور طاعت میں جلدی کرنے والوں میں سے ہیں - پھر صاحب تعرف نے کہا ہے کہ جس نے ان کو صفہ یا صوف کی طرف منسوب کیا - پس اس نے ان کے ظاہر کو بیان کیا - کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کو ترک کر دیا ہے - پس وہ اپنے گھروں سے نکلے اور دوستوں سے جدا ہوئے اور شہروں میں پھرے اور پیٹوں کو بھوکا رکھا اور جسموں کو ننگا رکھا اور انہوں نے دنیا سے نہ لیا مگر اسقدر کہ جس کا ترک جائز نہیں یعنی ستر عورت اور بھوک کی روک ۔

پس وہ اپنے گھروں سے نکلنے کے سبب غرباء کہلائے اور سفروں کی کثرت کے سبب سے سیاح اور کم کھانے کے سبب جوعیہ اور اپنے املاک چھوڑنے کے سبب فقراء اور بالوں یا پشم کے سخت کپڑے پہننے کے سبب صوفیہ کہلائے اور یہ سب اہل صفہ کے احوال ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھے کیونکہ غرباء و فقراء و مہاجرین تھے جو اپنے گھروں اور مالوں سے ہجرت کر گئے تھے اور حضرت ابوہریرہ رضہ اور فضالہ بن عبید نے ان کا حال بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ بھوک سے گر پڑتے تھے یہانتک کہ بدوی ان کو دیوانہ خیال کرتے تھے اور ان کا لباس صوف تھا۔ یہانتک کہ بعض کو اس میں پسینہ آجاتا تھا۔ پس بارش سے بھیگ کر اس میں بھیڑ کی بو آتی تھی (مرقاۃ۔ جزء ثانی صـ۷۷ـ) "

۴۔ سوال ۔ اہل صفہ کا مزید حال بیان کرو ؟

جواب ۔ مختصر نہایہ میں ہے کہ اہل صفہ فقراء مہاجرین تھے جو مسجد نبوی کے متصل ایک سایہ پوش جگہ میں رہتے تھے۔ قاموس میں ہے کہ اہل صفہ اسلام کے مہمان تھے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے صفہ میں رات بسر کیا کرتے تھے اور بخاری پر سیوطی نے جو حاشیہ لکھا ہے اس میں ہے کہ ابونعیم نے حلیہ میں سو سے زیادہ ان کو شمار کیا ہے اور صفہ مسجد نبوی کے آخر میں ایک مکان تھا جو ان غرباء کے ٹھیرنے کے لئے بنایا گیا تھا جن کو کوئی جائے پناہ نہ ملتی تھی۔ اور وہ مقاتل[ل] تھے۔ ابن حجر نے کہا۔ کہ صفہ مسجد کے آخر میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فقراء اصحاب کے لئے بنایا گیا تھا جو اہل نہ رکھتے تھے۔ اور وہ کبھی زیادہ ہوجاتے تھے۔ یہانتک کہ ان کا شمار قریبا دو سو تک پہنچتا تھا۔ اور کبھی کم ہوجاتے تھے۔ کیونکہ وہ جہاد اور تعلیم قرآن کے لئے بھیجے جاتے تھے (مرقاۃ جزء ثانی صـ۷۷ـ)

مرقاۃ میں دوسری جگہ (جزء خامس صـ۵ـ) لکھا ہے کہ اہل صفہ مہاجرین میں سے

[ل] یعنی جہاد فی سبیل اللہ کیا کرتے تھے ۔۱۲منہ۔

چار سو تھے جو تعلیم قرآن کیلئے اور لشکروں میں کفار سے جہاد کرنے پر آمادہ تھے ۔ اور ابوہریرہ رضوان کا ناظر و نقیب اور ان کے حال کا خبر گیراں اور رقیب تھا ۔ اور وہ مسجد نبویؐ کے اخیر میں صفہ میں پناہ گزین تھے ۔ اور اُن کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی ہے للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربا فی الارض یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف تعرفھم بسیمھم لا یسئلون الناس الحافا ۔ (ترجمہ) صدقہ اُن فقیروں کے لئے ہے جو اللہ کے راستے میں روک دیئے گئے ہیں ۔ وہ زمین میں چل نہیں سکتے ۔ ترک سوال کے سبب جاہل ان کو دولتمند جانتا ہے تو ان کو ان کے چہرے سے پہچانتا ہے وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے (سورہ بقرہ ع) وہ متوکل تھے چھوارے کی گٹھلیاں ان کی خوراک تھی ۔ عن ابی ھریرۃ قال لقد رأیت سبعین من اصحاب الصفۃ ما منھم رجل علیہ رداء اما ازار اما کساء قد ربطوا فی اعناقھم ومنھا ما یبلغ نصف الساقین ومنھا ما یبلغ الکعبین فیجمعہ بیدہ کراھۃ ان تری عورتہ رواہ البخاری (ترجمہ) ابوہریرہ سے روایت ہے کہا البتہ میں نے اصحاب صفہ میں سے ستر آدمیوں کو دیکھا کہ ان میں سے کسی پر چادر نہ تھی ۔ ان پر یا تو آزار یا جامہ تھا یا (صرف) کمبلی جس کو اپنی گردنوں پر لپیٹ لیتے تھے کمبلی و آزار میں سے بعض دونو پنڈلیوں کے نصف تک اور بعض ٹخنوں تک پہنچتے تھے ۔ پس ان کو ہاتھ سے جمع کر لیتے تھے ۔ اس خوف سے کہ کہیں انکے جائے ستر غیر کو نظر آجائیں ۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے ۔ (مشکوٰۃ ۔ باب فضل الفقراء وما کان من عیش النبی صلے اللہ علیہ وسلم) تفسیر روح البیان میں للفقراء الذین احصروا الایۃ کے تحت میں لکھا ہے عن ابن عباسؓ وقف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یوما علے اصحاب الصفۃ فرئی فقرھم وجھدھم وطیب قلوبھم فقال ابشروا یا اصحاب الصفۃ فمن بقی من امتی علے النعت الذی انتم علیہ راضیا بما فیہ فانہ من رفقائی (ترجمہ) ابن

عباس رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک دن اصحاب صفہ کے پاس ٹھہر گئے۔ آپ نے ان کا فقر اور ان کا مجاہدہ اور ان کی خوشدلی دیکھی پس فرمایا اے اصحاب صفہ خوش ہو جاؤ۔ میری اُمت میں سے جو شخص اللہ سے اس طریق پر ملیگا جس پر تم ہو اس حال میں کہ وہ راضی ہو اس چیز سے جو اس طریق میں ہے۔ وہ بے شک میرے رفیقوں میں سے ہوگا۔ انتہیٰ ؂

۵۔ **سوال** ۔ صوفیہ کرام کے اکثر خانوادے صوف پہنتے ہیں۔ ان کے اس فعل کے جواز کی کیا دلیل ہے؟

جواب ۔ بخاری میں حدیث مغیرہ بن شعبہ میں ہے قال کنت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سفر فقال امعک ماء فقلت نعم فنزل من راحلتہ فمشی حتی تواریٰ عنی فی سواد اللیل ثم جاء فافرغت علیہ الاداوۃ فغسل وجھہ ویدیہ وعلیہ جبۃ شامیۃ من صوف فلم یستطع ان یخرج ذراعیہ منہا حتی اخرجہما من اسفل الجبۃ۔ (ترجمہ) ایک سفر میں میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا تیرے پاس پانی ہے؟ میں نے عرض کی ہاں۔ پس آپ اپنی سواری سے اُترے اور پیدل چلے یہانتک کہ رات کی تاریکی میں مجھ سے پوشیدہ ہو گئے۔ پھر آئے۔ پس میں نے کوزے سے آپ پر پانی ڈالا۔ آپ نے اپنا منہ اور دونوں ہاتھ دھوئے اور آپ پشم کا شامی جبہ پہنے ہوئے تھے۔ (آستینوں کی تنگی کے سبب) آپ اپنے ہاتھ مبارک اس جبہ میں سے نہ نکال سکے۔ یہانتک کہ آپ نے ان کو جبہ کے نیچے سے نکالا۔ انتہیٰ ۔ عن عائشۃ قالت خرج النبی صلے اللہ علیہ وسلم غداۃ وعلیہ مرط مرحل من شعر اسود فجاء الحسن بن علی فادخل ثم جاء الحسین فدخل معہ ثم جاءت فاطمۃ رض فادخلہا ثم جاء علی فادخلہ ثم قال انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا رواہ مسلم (ترجمہ) عائشہ

سے روایت ہے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک صبح کو نکلے اور آپ پر سیاہ بالوں کی ایک منقش چادر تھی۔ پس حسنؓ بن علیؓ آئے۔ آپ نے اسے چادر میں داخل کر لیا۔ پھر حسینؓ آئے۔ پس حسن کے ساتھ داخل ہو گئے۔ پھر فاطمہؓ آئیں۔ آپ نے اُسے بھی داخل کر لیا۔ پھر علیؓ آئے آپ نے اُسے بھی داخل کر لیا۔ پھر فرمایا انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (مشکوٰۃ باب مناقب اہل البیت) یہ پہلے آ چکا ہے کہ اصحاب صفہ کا لباس صوف تھا۔ علامہ سیوطی نے درمنثور میں ابن عباس رضؓ سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے صوف پہنا۔ وہ حضرت آدم و حوا ہیں جس وقت کہ وہ بہشت سے زمین پر گرائے گئے۔ کتاب تعرف میں ہے کہ ابو موسیٰ اشعری نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مر بالصخرۃ من الروحاء سبعون نبیا حفاۃ علیھم العباء یؤمون البیت العتیق (مقام روحاء[۱] کے پتھر کے پاس سے ستر نبی گذرے پاؤں سے ننگے عبا (کمبلی) پہنے ہوئے اور خانہ کعبہ کو جاتے ہوئے) اور حسنؓ نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ بالوں کا کپڑا پہنتے تھے۔ درختوں کے پتوں پر گذارہ کرتے تھے۔ اور جہاں شام ہوتی وہیں رات بسر کرتے۔ ابو موسیٰ اشعری نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ صوف پہنا کرتے تھے حسن بصری نے کہا کہ میں ستر صحابہ سے ملا جو جنگ بدر میں شامل ہوئے تھے۔ ان کا لباس بجز صوف کچھ نہ تھا۔ (مرقاۃ جزو رابع ص ۲۱۶) عن ابن عباس قال سرنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین مکۃ والمدینۃ فمررنا بواد فقال ای واد ھذا فقالوا وادی الازرق قال کانی انظر الی موسیٰ فذکر من لونہ وشعرہ شیئا واضعا اصبعیہ فی اذنیہ لہ جؤار الی اللہ بالتلبیۃ مارا بھذا الوادی قال ثم سرنا حتی اتینا علی ثنیۃ ھذا قالوا ھرشی اولفت فقال کانی انظر الی یونسؑ

[۱] حرمین شریفین کے درمیان مدینہ منورہ سے تیس یا چالیس میل کے فاصلہ پر ایک مقام کا نام ہے (قاموس)

علیٰ ناقۃ حمراء علیہ جبۃ صوف خطام ناقتہ خلبۃ مارا بھذا الوادی ملبیا ۔ (مسلم)

(ترجمہ) ابن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ ہم مکہ و مدینہ کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے ۔ پس ہم ایک وادی سے گذرے ۔ آپ نے فرمایا یہ کونسی وادی ہے ؟ صحابہؓ نے عرض کی وادی ازرق ۔ فرمایا گویا کہ میں موسیٰ کو دیکھتا ہوں ۔ (پس آپ نے اُن کے رنگ اور بالوں کا کچھ وصف بیان کیا) اس حال میں کہ وہ اپنی دو انگلیاں اپنے دو کانوں میں رکھے ہوئے ہے وہ لبیک کے ساتھ اللہ تعالےٰ کے آگے تضرع کر رہا ہے (اور) اس وادی میں گذر رہا ہے ۔ ابن عباس رضؓ نے کہا ۔ پھر ہم چلے یہانتک کہ ہم ایک گھاٹی پر آئے ۔ پس آپ نے فرمایا یہ کونسی گھاٹی ہے ؟ صحابہ رضؓ نے عرض کی کہ ہرشیٰ یا لفت ۔ پس فرمایا گویا کہ میں یونس ؑ کو دیکھ رہا ہوں ۔ سُرخ ناقہ پر سوار پشم کا جبہ پہنے ہوئے ۔ اُس کے ناقہ کی مہار درخت خرما کی چھال کی ہے ۔ اس حال میں کہ وہ اس وادی میں لبیک کہتے ہوئے گذر رہا ہے ۔ انتہیٰ ۔ (مشکوۃ ۔ باب بدء الخلق وذکر الانبیاء علیہم السلام) ؏

۲۔ **سوال** ۔ خاندان نقشبندیہ نے کیسا لباس اختیار ہے ؟

جواب ۔ روی البیہقی عن ابی ھریرۃ وزید بن ثابت انہ صلے اللہ علیہ وسلم نہی عن الشھرتین رقۃ الثیاب وغلظتہا ولینہا وخشونتہا وطولہا وقصرھا ولکن سداد فیما بین ذالک واقتصاد وھذا ھو المختار عند السادۃ النقشبندیۃ (ترجمہ) بیہقی نے ابوہریرہؓ اور زید بن ثابت رضؓ سے روایت کی ہے ۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دو شہرتوں سے منع فرمایا ۔ یعنی کپڑوں کی باریکی و موٹائی اور انکی نرمی و درشتی اور درازی و کوتاہی سے ۔ مگر (امر فرمایا) انکے درمیان راستی اور اعتدال کا ۔ مولانا علی القاری فرماتے ہیں کہ یہی مختار ہے مشائخ نقشبندیہ کے نزدیک ۔ انتہیٰ ۔ (مرقاۃ جزء رابع صہ ۲۱۶) ؏

۷۔ سوال ۔ مجاہدہ وکثرت عبادت کا شرعاً کیا حکم ہے ؟

جواب ۔ مجاہدہ وکثرت عبادت شرعاً مستحسن ہے لیکن بشروط ذیل :۔

اوّل ۔ ملال خاطر نہ ہو ۔ کیونکہ ملال کے وقت عبادت وغیر عبادت میں تمیز نہیں ہو سکتی ۔ چنانچہ حدیث نمبر ۲ کے الفاظ لیصل احدکم نشاطًا سے ظاہر ہے ۔

دوم ۔ تکلیف مالا یطاق نہ ہو جیسا کہ حدیث نمبر ۷ سے ظاہر ہے ۔

سوم ۔ اس سے وہ عبادت فوت نہ ہو جائے جو اہم ہو مثلاً حضور جماعت نماز جنازہ و اشاعت بہ تدریس و تصنیف وغیرہ ۔ یہ ماخوذ ہے حدیث ذیل سے ۔ عن ابی بکر بن سلیمان بن ابی حثمۃ قال ان بن الخطاب فقد سلیمان بن ابی حثمۃ فی صلوۃ الصبح وان عمرؓ غدا الی السوق ومسکن سلیمان بین المسجد والسوق فمر علی الشفاء ام سلیمان فقال لھا لم ار سلیمان فی الصبح فقالت انہ بات یصلی فغلبتہ عیناہ فقال عمر لان اشھد صلوۃ الصبح فی جماعۃ احب الی من ان اقوم لیلۃ رواہ مالک ترجمہ ابوبکر بن سلیمان بن ابی حثمہ سے روایت ہے کہا کہ عمرؓ بن خطاب نے سلیمان بن ابی حثمہ کو نماز فجر میں نہ پایا ۔ اور عمرؓ بازار کی طرف گئے ۔ اور سلیمان کا گھر مسجد اور بازار کے درمیان تھا ۔ پس ان کا گذر سلیمان کی ماں شفا پر ہوا ۔ آپ نے کہا میں نے سلیمان کو نماز فجر میں نہیں دیکھا ۔ شفا نے کہا کہ وہ رات بھر نماز پڑھتا رہا ہے ۔ پس اس پر نیند غالب آگئی ۔ عمرؓ نے فرمایا ۔ نماز فجر کی جماعت میں حاضر ہونا میرے نزدیک قیام شب سے بہتر ہے ۔ انتہیٰ ۔ (مشکوٰۃ ۔ باب الجماعۃ وفضلہا) ،،

حضرت سیدنا قطب الاقطاب غوث پاک سید عبدالقادر جیلانیؓ فرماتے ہیں ینبغی للمومن ان یشتغل اولا بالفرائض فاذا فرغ منہا اشتغل بالسنن ثم یشتغل بالنوافل والفضائل فمالم یفرغ من الفرائض فالاشتغال بالسنن حمق ورعونۃ وان اشتغل بالسنن والنوافل قبل الفرائض لم یقبل منہ ولھان فمثلہ کمثل رجل یدعوہ الملک الی خدمتہ فلا یاتی الیہ ویقف بخدمۃ الامیر الذی ھو غلام الملک وخادمہ

وتحت ید ہ وولایتہ عن علی بن ابی طالب قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان مثل مصلی النوافل و علیہ فریضۃ کمثل حبلی حملت فلما دنی نفاسہا اسقطت فلا ہی ذات حمل ولا ہی ذات ولادۃ وکذالک المصلی ولا یقبل اللہ لہ نافلۃ حتی یؤدی الفریضۃ ومثل المصلی کمثل التاجر لایحصل لہ ربحہ حتی یاخذ راس مالہ فکذالک المصلی بالنوافل ولا یقبل لہ نافلۃ حتی یودی الفریضۃ وکذالک من ترک السنۃ وتشتغل بالنوافل المتوبت من الفرائض ولم یحض علیہا ولا یوکذ امرہا فمن الفرائض ترک الحرام والاشراک باللہ عزوجل خلقہ والاعتراض علیہ فی قدرہ وقضائہ واجابۃ الخلق وطاعتہم والاعراض عن امر اللہ و طاعتہ قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ اللہ (ترجمہ) مومن کو چاہیے کہ فرائض میں پہلے مشغول ہو جب فرائض سے فارغ ہو سنتوں میں مشغول ہو پھر عبادت ہائے نافلہ میں مشغول ہو پس جب تک فرائض سے فارغ نہ ہو سنتوں میں مشغول ہوجانا جہالت و رعونت ہے۔ پس اگر فرائض سے پہلے سنتوں اور نوافل میں مشغول ہو تو وہ اس سے قبول نہ کیے جائینگے اور وہ خوار کیا جائیگا۔ پس فرائض کو چھوڑکر سنن و نوافل ادا کرنے والے کا حال اس شخص کا سا حال ہے جسے بادشاہ اپنی خدمت کے لیے بلائے۔ پس وہ بادشاہ کے پاس نہ آئے۔ اور اس امیر کی خدمت میں قیام کرے جو بادشاہ کا غلام وخادم اور اس کے دست قدرت و تصرف میں ہو۔ حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہا فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص کے ذمے فرض ہو اور وہ نوافل پڑھے تو اس کا حال اس حاملہ عورت کے حال سا ہے کہ جب جننے کا وقت آئے تو وہ اسقاط کردے۔ پس (باعتبار انتفاء مقصود) نہ تو وہ حاملہ عورت ہے اور نہ جننے والی ہے یہی حال ہے مصلی مذکور کا۔ اللہ اس سے نماز قبول نہ کریگا۔ یہانتک کہ فرض ادا کرے۔ اور مصلی مذکور کا حال اس سوداگر کے حال کے مانند ہے کہ اس کو منافع نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ اپنا راس مال لے۔

اسی طرح نوافل پڑھنے والے کے نوافل قبول نہیں کئے جاتے یہانتک کہ وہ فرض ادا کرے - اسی طرح اس شخص کا حال ہے جو سنت کو ترک کرے - اور ان نوافل میں مشغول ہو جو فرائض کے ساتھ رواتب ودائمی نہیں اور شارع کی طرف سے ان پر تصریح نہیں کیگئی اور نہ انکی نسبت تاکید کیگئی ہے - پس منجملہ فرائض کے ہے حرام قول وفعل کا - اور اللہ عزوجل کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک ٹھہرانا اور اس کی قضا وقدر پر اعتراض کرنا اور اس کی معصیت میں مخلوق کی فرمانبرداری کرنا اور اللہ تعالے کے امر وطاعت سے روگردانی کرنا کیونکہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ کی نافرمانی کرکے کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں - انتہیٰ (فتوح الغیب مقالہ چہل وششم) ؛

چہارم - اس کی وجہ سے کوئی حق شرعی مثلاً حق اولاد یا حق زن یا حق مہمان وغیرہ فوت نہ ہو جائے - جیساکہ حدیث نمبر۳ سے ظاہر ہے ؛

پنجم - رخصت شرعی کو باطل اور عامل رخصت کو بے عمل نہ سمجھے جیساکہ حدیث نمبرہ کے الفاظ سانہم تقالوھا سے ظاہر ہے ؛

ششم - اس میں غیر واجب کو واجب اور غیر حرام چیز کو حرام کرنا لازم نہ آئے جیساکہ حدیث نمبر۱۷ سے ظاہر ہے ؛

ہفتم - ارکان عبادت کو پورے طور پر بجا لائے یہ جائز نہیں کہ پانسو یا ہزار رکعت پڑھے مگر یوں ادا کرے کہ جیسے مرغ چونچ مارتا ہے یا قرآن مجید مقدار میں زیادہ پڑھے مگر بغیر ترتیل کے یہ ماخوذ ہے ان احادیث سے (۱) عن عبدالرحمن بن شبل قال نھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عن نقرۃ الغراب وافتراش السبع وان یوطن الرجل المکان فی المسجد کما یوطن البعیر رواہ ابوداؤد (ترجمہ) عبدالرحمن بن شبل سے روایت ہے کہا منع فرمایا رسول اللہ صلے اللہ

علیہ وسلم نے کوے کی طرح چونچ مارنے اور درندہ کی طرح ہاتھ پھیلانے اور اونٹ کی طرح مسجد میں خاص مکان اختیار کرنے سے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ (مشکوٰۃ باب السجود)

(۲) عن یعلی بن مملک انہ سأل ام سلمۃ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن قرأۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وصلاتہ فقالت ومالکم وصلاتہ کان یصلی ثم ینام قدر ما صلی ثم یصلی قدر ما نام ثم ینام قدر ما صلی حتی یصبح ثم نعتت قرأتہ فاذا ھی تنعت قرأۃ مفسرۃ حرفا حرفا رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی (ترجمہ) یعلی بن مملک سے روایت ہے کہ اس نے ام سلمہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت اور نماز کی بابت پوچھا۔ پس ام سلمہ رضہ نے کہا۔ تم کیا پوچھتے ہو آنحضرت ؐ کی نماز کی نسبت۔ آپ نماز پڑھتے تھے پھر اسی قدر سوتے تھے پھر بمقدار خواب نماز پڑھتے تھے۔ پھر بمقدار نماز سوتے یہاں تک کہ صبح کر دیتے۔ پھر ام سلمہ رضہ نے آنحضرت صلعم کی قرأت کی کیفیت بیان کی۔ پس انہوں نے بتلایا۔ قرأت کو بیان کرتے کرتے حرف حرف جدا جدا۔ انتہی (مشکوٰۃ باب صلوٰۃ اللیل) ؀

ہشتم۔ اس پر مداومت کرے اور بے عذر ترک نہ کرے عن عبداللہ بن عمرو بن العاص قال قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا عبداللہ لا تکن مثل فلان کان یقوم من اللیل فترک قیام اللیل متفق علیہ (ترجمہ) عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے۔ اس نے کہا کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عبداللہ تو فلاں شخص کی طرح نہ ہو جو رات کو قیام (عبادت) کرتا تھا۔ پس اس نے رات کا قیام ترک کر دیا۔ متفق علیہ۔ (مشکوٰۃ۔ باب التحریض علی قیام اللیل) ؀

آیت رہبانیت میں الفاظ فما رعوھا حق رعایتھا بھی اسی امر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اسی سبب سے مشہور ہے کہ تارک الورد ملعون یعنی ورد وظیفہ کا ترک کرنے والا ملعون ہے۔ وہ جو آیا ہے کہ صاحب الورد ملعون سو یہ ریاکار کے حق میں ہے (دیکھو مرقاۃ جزو ثانی ص ۱۴۱) ۔

نہم ۔ دوسرے مسلمانوں کے ملال کا باعث نہ ہو۔ یہ ماخوذ ہے حدیث ذیل سے عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی احدکم للناس فلیخفف فان فیھم السقیم والضعیف والکبیر واذا صلی احدکم لنفسہ فلیطول ما شاء۔ متفق علیہ (ترجمہ) ابوہریرہ سے روایت ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کہ جب تم میں سے کوئی لوگوں کو نماز پڑھائے تو چاہئے کہ تخفیف کرے کیونکہ ان میں بیمار و کمزور و بوڑھے ہیں اور جب تم میں سے کوئی اکیلا نماز پڑھے تو دراز کرے جس قدر چاہے۔ متفق علیہ۔ (مشکوٰۃ۔ باب ما علی الامام) ۔

دہم ۔ یہ مجاہدت و کثرت باعث نہ ہو اس اعتقاد کا کہ یہ کثرت افضل ہے جناب رسالتمآب اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے اعمال قلیل سے۔ جس شخص میں یہ شروط موجود ہوں وہ احق ہے تشدد فی العبادات کا اور عُبّاد سلف بے شک ان شروط کے جامع تھے۔ ورنہ میانہ روی و توسط مناسب ہے جس میں افراط و تفریط[۱] نہ ہو ۔

۸ ۔ سوال ۔ کیا بیعت صوفیہ کرام کی کچھ اصل ہے ؟

جواب ۔ بعض نادان لوگ خیال کرتے ہیں کہ بیعت قبول خلافت میں منحصر ہے اور بیعت صوفیہ کرام بے اصل ہے۔ مگر ان کا یہ خیال سراسر باطل ہے۔ بیعت صوفیہ کرام کی اصل قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ سورہ ممتحنہ میں ہے ۔

---

[۱] اگر زیادہ تفصیل درکار ہو تو دیکھئے اقامۃ الحجۃ علی ان الاکثار فی التعبد لیس ببدعۃ مولوی ابی الحسنات عبدالحی لکھنوی ۱۲ منہ

یایھا النبی اذا جاءک المؤمنات یبایعنک علیٰ ان لا یشرکن باللہ شیئاً ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادھن ولا یاتین ببھتان یفترینہ بین ایدیھن وارجلھن ولا یعصینک فی معروف فبایعھن واستغفر لھن اللہ ان اللہ غفور رحیم۔ (ترجمہ) اے نبی جس وقت مسلمان عورتیں تیرے پاس اس بات پر بیعت کرتی ہوئی آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائینگی اور نہ چوری کرینگی اور نہ زنا کرینگی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کرینگی اور نہ بہتان لائینگی جس کو باندھ لیں۔ اپنے ہاتھوں اور اپنے پاؤں کے درمیان اور نہ نافرمانی کرینگی تیری کسی امر معروف میں پس تو ان کی بیعت قبول کر اور اللہ تعالےٰ سے ان کے لئے بخشش مانگ۔ بے شک اللہ تعالےٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ انتہیٰ ؏

عن ابی جریر بن عبد اللہ قال بایعت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم علےٰ اقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والنصح لکل مسلم متفق علیہ (ترجمہ) جریر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نماز قائم رکھنے اور زکوٰۃ دینے اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے پر بیعت کی۔ متفق علیہ۔ (مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق) ؏

عن مجاشع قال اتیت النبی صلے اللہ علیہ وسلم بابن اخی فقلت بایعنا علےٰ الھجرۃ فقال مضت الھجرۃ لاھلھا قلت علےٰ ما تبایعنا قال علےٰ الاسلام والجھاد (ترجمہ) مجاشع سے روایت ہے کہا میں اپنے بھتیجے کے ساتھ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ پس میں نے عرض کی کہ آپ ہم سے ہجرت پر بیعت کرلیں۔ پس آپ نے فرمایا کہ ہجرت اہل ہجرت کے لئے گذر چکی ہیں۔ میں نے عرض کی کہ آپ ہم سے کس بات پر بیعت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اسلام اور جہاد پر۔ (بخاری۔ باب البیعۃ فی الحرب علےٰ ان لا یفروا) ؏

عن ام عطیة قالت بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقراء علینا ان لا یشرکن باللہ شیئًا ونھانا عن النیاحۃ۔ الحدیث (ترجمہ) ام عطیہ سے روایت ہے اس نے کہا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ پھر آپ نے ہم پر پڑھا ان لا یشرکن باللہ شیئًا اور ہمیں نوحہ کرنے سے منع فرمایا۔ الحدیث (بخاری باب قولہ اذا جاءک المؤمنات یبایعنک) +

عن عبادۃ بن الصامت قال بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ وعلی اثرۃ وعلی ان لا ننازع الامر اھلہ وعلی ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم (متفق علیہ) (ترجمہ) عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی آسانی اور دشواری اور غمی اور خوشی میں سمع وطاعت پر اور برگزیدگی پر (یعنی غنائم وغیرہ میں آپ جو اوروں کو ہم انصار پر ترجیح دینگے تو ہم صبر کرینگے) اور اس امر پر کہ ہم امیر سے نہ جھگڑینگے اور اس بات پر کہ ہم جہاں بھی ہونگے حق کہینگے اور امر دین میں کسی ملامت کرنے والی کی ملامت سے نہ ڈرینگے (متفق علیہ (مشکوٰۃ کتاب الامارۃ والقضاء) +

اس بارہ میں اور احادیث بھی ہیں جو بخوف طوالت یہاں نقل نہیں کی گئیں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں کہ طریقت کا طلب کرنا اور کمالات باطنی کے حاصل کرنے کی کوشش واجب ہے۔ کیونکہ حق تعالےٰ فرماتا ہے یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ (ترجمہ) اے مومنو! اللہ کی نامرضیات سے پرہیز کرو کمال پرہیزگاری۔ فعل امر وجوب کے لئے آتا ہے اور کمال تقویٰ بغیر ولایت کے متصور نہیں۔ جب طلب طریقت واجب ہوئی تو پیر کامل کی تلاش بھی واجب ہوئی مولانا روم فرماتے ہیں ؎

ہیچ نکشد نفس را جز ظلِّ پیر
دامنِ آں نفس کش محکم بگیر

۹۔ سوال۔ خرقہ درویشی کی اصل کیونکر ثابت ہے؟

جواب۔ خرقہ وبیعت کی نسبت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں لکھتے ہیں کہ اصل اس کی سُنّت سَنیہ ہے۔ خرقہ کی اصل تو لباس آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے کہ جب حضورؐ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضؓ کو امیر لشکر کیا تھا تو عمامہ عطا فرمایا تھا اور بیعت کا وجود خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے مستفیض و یقینی ہے جو پوشیدہ نہیں۔ بعض نے خرقہ کی اصل اس گلیم سیاہ کو بیان کیا ہے جس میں آیہ تطہیر کے نازل ہونے پر جناب رسالتمآب نے حضرت علیؓ و فاطمہؓ و حسنؓ و حسینؓ کو لے کر فرمایا انما یرید اللہ۔۔۔ الآیہ۔ عن ام خالد بنت سعید قالت اُتِیَ النبیّ صلے اللہ علیہ وسلم بثیاب فیھا خمیصۃ سوداء صغیرۃ فقال ائتونی بام خالد فاتی بھا تحمل فاخذ الخمیصۃ بیدہٖ فالبسھا قال اَبلی واخلقی ثم ابلی واخلقی وکان فیھا علم اخضر او اصفر فقال یا ام خالد ھذا سناہ وھی بالحبشۃ حسنۃ قالت فذھبت العب بخاتم النبوۃ فزجر ابی فقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دعھا رواہ البخاری (ترجمہ) ام خالد بنت سعید سے روایت ہے کہا کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس کپڑے لائے گئے۔ جن میں ایک مربع سیاہ گلیم تھی۔ آپ نے فرمایا ام خالد کو میرے پاس لاؤ۔ پس وہ اُٹھا کر لائی گئی۔ آپ نے اس گلیم سیاہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ام خالد کو پہنا دیا (اور دعا کے طور پر) فرمایا تو اسے کہنہ و بوسیدہ کیجو۔ پھر کہنہ و بوسیدہ کیجو۔ اور اس گلیم سیاہ میں ایک نشان تھا پس آپ نے فرمایا اے ام خالد یہ سناہ ہے اور سناہ زبان حبشہ میں حسنہ یعنی اچھی کو کہتے ہیں۔ ام خالد نے کہا پس میں خاتم نبوت کے ساتھ کھیلنے لگی۔ پس میرے باپ نے

مجھے جھڑک دیا - پس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے کچھ نہ کہو - اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے - (مشکوٰۃ - باب اسمار النبی صلے اللہ علیہ وسلم وصفاتہ) اِس حدیث کے تحت میں مولانا علی القاری مرقاۃ میں لکھتے ہیں وقد اشار الشیخ الصمدانی شہاب الدین السہروردی قدس سرہٗ فی عوارفہ ان امثال المشائخ الصوفیۃ فی لبس الخرقۃ بھذا الحدیث اقول ولعلہ اراد الباس الخرقۃ التبرک دون الباس خرقۃ الاجازۃ (ترجمہ) شیخ صمدانی شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ نے عوارف میں اشارہ کیا ہے کہ خرقہ پوشی میں مشائخ صوفیہ کی سند یہ حدیث ہے - میں کہتا ہوں کہ شیخ علیہ الرحمۃ کی مراد شاید خرقہ تبرک کا پہنانا ہے - نہ کہ خرقہ اجازت کا پہنانا - انتہیٰ ۰

۱۰ - سوال - شمار اذکار کے لئے تسبیح کا استعمال کرنا کیسا ہے ؟

جواب - عن سعد بن ابی وقاص انہ دخل مع النبی صلے اللہ علیہ وسلم علےٰ امرأۃ وبین یدیہا نوی او حصی تسبح بہ فقال الا اخبرک بما ھو ایسر علیک من ھذا او افضل سبحان اللہ عدد ما خلق فی السماء الحدیث (ترجمہ) سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک عورت پر گذرا اور اس عورت کے آگے چھوہارے کی گٹھلیاں یا سنگریزے تھے جن کے ساتھ وہ تسبیح کر رہی تھی - پس آپ نے فرمایا دیکھ میں تجھے وہ چیز بتاتا ہوں جو اس سے آسان یا افضل ہے سبحان اللہ عدد ما خلق فی السماء الحدیث - (مشکوٰۃ - باب ثواب التسبیح والتحمید والتہلیل والتکبیر) علامہ علی القاری رحمہ اللہ اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں وھذا اصل صحیح لتجویز السبحۃ بتقریرہ صلے اللہ علیہ وسلم فانہ فی معناہا اذ لا فرق بین المنظومۃ والمنثورۃ فیما یعد بہ ولا یعتد بقول من عدھا بدعۃ وقد قال المشائخ انہا سوط الشیطٰن

وروی انہ رؤی مع الجنید سبحۃ فی یدہ حال انتہائہ فسئل عنہ فقال شیئ وصلنا بہ الی اللہ کیف نترکہ ولعل ھذا احد معانی قولہم النہایۃ ھی الرجوع الی البدایۃ (ترجمہ) اور یہ حدیث تسبیح کے جائز کرنے کے لئے اصل صحیح ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اسکو برقرار رکھا اسلئے کہ تسبیح اس کے حکم میں ہے۔ کیونکہ جس چیز کے ساتھ شمار کیا جائے اس کے پروئے ہوئے اور بے پروئے میں کچھ فرق نہیں۔ اور جس شخص نے تسبیح کو بدعت کہا اس کے قول کا اعتبار نہیں۔ مشائخ نے کہا ہے کہ تسبیح شیطان کا کوڑا ہے۔ اور روایت ہے کہ حضرت جنیدؒ کے پاس انتہائی حال میں تسبیح دیکھی گئی۔ پس اس کا سبب دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا یہ وہ شے ہے جس کے ذریعہ ہم اللہ تک پہنچ گئے ہم اسے کیونکر چھوڑ دیں اور صوفیہ کے قول النہایۃ ھی الرجوع الی البدایۃ (نہایت بدایت کی طرف رجوع کرنا ہے) کے معانی میں سے ایک معنی شاید یہ بھی ہیں۔ انتہیٰ ؛

عن یسیرۃ وکانت من المہاجرات قالت قال لنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم علیکن بالتسبیح والتہلیل والتقدیس واعقدن بالانامل فانہن مسئولات مستنطقات ولا تغفلن فتنسین الرحمۃ۔ رواہ الترمذی وابوداؤد۔ (ترجمہ) یسیرہ سے روایت ہے اور یہ عورتیں مہاجرات میں سے ہے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا تم تسبیح و تہلیل و تقدیس کو لازم پکڑو اور عقدانامل سے شمار کرو۔ کیونکہ انگلیوں سے (قیامت کے دن) سوال کیا جائیگا اور وہ گویا کی جائینگی۔ اور تم غافل نہ رہو ورنہ رحمت سے محروم کی جاؤگی اس کو ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے (مشکوٰۃ۔ باب ثواب التسبیح والتحمید والتہلیل والتکبیر) ؛

مولانا علی القاریؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :

وفیه جواز عدالاذکار وماخذ سبحة الابرار وقد کان لابی ھریرۃ خیط فیه عقد کثیرۃ یسبح بھا وزعم انھا بدعة غیر صحیح لوجود اصلھا فی السنة ولقوله صلی اللّٰه علیه وسلم اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم (ترجمہ) اور اس میں شمار اذکار کے جواز اور نیکوں کی تسبیح کا ماخذ ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضہ کے پاس ایک ڈورا تھا جس میں بہت سی گرہیں دی ہوئی تھیں۔ وہ اس سے تسبیح کیا کرتے تھے۔ اور یہ زعم کہ یہ بدعت ہے صحیح نہیں کیونکہ سنت میں اس کی اصل موجود ہے۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں۔ ان میں سے جس کا اقتدا کروگے ہدایت پا جاؤ گے۔ انتہیٰ۔ ملاعلی قاری دوسری جگہ یوں لکھتے ہیں وصح انه علیه السلام کان یعقد التسبیح بیمینه وورد انه قال واعقدنه بالانامل فانھن مسئولات مستنطقات وجاء بسند ضعیف عن علی رض مرفوعا نعم المذکر السبحة وعن ابی ھریرۃ انه کان له خیط فیه الف عقدۃ فلا ینام حتی یسبح به وفی روایة کان یسبح بالنوی قال ابن حجر والروایات بالتسبیح بالنوی والحصی کثیرۃ عن الصحابة وبعض امھات المؤمنین بل راٰھا علیه السلام واقر علیھا قیل وعد التسبیح بالانامل افضل من السبحة وقیل ان امن الغلط فھو اولی والا فھی اولی۔ (ترجمہ) اور صحیح ہے کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام دائیں ہاتھ سے تسبیح کرتے تھے اور یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تم عقد انامل سے شمار کیا کرو کیونکہ انگلیوں سے سوال ہوگا اور وہ گویا کی جائینگی اور ضعیف سند کے ساتھ حضرت علی رض سے مرفوعاً روایت ہے کہ ذکر کرنے کا اچھا آلہ تسبیح ہے۔ اور ابوہریرہ رض سے روایت ہے کہ اس کے پاس ایک ڈورا تھا جس میں ہزار گرہیں تھیں۔ وہ نہ سوتے تھے۔ یہانتک کہ اس کے ساتھ تسبیح کرلیتے اور ایک روایت میں ہے کہ وہ چھوہارے کی گٹھلیوں کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ ابن حجر نے کہا کہ صحابہ اور بعض امہات المؤمنین سے چھوٹے

کی گٹھلیوں اور سنگریزوں کے ساتھ تسبیح کرنے کی روایات بہت ہیں بلکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا اور برقرار رکھا۔ کہا گیا ہے کہ عقد انامل سے شمار کرنا تسبیح کے ساتھ شمار کرنے سے افضل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر غلطی کا اندیشہ نہ ہو تو عقد انامل بہتر ہے ورنہ تسبیح کے ساتھ شمار بہتر ہے۔ (مرقاۃ جزو ثانی صـ۲۳۲) ؁

مندرجہ بالا سوالات وجوابات بطور مشتے نمونہ از خروارے لکھے گئے ہیں۔ اہل انصاف ان سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ صوفیہ کرام کا طریق کسی امر میں بے سند نہیں اسی وجہ سے حضرت سید الطائفہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے علمنا ھذا مشید بالکتاب والسنۃ۔ یعنی ہمارا یہ علم (تصوف) قرآن وحدیث کے ساتھ محکم ہے۔ بخوف طوالت ہم اس مضمون کو یہاں ختم کرتے ہیں وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علےٰ سید المرسلین وعلےٰ الہٖ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین ؁

التصوّف

تغیر حقیقت تصوّف

دُنیا میں کئی ایک ایسی صداقتیں موجود ہیں جنکی اصلی صورت پر مختلف قسم کے اختراعات کا غبار اس قدر بیٹھ گیا ہے کہ اب ان کی شناخت بھی آسان کام نہیں رہا۔ تصوّف جس کی اصلیت سے کسی مسلمان کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اپنی حقیقت اصلیہ کے متغیر ہو جانے کی رو سے مذکورہ بالا صداقتوں سے ہرگز باہر نہیں جا سکتا۔ کیونکہ جس طرح کسی دوسرے سلسلہ کی ابتدائی حالت اس کے مابعد کی حالت سے آہستہ آہستہ بہت دور جا پڑتی ہے۔ اسی طرح تصوّف کی وہ حالت جو قرون اولے کے

بزرگانِ دین میں موجود تھی۔ موجودہ زمانہ کی حالت سے نہایت متفاوت ہے۔ اگر دلیر اور جری انفطرت آدمی جو اندھی تقلید کے پھندے سے نکل چکا ہو اور تعصب کی زد سے بالکل محفوظ ہو۔ تصوّف کی حقیقت اصلی اور اس کی موجودہ حالت میں موازنہ کریگا تو اسے واضح ہو جائیگا کہ بہت ہی اقل امور میں ہر دو باہم مشابہ ہیں اور ایسے لوگوں کی تعداد جو سلف صالحین کا خاص نمونہ کہلا سکیں صرف انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے اگر اس امر کی صداقت معلوم کرنا چاہو تو بعض متصوفہ حال سے آثار خیرات و برکات اور انکے طریق امر پر نظر کرو۔ اور اس تغیر و انقلاب کی وجہ بجز اسکے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اہلِ ہوا نے دنیا طلبی کے لیے ہر ایک زمانہ میں اپنی اغراض نفسانی کی پیش رفت میں ایسی ایسی باتوں کو مذہبی پیرایہ میں پیش کرنا شروع کر دیا جنکی کتاب اللہ اور سنت صحیحہ میں کوئی اصل نہ تھی۔ رفتہ رفتہ وہ باتیں ایسی راسخ ہو گئیں کہ جزو دین سمجھی گئیں۔ چونکہ ان باتوں کے ماننے والے اپنے جاہل پیشواؤں کی بات کو بمنزلہ وحی سمجھتے رہے۔ اس لیے اُنھوں نے خود کتاب اللہ اور سنّت صحیحہ میں غور کرنا بالکل ترک کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تصوف مختلف انقلابات میں اس درجہ کو پہنچ گیا کہ اُس کی اصل شکل لوگوں کو ہوّا ہو کر نظر آنے لگی۔ اور ہر کس و ناکس کا عرضۂ طعن بنکر مذموم اور قبیح سمجھا جانے لگا۔ ورنہ تصوّف جو گو لفظی پہلو میں بزمانہ نبوّت موجود نہ تھا۔ مگر اس کی حقیقت بزرگانہ صحابہ خصوصًا اصحاب صفہ[1] میں برابر جلوہ گر تھی۔ اور بعد کے اکابر اسلام یعنی تابعین اور تبع تابعین یکے بعد دیگرے برابر اس دولت بے بہا کے مالک چلے آئے حتیٰ کہ یونانیوں کی حکمت اشراق یعنی فلسفہ الٰہیات نے اسلام میں ابتری پھیلانا شروع کر دی۔ اور اکثر متصوفہ کی توجہ اس کی طرف منجذب ہو گئی جس کی بڑی زبردست نظیر فرقہ باطنیہ[2] کے لوگ تھے

[1] بعض صحابہ جو مسجد نبوی کے متصل ایک مکان میں ذکر و عبادت الٰہی میں مشغول رہتے تھے ۱۲ مرتب

[2] باطنیہ جنکو قرامطہ بھی بولتے ہیں وہ لوگ ہیں جو احکام شریعت کے ظاہر کی نسبت یہ خیال رکھتے ہیں کہ انکا ایک باطن بھی ہے اسلیے وہ بزعم خود ظاہر کی تاویل اپنے اصول مسلمہ پر کرتے ہیں اور انکے اصول فلسفہ الٰہیات سے اخذ کئے گئے ہیں جو قریبًا سب کے سب منافی شریعت ہیں۔ بعض غالی متصوفہ نے دین حنیف میں ان اصول کو داخل کرکے بدنام کیا۔ فرقہ باطنیہ کی تفصیل [illegible]

نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اصول تصوّف جس کا اقتباس شعور نبوّت سے کیا گیا تھا ملاحدہ یونان کے اصول سے ایسے مل جل گئے اور اس پر اسقدر رسائل تالیف کیئے گئے۔ کہ ایک ایسے شخص کے لیئے جو کتاب اللہ وسنّت صحیحہ سے محض ناواقف ہو ہر دو میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ یہیں تصوّف اور اہلِ تصوّف کی حقیقت اصلیہ کا ظاہر کرنا نہایت ضروری نظر آتا ہے کیونکہ اس بداعتقادی کے زمانہ میں لوگ محض سوئے ظن کی وجہ سے طلب کمال سے محروم رہ گئے ہیں۔ اور لوگوں کی رائے اور تحقیق کو دین سمجھ چکے ہیں ایک بڑی مشکل یہ آپڑی کہ بعض اکابر علمائے اسلام نے جنکی طبائع پر فلسفیت غالب تھی۔ اُنہوں نے یہ کوشش کرنا شروع کر دی کہ ملحدین فلسفہ کے اصول الٰہیات کو شریعت اسلامیہ کے اصول سے تطبیق دیں چنانچہ اس امر عظیم کی پیش رفت کے لیئے اُنہوں نے اصطلاحات فلاسفہ کا مفہوم آیات واحادیث سے نکالنا چاہا۔ اگر کسی شخص کو اس امر کی تصدیق کرنا ہو تو وہ اسلامی زمانہ کی کتب حکمت اشراق کو مطالعہ کر کے دیکھ لے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ اہل فلسفہ نے عقول عشرہ[1] کا ایک ڈھکوسلا بنا رکھا ہے جو انکے اس اصل پر مبنی ہے کہ الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد (ایک علت سے ایک ہی معلول صادر ہو سکتا ہے) اس لیئے جب اسلامی زمانہ کے بعض اہل فلسفہ نے اس اصل کی شریعت اسلامی سے مطابقت کرنا چاہی۔ تو حدیث اوّل ما خلق اللہ العقل سے جا لپٹے اور اہل تصوّف نے حدیث اوّل ما خلق اللہ نوری کو جا لیا۔ اور فلسفہ اور شریعت اسلامی کو ملا کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایک ہی حقیقت واحدہ کو مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا۔ حقیقت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ وہی ہے جسکو دوسرے الفاظ میں اہل فلسفہ عقل اوّل کہتے ہیں۔ حالانکہ اوّل تو یہ ہر دو علمائے حدیث کے نزدیک ثابت نہیں مگر بایں ہمہ ہم کہتے ہیں کہ ہر دو حدیث مذکورہ بالا ہیں

---

[1] وہ کہتے ہیں کہ ذات باری واحد ہے اسلیئے اسنے اسقدر مختلف اشیا کو بدون وسائط کیسے پیدا کیا ہوگا۔ پس ضروری ہوا کہ اسنے پہلے عقل اوّل کو پیدا کیا ہو۔ اور عقل اوّل نے عقل ثانی کو علیٰ ہذا القیاس عقل عاشر کا نام عقل فعال ہے جسکو مدبر عالم مانا گیا ہے مگر یہ باطل خیال محض صفات باری کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے جس کو قرآن مجید سے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے ۱۲ منہ

اولیت حقیقی واضافی کے اعتبار سے کوئی اشکال عائد نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حمد اولی کے لئے کسی امر کے آغاز میں کہنے کا حکم ہے۔ مگر ایک ہی اولیت حقیقی ہے اور ہیں اضافی ہے۔ بہرصورت خواہ مخواہ اہل فلسفہ کی اصطلاحات اور انکے مفہوم کو وحی سے مطابقت دینے کا خیال بعض اسلامی مصنفین کو دامنگیر ہو گیا تھا جس طرح طرح کی تاویلات رکیکہ سے کام لینا پڑا۔ اگر صرف اسلامی اہل فلسفہ ہی ایسا کوئی بات نہ تھی تعجب ہے کہ بعض متاخرین متصوفہ نے بھی اسی بارہ میں غلو در یغ نہیں کیا۔ حالانکہ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے ہٹ کر کسی دوسرے پر جانیکی انہیں کچھ ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ متصوفہ قرون اولے نے ایک قدم بھی صراطِ مستقیم سے انحراف نہیں کیا۔

مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہو گیا ہوگا کہ عام طور پر تصوّف اور اہل تصوّف کے ہونے کے دو سبب تھے۔ اوّل متصوفہ جاہل جو کتاب اللہ اور سنّت سے بالکل بے تھے یا ناکافی واقفیت رکھنے کی وجہ سے افراط و تفریط میں امتیاز نہ کر سکے اور باطلہ پر مذہبی رنگ چڑھا کر اپنے دام افتادوں کو ان پر معتقد ہونے کی ہدایت کرنے اور چونکہ خود کتاب و سنّت سے ناواقف تھے اس لئے ان کے متبعین کو بدرجہ اس طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ ملا۔ اور اگر کسی عالم علم دین نے بدعات و منکر سے روکنا چاہا تو اس کو ظاہر پرست وہابی ملحد وغیرہ کہا گیا +

دوم متصوفہ اہل فلسفہ جنھوں نے یونانیوں کی حکمت اشراق کو قرآن و سنّت ساتھ خلط کر کے ایک عجیب و غریب معجون مرکب تیار کی۔ اور اصطلاحات فلسفہ مفہوم آیات و احادیث سے اخذ کرنا چاہا۔ واضح ہو کہ اس مرض میں اچھے اچھے علمائے اسلام بھی مبتلا ہوتے ہیں۔ جن کی تصانیف بعد میں بڑی عزت کی نگاہ دیکھی گئیں۔ اور اب بھی بعض اس مذاق کے لوگ اسی عزت سے دیکھتے ہیں

لئے ناظرین کے لئے کوئی زیادہ موجب دلچسپی نہ ہوگا۔ اگر میں ہر دو گروہ کی بعض
ہستیوں کا مفصل ذکر کرنے لگوں اور نہ ہی یہ موقع اس قدر تفصیل کا متحمل ہے
لئے مناسب ہے کہ تصوّف کی اس حقیقت کو ناظرین کے سامنے پیش کیا جائے
کتاب و سنّت ہرگز قابل اعتراض نہیں بلکہ اسلامی تعلیم کا روح رواں ہے
کے اختیار کئے بغیر کوئی شخص کامل الایمان نہیں ہو سکتا ؛

تصوّف کا اشتقاق

لفظ تصوّف کے اشتقاق میں بھی مختلف اقوال ہیں
بعض نے اس کو لفظ صوف سے مشتق بتایا ہے۔
صوفی صوف پوش کو بولتے ہیں۔ مگر نہ صرف صوف پوشی بلکہ اہل تصوّف کے آداب ظاہری
سے آراستہ ہونے کا نام تصوّف ہے اور یہی قول اقرب الی الصواب ہے کیونکہ
جس کی نسبت لفظ صُوف کی طرف کیگئی ہے از روئے ترکیب لغوی بالکل
ہے۔ برخلاف اس کے اگر بقول بعض تصوّف کا مادہ صفہ یا صفا یا صف قرار
ئے تو قیاس لغوی یہ چاہتا ہے کہ انکی طرف نسبت کرنے سے الفاظ صفی
صفی حاصل ہوں نہ کہ صوفی اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض اکابر ملت مثلاً
شیخ عبد القادر گیلانی قدس سرہٗ اور امام محمد غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اس
صفا سے مشتق کیا ہے۔ اور اگر یہ اشتقاق صحیح تسلیم کر لیا جائے تو لامحالہ اس کو
فاعلہ کا صیغہ ماضی مجہول یعنی صوفی قرار دینا پڑیگا۔ جس کو کثرت استعمال سے بسکون
ما گیا اور مجھے اس توجیہ پر ایک گونہ اسلئے یقین ہے کہ بعض اکابر کے کلام میں

شیخ کی عبارت یہ ہے وھو فی الاصل صوفی علے وزن فوعل ماخوذ من المصافات یعنی صافاہ الحق عز وجل ولھذا قیل لصوفی کان صافیا من آفات النفس خالیا من ساتہا لحمید مذاھبہ ملازما للحقائق غیر ساکن بقلبہ الی احد من یعنی صوفی دراصل فوعل کا وزن اور مصافات سے مشتق ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفی ہے جس کو اللہ تعالٰے نے صاف کیا ہے۔ یعنی جو شخص نفس کی آفتوں اور اسکی برائیوں سے صاف ہب نیک پر ہے اور اسکا دل بجز اللہ تعالٰے کے کسی چیز پر آرام نہ پائے ۱۲ منہ

اِس کی تائید میں یہ شعر موجود ہے ؎

وَلَیۡسَ یُشۡھِرُ بِالصُّوۡفِیِّ غَیۡرُ فَتًی
صَافٰی فَصُوۡفِیَ حَتّٰی سُمِّیَ الصُّوۡفِیُّ

حضرت پیر صاحب کے الفاظ امام[1] صاحب کے الفاظ سے اقرب الی الصحت ہیں کیونکہ پیر صاحب فرماتے ہیں وھو ماخوذ من المصافاۃ اور امام صاحب فرماتے ہیں وھو ماخوذ من الصفاء یعنی پیر صاحب نے براہ راست باب مفاعلہ سے مشتق کیا ہے اور امام صاحب نے مصدر ثلاثی مجرد سے اسلئے ہماری مذکورہ بالا توجیہ کے لئے پیر صاحب کی عبارت کافی تائید کرتی ہے ؛

حقیقت تصوّف لفظ تصوّف کے اشتقاق کی نسبت اسکی حقیقت میں اور بھی زیادہ اختلاف ہے مگر تمام تعریفات پر جو مختلف مشائخ رحمہم اللہ سے مروی ہے غور کرنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ سب کا مآل واحد ہے حقیقت تصوّف کے بہت سے ارکان و شرائط اور آداب و لوازم ہیں ۔کسی نے کسی جزو اعظم کو مدِ نظر رکھکر اس کی تعریف کی ہے اور کسی نے اُس کے شرائط و آداب و لوازم کو بطور تعریف لفظی کے ظاہر کر دیا ہے ۔ چونکہ کسی شے کی تعریف سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ اِس کی حقیقت کا ہمیں علم ہو جائے ۔اِس لئے ہم کہہ سکتے ہیں ۔ کہ جن اصحاب نے شرائط و آداب و لوازم کو تعریف تصوّف میں بیان کیا ہے ۔ انکی تعریفات بھی بطور اجمال کسی قدر افادہ کرتی ہیں ۔کیونکہ تعریف لفظی سے بھی عموماً کسی حقیقت کی دوسرے حقائق سے تائید حاصل ہو جاتی ہے ۔ کما ھو مصرح فی موضعہٖ

[1] آپ کی عبارت یہ ہے ۔ تجرید القلب للہ واحتقار ما سواہ وھو ماخوذ من التصفیۃ لتصفیۃ القلوب ۔ یعنی تصوف دل کو محض اللہ تعالیٰ کے لئے علیحدہ کر لینے اور اس کے ماسوا کو حقیر جاننے کا نام ہے ۔اور وہ صفا سے مشتق ہے ۔ کیونکہ وہ دل کو صاف کرتا ہے ۱۲ منہ

ذیل کی عبارات میں غور کرو :-

(ا) تصوف تمام اخلاق رذیلہ سے علیحدہ ہونے اور تمام اخلاق فاضلہ سے متصف ہونے کو بولتے ہیں ؃

(ب) حالات واردہ کا منتظر اور ادب شرعی کے ساتھ لازم رہنا تصوف ہے ؃

(ج) اپنے اوقات کو ایسے امور میں لگانا جن کا ان اوقات میں پورا کرنا نہایت ضروری ہے۔ (امور سے مراد ذکر عبادات ہیں یا ان کے اسباب ضروریہ) ؃

(د) تصوف تمام تعلقات سے الگ تھلگ ہو کر اللہ تعالےٰ کے حضور میں حاضر رہنے کو بولتے ہیں۔ قطع تعلقات سے مراد تعلقات کا دل سے اُٹھا دینا ہے۔ نہ سلسلۂ اسباب کی ضروری پابندی ظاہری سے علیحدہ ہونا ؃

(ہ) تصوف یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ تجھے اپنی ہستی سے زندہ کردے ؃

(و) تصوف اللہ تعالےٰ کے ساتھ مِلکر بیٹھنے کو کہتے ہیں۔ اس حال میں کسی قسم کی فکر دامنگیر نہ ہو ؃

(ز) تصوف حقائق و معارف کے حاصل کرنے اور اہل دُنیا سے بکلّی ناامید ہو جانے کو کہتے ہیں ؃

(ح) تصوف نفس کو لوازم عبودیت کی مشق کرانے کا نام ہے ؃

(ط) تصوف اخلاق حسنہ کا نام ہے۔ اور جو شخص اس سے زیادہ حقیقت تصوف کو بیان کرے وہ زائدیات کہتا ہے جو داخل تصوف نہیں ؃

(ی) تصوف ظاہر و باطن میں آداب شرعیہ کے ساتھ قائم ہونے کو بولتے ہیں اِس طرح کہ ان کا اثر ظاہر سے باطن پر اور باطن سے ظاہر پر پہنچ جائے - اِن

لہ یعنی اعتقادات صحیحہ اور فرائض و سنن کی پابندی کرنے کے بعد - اسلئے کوئی کافر یا بدعتی مسلمان کسی ایسے اخلاق سے متصف نہیں ہو سکتا ۱۲ منہ

ہر دو جہت پر حاوی ہونے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو کمال حقیقی حاصل ہو جاتا ہے (الخ)۔ تصوف اللہ تعالےٰ کے ساتھ صدق برتنے اور مخلوقات کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنے کو کہتے ہیں ؎

مذکورہ بالا تعریفات کے علاوہ اور بھی کئی ایک تعاریف کتب تصوّف میں مسطور ہیں۔ مگر ناظرین کو حقیقت تصوّف کے سمجھنے کے لئے اسی قدر کافی ہے اور غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ صرف الفاظ کا اختلاف ہے ورنہ مآل سب کا ایک ہی آ کھہرتا ہے: یعنی معتقدات صحیحہ کے حاصل کرنے کے بعد تمام احکام شریعت فرائض وسنن و نوافل کی کامل پابندی کرنا اور نفس کو اس حد تک شریعت کا پابند بنانا کہ خواہش نفس کے آثار بالکل منقطع ہو جائیں تا آنکہ رفتہ رفتہ دلکو حقیقی اطمینان کا درجہ حاصل ہو جائے یعنی بجز ذکر خدا کوئی چیز اس کو لذت نہ دے اور نہ اس کو مرکز اطمینان سے جنبش دیسکے اسی حالت کو جب زیادہ ترقی دیجائے تو طہارت کلی کا رتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں اگر غیر اللہ سے ایسے شخص کا تعلق بظاہر نظر آئے۔ تو یوں سمجھنا چاہئے کہ وہ اللہ ہی کے لئے ہے یعنی خواہش نفس اسے نہ تو کسی کی مخالفت پر آمادہ کرتی ہے۔ نہ اسکی محبّت پر بلکہ اس کی کسی سے مخالفت اسکی غیرت ایمانی کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کا کسی چیز یا شخص سے محبّت کرنا حکم قرآنی کا متبع۔ الغرض تصوّف کا اصل منشا نفس کے آثار کو بالکلیت محو کرکے اس کو اللہ تعالےٰ کے ارادہ و رضا سے تابع بنانا سمجھو ایک عارف کامل اور مقرب بارگاہ حق کی اس عبارت میں غور کرو جس کا ترجمہ یہ ہے کہ طریقہ صوفیائے کرام کی پہلی شرط یہ ہے کہ بجز اللہ تعالیٰ کی حقیقی محبت کے تمام اشیاء کے خیال سے فضائے دلکشائے قلب کو پاک وصاف کر دیا جائے۔ اور اس طریق کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے۔ کہ قلب ذکر الٰہی میں مستغرق ہو جائے۔ اور یہ استغراق ذکر اس طریق میں سلوک کرنے کے ساتھ وہی نسبت رکھتا ہے جو تکبیر

تحریمہ کو آغاز نماز سے نسبت ہے اور اس طریق کا انتہائی مرحلہ یہ ہے کہ آثار نفس بالکلیت محو ہو کر متصف بہ اوصاف الہٰی ہو جائے جس کو اصطلاح تصوف میں فنا فی اللہ[1] کہتے ہیں ؎

شریعت اور حقیقت

اس امر کا واضح کر دینا نہایت ضروری ہے کہ مرتبہ حقیقت محض مذکورہ بالا طریق تصفیہ و تزکیہ سے حاصل ہو سکتا ہے اور تصفیہ اور تزکیہ کامل اتباع شریعت کا نتیجہ ہے۔ یعنی ورع[2] اور تقوی میں یہانتک استقامت پیدا کرے کہ رخصت[3] سے تجاوز کر جائے اور جب اس پایہ کو حاصل کرے تو اس پر اسرار حقیقت کا انکشاف ہونے لگتا ہے۔ اور یہ طریق عین منشائے شریعت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اسی مقام پر ایک عارف کامل لکھتے ہیں کل طریقة تخالف الشریعة فهی کفر و کل حقیقة لا یشهد لها الکتاب والسنة فهی الحاد وزندقة۔ یعنی جو طریق مخالف شریعت حقہ ہے وہ کفر ہے اور جس حقیقت پر کتاب اللہ و سنت صحیحہ شاہد نہیں وہ الحاد زندقہ ہے۔ چنانچہ دوسرے موقعہ پر اسی امر کو یوں ظاہر کیا گیا ہے کہ طالب صادق کو سب سے اول شریعت کے اوامر و نواہی سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ اور تقوی اور طہارت کا پابند ہونا جس کو طریقت بولا کرتے ہیں پابندی شریعت کا نتیجہ ہے۔ اور ان مراتب کے بعد وصول الی المقصد یعنی نور تجلی کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے۔ جس کا نام حقیقت ہے دراصل یہ ہر سہ مراتب شریعت ہی کے کمال اتباع کا نتیجہ ہیں۔ یعنی رسم و عادت کے طور پر پابندئ شریعت سے گذر کر حقیقی تقوی و طہارت کو حاصل کرنا جس سے ذکر میں لذت اور لذت سے استغراق اور محویت ہونے لگے۔ اس کو یوں بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ طہارت شریعت بذریعہ

---

[1] تخلقوا باخلاق اللہ [2] تقوی حلال وحرام میں امتیاز کرنیکا نتیجہ ہے اور ورع وہ ہے کہ مباح اشیاء کے ترک کو کہتے ہیں۔ اس خیال پر کہ انکے استعمال سے کسی ناجائز کے ارتکاب کا اندیشہ ہو یہ خواص کا درجہ ہے [3] رخصت سے مراد اصطلاح شرعی میں بلکہ ان اشیاء سے صرف ہونیکا نام ہے جسکو شرعاً جائز سمجھا گیا ہے مگر اہل طریقت کے ہاں منع ہے مثلاً شرعاً بعد ادائے زکوٰۃ زر و سیم کی جمع کرنی گناہ نہیں مگر اہل طریقت کے ہاں حرام ہے یا شرعاً غیبت سے روزہ بقول جمہور فاسد نہیں ہوتا مگر اہل طریقت کے ہاں روزہ جاتا رہتا ہے علی ہذا القیاس

وضو اور غسل کے اور طہارت طریقت ہوائے نفس کے ترک کرنے پر حاصل ہوتی ہے اور طہارت حقیقت تمام غیر اللہ سے قلب کو پاک کر دینے پر منحصر ہے۔ یہی بزرگ اس قدر لکھنے کے بعد فرماتے ہیں فمن زعم ان العبور من حجب البشریۃ والوقوف علی اسرار الطریقۃ والحقیقۃ بما یخالف الشریعۃ فقد طغی وغلبت علیہ الضلالۃ والنسیان واستھوتہ الشیاطین فی الارض حیران حتی القتہ فی اودیہ الھجران واھلکتہ فی قیعان الخسران۔ یعنی جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ آثار بشریت سے گذرنا اور اسرار حقیقت پر مطلع ہونا۔ کسی طریق مخالف شریعت سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ شخص خدا کا سرکش ہے اور وہ ضلالت و نسیان کے گڑھے میں پڑا ہے اور شیاطین اسے ادہر اُدھر سراسیمہ کرتے ہیں حتی کہ وہ ناکام ہی ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر وہ زیان اُٹھا کر دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔

فنا فی اللہ

مذکورہ بالا فقرات میں فنا فی اللہ کا لفظ مستعمل ہوا ہے مجھے اس کی مزید تشریح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ بعض ناواقفان اہل طریق کے اکثر اصطلاحات پر نکتہ چینی کیا کرتے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ کوئی علم یا کوئی فن آج تک دُنیا میں بلا اصطلاحات مروج نہیں ہوا۔ تفسیر حدیث فقہ اصول تاریخ حساب۔ ہندسہ طب وغیرہ سب کے سب اصطلاحات پر مبنی ہیں۔ اور اصطلاحات کا بڑا فائدہ یہ ہوا کرتا ہے کہ بجائے اسکے کہ بار بار ایک لمبی عبارت کا اعادہ کیا جائے۔ صرف ایک ہی لفظ سے وہ کام لیا جاتا ہے۔ جس طرح ضمائر کے استعمال کا رواج بغرض اختصار ہر ایک زبان میں پایا جاتا ہے تصوف بھی ایک علم ہے جس میں مجاہدت و ریاضت اور کیفیات و واردات قلبی سے بحث کی جاتی ہے۔ اس لئے دیگر علوم کی طرح یہ بھی چند اصطلاحات پر مشتمل ہے۔ جب تک ہمیں ان اصطلاحات کا علم نہیں ہوگا۔ ہم اس طریق کے اکابر کے کلام نہیں سمجھ سکیں گے۔ گو نفس تصوف محتاج اصطلاحات نہیں مگر افادۂ غیر کے لئے اس کی ضرورت سے ہرگز انکار نہیں ہو سکتا۔ ان سطور سے ناظرین

بخوبی واضح ہوگیا ہوگا کہ حضرات آئمہ متصوفین رحمہم اللہ نے شریعت محمدیہ علے صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کو وصول الی الحق کا موقوف علیہ تسلیم کیا ہے اور بجز کامل اتباع شریعت کے کوئی شخص صفائی قلب کا رتبہ نہیں پاسکتا۔ مگر تعجب یہ ہے کہ طعن کرنے والوں نے تصوّف اور اہل تصوف کی حقیقت کو مخالف شریعت حقہ خیال کر کے گاہ وبیگاہ حد اعتدال سے تجاوز کیا ہے۔ اور یہ نہیں سمجھا کہ حقیقی تصوّف صرف اسی طریق حق کا نام ہے جو حضور علیہ السلام سے اکابر مشائخ تک پہنچا۔ مگر طعن کرنے والے اصحاب کسی حد تک معذور بھی ہیں۔ کیونکہ انہیں اہل تصوّف میں اس قسم کی مثالیں بھی نظر آئیں جنہوں نے بلحاظ احکام شریعت بہت سے بدعات منکرہ کو اس طریق میں داخل کر لیا۔ بلکہ اصل حقیقت کو چھوڑ کر چند ایک مختلف فیہ امور کو انہوں نے اپنے طریق کا نشان قرار دیا حالانکہ طریق تصوّف اس قسم کی جعل سازیوں سے بالکل پاک وصاف ہے۔ ان سطور سے مجھے اس امر کا واضح کرنا مدنظر ہے کہ طریق تصوّف کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے کوئی علیحدہ طریق نہیں جس پر کسی قسم کا اعتراض عائد ہوسکے۔ جو لوگ سلوکِ طریقت کے لئے شیخ کامل کی ضرورت تسلیم کرتے ہیں وہ فنافی الشیخ اور فنافی الرسول اور فنافی اللہ ہر سہ اصطلاحات کا عموماً استعمال کیا کرتے ہیں۔ اور یہ الفاظ کامل اتباع شیخ کامل اتباع سنّت اور کامل تخلق باخلاق اللہ کے مفہوم سے زیادہ اور کچھ ظاہر نہیں کرتے۔ میرے خیال میں یہ مفہوم ہرگز مخالفِ شریعت نہیں۔ کیونکہ جب تک ہم صلاح وتقویٰ کے لئے اپنے سامنے کامل عملی نمونہ نہ پائیں افراط وتفریط کا اندیشہ برابر رہتا ہے۔ کچھ شک نہیں۔ کہ کتاب وسنّت سے زہد وتقوٰی کا علم حاصل کرنا کچھ اور چیز ہے۔ اور اس کو کسی مرد خدا یعنی عارف کامل کی عملی حالت سے اخذ کرنا اور چیز ہے۔ پہلی صورت صرف قال ہی قال ہے اور دوسری میں قال وحال ہر دو ہے۔ اگر اس کا ثبوت چاہو تو کسی ایک مسلمان کتاب وسنّت کی حالت میں غور کر کے دیکھ لو کہ وہ شریعت کے تمام اوامر ونواہی

کا علم رکھتے ہیں۔ مگر رذائل نفسانی سے ہرگز پاک نہیں ہوتے۔ اور اگر کوئی شخص اس امر کا مدعی ہے کہ ہر ایک آدمی بغیر کسی عارف کامل کی مصاحبت کے صرف رسمی عبادات سے تصفیہ و تزکیہ حاصل کر لیتا ہے تو میں اسے کاذب سمجھتا ہوں۔ مجھے کئی ایک ایسے علمار کا تجربہ ہے جو علم و فضل میں مسلم ہیں اور اوامر و نواہی کے بھی پورے پورے پابند ہیں مگر رذائل نفسانی یعنی غصہ۔ حسد۔ غرور۔ حرص۔ شہوت۔ ریا۔ بخل وغیرہ سے ہرگز محفوظ نہیں۔ برخلاف اس کے بعض ایسے کم علم لوگوں کا بھی مجھے علم ہے جو کسی کامل کی مصاحبت سے مذکورہ بالا رذائل سے محفوظ ہیں ؎

تا نیفتد بر تو مردے را نظر از وجود خویش کے یابی خبر

اس معاملہ میں حجت بازی سے کام نہیں چلتا۔ اور یہ مان لینے کی بات ہے۔ صورتِ انکار اور تو کچھ نہیں مگر انسان فیض باطنی اور حقیقت فہمی سے کوسوں دور جا پڑتا ہے۔ اور رسمی عبادات میں عمر کھو دیتا ہے۔ جن میں چاشنی محبت اور ذوق عرفان نام کو بھی نہیں ہوتے۔ تعجب ہے کہ جسمانی امراض کے لئے تو لوگ اکثر اور طبیب کے پاس لوگ دوڑے جاتے ہیں مگر روحانی امراض کے لئے کسی عارف کامل کی ضرورت کو محسوس نہیں کرتے۔ اگر کتاب اللہ اور سنت صحیحہ کا علم بھی موجب اصلاح و فلاح ہوتا تو تمام علمائے دین عارفانِ کامل بنگئے ہوتے ؎

اگر ژالہ ہر قطرہ دُرّ شدے
چو خرمہرہ بازار ازو پُر شدے

سو جس طرح کتب طب سے ہر ایک شخص بلا تعلیم اُستاد و تجربہ مستفید نہیں ہو سکتا اِسی طرح کتاب و سنت کے علمی اور عملی کمال کے لئے اساتذہ فن اور مشائخ کامل کی ضرورت ہے ؎

الغرض محض اصطلاحاتِ قوم کو اِن کے معانی اصلیہ پر محمول نہ کرنے سے لوگوں

نے بسا اوقات بہت سی صداقتوں کا انکار کر دیا ہے۔ اور جب کبھی کوئی جاہل صوفی مقابلہ پر کمر باندھتا ہے تو یہی معاملہ تکفیر و تفسیق تک پہنچ جاتا ہے۔ مگر ضد اور تعصب کو چھوڑ کر اگر حق پژوہی کی نیت سے کسی حقیقت کا پتہ لگایا جائے تو ممکن نہیں کہ کسی کو مجالِ انکار ہو۔ اسی مضمون کو ایک امام کتاب و سُنّت نے اس مختصر جملہ میں بیان کیا ہے واذا فہمت المعانی فلا مشاحۃ فی الالفاظ یعنی جب تو معانی مطلب کو سمجھ چکے تو ان کو جن الفاظ سے تو چاہے تعبیر کرے ؛

انکار جس طرح انبیا علیہم السلام کی حقیقتِ نبوت کو عامۂ جہال نہ سمجھ کر اکثر تکذیب کر دیا کرتے تھے۔ اسی طرح متصوفہ کرام رحمہم اللہ کا بھی انکار کرنے والے ہر ایک زمانہ میں موجود رہے ہیں۔ چنانچہ ابن جوزی جیسے محدّث نے بھی بڑے زور شور سے بڑے بڑے اکابر اہلِ عرفان حتّیٰ کہ جنید اور شبلی جیسے ائمۂ طریق پر بھی حملہ کر ہی دیا۔ اور یہی الفاظ طریق قوم کا انکار کیا ولعمری لقد طوی ھؤلاء بساط الشریعۃ طیًّا فیا لیتھم لم یتصوفوا یعنی مجھے اپنی جان کی قسم ہے۔ کہ ان لوگوں (متصوفہ) نے شریعت کی بساط کو لپیٹ دیا ہے۔ اے کاش کہ یہ لوگ طریق تصوّف کو اختیار نہ کرتے۔ مگر میں کہتا ہوں۔ کہ اس قسم کے الفاظ لوگ ائمۂ علیہم الرحمۃ کے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ گو یہ غلطی محض حقیقت نافہمی کا نتیجہ تھی۔ ورنہ انہیں لوگوں میں سے کئی ایک اکابر ائمۂ دین انکار کے بعد اقرار پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ امام عبدالوہاب شعرانی دیباچہ لواقح الانوار میں لکھتے ہیں الا ان الانکار علی ھذہ الطائفۃ لم یزل علیہم فی کل عصر و ذلک لعلو ذوق مقامہم علی غالب العقول ولکنہم لکما لہم لا یتغیرون کما لا یتغیر الجبل یعنی اس گروہ کے برخلاف ہر ایک زمانہ میں برابر انکار رہتا رہا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس مقام تک ان لوگوں کو ترقی ہو جاتی ہے۔ عامۂ عقول اس کے سمجھنے

سے قاصر ہوتی ہیں۔ مگر یہ لوگ ان منکرین کی کچھ پرواہ نہیں کیا کرتے بلکہ پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہتے ہیں۔ امام موصوف نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں طریق تصوف کے متعلق ایک دلچسپ بحث لکھی ہے۔ ہم اس کا خلاصہ ناظرین کے پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ اہل تصوّف کا طریق انبیاء و اصفیاء علیہم السّلام کے قدم بقدم چلا ہے اور یہ اس وقت تک ہرگز مذموم نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ صریح آیات احادیث اور نیز اجماع امّت مرحومہ کے مخالف نہ ہو۔ اور اگر کوئی بات ہر سہ معیار مذکورہ بالا کے مخالف نہ ہو اور کسی کی سمجھ میں نہ آسکے تو اس کو اختیار ہے کہ اس پر عامل ہو یا اس کو ترک کردے۔ اور انکار کرنے کی وجہ بجز سوئے ظن کے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ تصوّف سے مراد وہ حقیقی نورِ علم ہے جو کتاب اللہ اور سنّت صحیحہ پر بروجہ کمال عمل کرنے سے اولیاء اللہ کے دلوں میں چمکا کرتا ہے۔ سو جو شخص ظاہر و باطن میں کامل اتّباع کریگا اس پر ایسے معارف و حقائق و اسرار و دقائق کا افاضہ ہوگا۔ جن کی وصف سے امام قاصر ہیں پس تصوّف آدمی کے متبع کتاب و سنّت ہونے کا نتیجہ ہے۔ اس صورت میں کہ اس کے اعمال ہوائے نفس اور دیگر اغراض نفسانی سے بالکل پاک وصاف ہو جائیں۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے علم معانی و بیان جو بجز علم نحو کے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس مثال سے علم نحو اور معانی کے جاننے والے بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ مسائل نحو اور مسائل معانی میں بڑا فرق ہے۔ یعنی نحو چند ایسے علمی مسائل کا نام ہے۔ جن سے ہم صحت کلام کی استعداد حاصل کرتے ہیں۔ اور علم معانی میں مسائل ذوقیہ کا بیان ہوتا ہے۔ جن سے صرف مذاق صحیح والے لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اسی طرح کتاب اللہ اور سنّت صحیحہ اعمال صالحہ کی علمی صورت بتلاتے ہیں۔ اور تصوّف انہیں اعمال کی روحانی تاثیرات پر مبنی ہے۔ جنکی حقیقت سے صرف صحیح المذاق لوگ آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی

شخص علمِ معانی کو عین علم نحو کہدے تو بالکل بجا ہے۔ اور اگر اعتباری طور پر ان میں فرق کرے تب بھی صحیح ہے۔ اسی طرح تصوف بھی یا تو عین شریعت ہے یا پابندی شریعت کا نتیجہ۔ مگر یہ بات ضروری ہے کہ تصوف کی حقیقت سے بجز ایک متبحر فاضل کے جس نے احکام کی کیفیت وکمیت کو خوب سمجھ رکھا ہو کوئی شخص اچھی طرح سے واقف نہیں ہو سکتا۔ سو جس طرح علمائے شریعت کتاب اللہ اور سنّت صحیحہ میں صحیح غور و فکر کرنے سے احکام جزئیہ کا استنباط کیا کرتے ہیں اور اصولِ اجتہاد سے جائز و ناجائز کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح اہل تصوف بھی سالک کے لئے ایسے آداب و شرائط تجویز کرتے ہیں جنکا منبع شریعتِ اسلامی ہوا کرتا ہے۔ اور جس طرح کوئی مجتہد اپنے اجتہاد کو کبھی غیر کے لئے واجب الاتباع نہیں بنا سکتا۔ اسی طرح کوئی صاحب مقام ولی اللہ اپنے ذوق یا کشف وغیرہ سے کسی امر کو دوسروں کے لئے واجب الاتباع قرار نہیں دے سکتا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کو نہایت مفصّل الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مجتہدین شریعت اور مجتہدین طریقت سب کے سب راستباز اور عدول لوگ ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خدمت شریعت کے لئے برگزیدہ کر لیتا ہے۔ اس لئے جو شخص نظر دقیق سے کام لیگا اُسے معلوم ہو جائیگا کہ اہل اللہ کے علوم ہرگز شریعت سے باہر نہیں جا سکتے اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ کیونکہ شریعت ہی تو ان کے لئے وصول الی اللہ کا ایک ذریعہ ہے۔ اور وہ ایک آن کے لئے بھی طریق شریعت سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ منکر کے انکار کی وجہ کتاب و سنّت میں پوری مہارت نہ رکھنے کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں علمنا ھذا مشید بالکتاب والسنۃ۔ یعنی ہم اہل تصوف کا علم کتاب و سنّت کے ساتھ مضبوط کیا گیا ہے۔ اور محققین نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ

اِس طریق میں ایک ایسا شخص جو قرآن مجید او راحادیث شارع علیہ السلام کے مضمون اور اُن کے خاص و عام اور ناسخ و منسوخ اور حقیقت و مجاز و غیرذلک سے بالکل بے خبر ہے کچھ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا - یہی وجہ ہے کہ ہر ایک صوفی کے لیے عالم کتاب و سنّت ہونا ضروری ہے - نہ برعکس - الغرض انکار کی وجہ بجز غرور و جہل کے اور کچھ نہیں ہو سکتی - امام قشیری اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ آجتک اسلام پر ایسا کوئی زمانہ نہیں گذرا جس میں اس زمانہ کے بڑے بڑے علما ء راسخون فی العلم نے اپنے زمانہ کے شیخ کامل کے سامنے زانو ادب تہ کرکے اس سے استفاضہ نہ کیا ہو اور اگر اس فرقہ مقدسہ کے لوگوں میں کچھ خصوصیت نہ ہوتی تو معاملہ برعکس ہوتا - مگر میں کہتا ہوں - کہ ہمیں اِس فرقہ مبارکہ کی صداقت اور حقانیت پر مفصلہ ذیل بزرگانِ شریعت کی نظیر کافی ہے ؛

امام شافعی علیہ الرحمتہ نے باشارہ امام احمد حنبل علیہ الرحمتہ قطب وقت شیبان راعی قدس سرّہٗ سے سوال کیا - کہ آپ اس شخص کی نسبت کیا فتویٰ دیتے ہیں جس کو نماز سے نسیان ہو جائے - اور نہ جانتا ہو کہ کونسی نماز تھی - اُنہوں نے جواب دیا کہ ایسا شخص اللہ تعالےٰ کے ذکر سے غافل ہو گیا ہے اُسے تنبیہ و تہدید کرنا چاہیئے - امام رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کے طریق حق کی تصدیق کی ؛

امام احمد علیہ الرّحمتہ کا قاعدہ تھا کہ فقہ کے دقیق سے دقیق مسائل کو بغرض استفسار شیخ وقت ابو حمزہ[1] بغدادی قدس سرّہٗ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے اور شیخ کے جوابات سے پورا پورا اطمینان حاصل کرتے ؛

امام ابو العباس بن شریح جب حضرت جنید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر

[1] ابو حمزہ رض کے متعلق کتب سیر میں لکھا ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص طریقت کا علم حاصل کر لیتا ہے اس پر سلوک آسان ہو جاتا ہے اور یہ وہ علم ہے - جو عارف کو تعلیم الٰہی سے حاصل ہوا کرتا ہے - اور جو شخص استدلال عقلی کے پیچھے پڑتا ہے وہ کبھی تو ٹھیک جاتا ہے اور کبھی گمراہ ہو جاتا ہے - اور سہل … کے اقوال افعال و احوال طریقت کی مخالفت سے محفوظ نہیں رہ سکتا ۱۲ منہ

سے تو بعد مصاحبت فرمانے لگے کہ اس شخص کا کلام نہایت دقیق ہے جس کا
سمجھنا آسان نہیں۔ ہاں اس میں ایک غیر معمولی حشمت و شوکت بھی مضمر ہے۔ جو
کسی جھوٹے مدعی کو ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی ۔
محدث ابو عمران رحمتہ اللہ علیہ جب حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں
حاضر ہوئے تو حیض کے متعلق چند ایک دقیق سوالات میں آپ کا امتحان کیا آپ نے
ساتھ ایسے مسائل کا افادہ کیا جس کی نسبت ابو عمران کا بیان ہے کہ انہیں پہلے
انکا ہرگز علم نہ تھا ۔
شیخ قطب الدین ابن امین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل رضی اللہ
عنہ اپنے بیٹے کو محبت مشائخ کبار کی بابت ہمیشہ وصیت کیا کرتے۔ اور فرماتے کہ
ان لوگوں کو اخلاص حقیقی کا وہ رتبہ حاصل ہے جو ہمیں حاصل نہیں۔ اس قسم کے
مختلف نظائر کے لئے رسالہ امام قشیری اور امام یافعی کی روض الریاحین کا مطالعہ
کرنا نہایت ضروری ہے ۔
امام ابو تراب نخشبی علیہ الرحمتہ جو اہل طریقت کے ایک بڑے مقتدا تسلیم کئے
ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص اللہ تعالےٰ سے منہ پھیر لیتا ہے تو اس کا پہلا
نشان یہ ہے۔ کہ وہ اولیاء الرحمان کے حق میں زبان طعن دراز کیا کرتا ہے۔ اور میں نے
اپنے شیخ ابو یحییٰ زکریا انصاری رحمتہ اللہ علیہ کو یہ فرماتے سنا کہ جب کسی فقیہ کو اہل طریقت
کے احوال اور انکی اصطلاحات کی خبر نہیں تو انہیں برہنہ پا سمجھو ۔
شیخ محمد مغربی شاذلی علیہ الرحمتہ فرمایا کرتے کہ کبار اہل طریقت کی پیروی کرو
گرچہ ان کا وجود بہت قلیل ہے اور جو لوگ اہل طریقت نہیں ان سے بچتے رہو۔
گرچہ وہ کثیر التعداد ہوں۔ اور اہل طریقت کی حقانیت پر موسیٰ اور خضر علیہما السلام
کے واقعہ میں غور کرنا اس امر کی کافی دلیل ہے۔ کہ اہل طریقت کی تلاش کرنا طالب مولےٰ

کے لئے واجب ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کا خضر علیہ السلام سے یوں مستدعی ہونا هل اتبعك على ان تعلمنی مما علمت رشدا ۔ (آیا میں تیری پیروی کروں اس شرط پر کہ تو اپنے خداداد علم سے مجھے صلاح و تقویٰ کی تعلیم کرے) کسی دنیوی غرض پر مبنی نہ تھا ۔ سو جس طرح علم شریعت کا حاصل کرنا فرض ہے ۔ اس طرح علم حقیقت کا حاصل کرنا بھی شیخ محی الدین ابن عربی نے ایک رسالہ امام فخرالدین رازی صاحب تفسیر کبیر کو ارسال کیا تھا ۔ جس میں انہوں نے امام کے علم و فضل ظاہری کی پایگاہ کو تسلیم کرکے انہیں بے خبر اور بے علم ثابت کیا ۔ اس رسالہ کا خلاصہ حسب ذیل ہے :۔

میرے بھائی خدا ہمیں توفیق دے ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اہل حقیقت کے نزدیک انسان کامل العلم نہیں ہوتا ۔ جب تک کہ وہ منقولات و معقولات کی اصطلاح پرستی سے آگے نہ نکل جائے ۔ کیونکہ جو شخص محض تقلیدی طور پر اپنے اساتذہ اور شیوخ کے علم تک محدود رہتا ہے وہ جزئیات کی چھان بین میں اپنی عزیز عمر کو کھو دیتا ہے اور مقصود اصلی سے برطرف پڑا رہتا ہے ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جزئیات کی کوئی حد محدود نہیں ۔ اور کما لہا ان کا اخذ کرنا محال ہے ؀

عزیز من ۔ اگر تو کسی اہل اللہ کی مجلس میں بیٹھ کر حقیقت شریعت سے آگاہ ہو تو وہ تجھے بہت جلد شہود حق کے رتبہ تک پہونچا دیگا ۔ جس سے تجھے بلا تکلف خدا تعالیٰ کی طرف سے علوم حقیقت عطا ہونے لگینگے ۔ یہ یاد رکھ کہ استدلال سے جو علم حاصل ہوتا ہے ۔ اس کو ان علوم حقیقت کے ساتھ کچھ نسبت نہیں ہے ۔ کیونکہ نظر و فکر چند ایک عقلی ڈھکوسلوں کا نام ہے جسکا حاصل حقیقت فہمی میں بہت ہی کم تعلق رکھتا ہے ۔ اور شیخ کامل ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ علمائے ظاہر کو جو جزئیات میں باہم نوک جھوک جاری رکھتے ہیں ۔ فرمایا کرتے تھے کہ تم

ک مردوں سے علم سیکھتے ہو۔ اور اہلِ حقیقت حی لا یموت سے ۔

عزیزِ من۔ ضروری ہے کہ تو وہ علوم حاصل کرے جس سے تیری ذات کو کمال حقیقی حاصل ہو اور جو مرنے کے بعد بھی تیرے ساتھ ہو۔ اور یاد رکھ کہ علوم وہی ہیں جو بطور موہبت اور مشاہدہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے دئے جاتے ہیں۔ اِن علوم کے سوا جس قدر علوم ہیں انکی منفعت انسان کی زندگی تک محدود ہے۔ اس کے بعد وہ اِن علوم سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ سو عاقل آدمی کو واجب ہے کہ وہ انہیں علوم کے حصول کی کوشش کرے۔ جو اس عالم فانی کو چھوڑ جانے کے بعد بھی اسکی ذات کے ساتھ منتقل ہو سکیں اور ایسے علوم صرف دو ہیں معرفت ذات باری اور علم با امور آخرت سو تجھے واجب ہے کہ اس دُنیا میں انہیں ہر دو علم کی تحقیق میں سرگرم ہو تاکہ انکا ثمرہ تجھے عالم آخرت میں ملے۔ اور علوم دُنیویہ میں سے صرف انہیں علوم کو حاصل کر جس کے بغیر انسان کو کوئی چارہ نہیں اور سلوک طریق میں تجھے معاون ہو سکیں اور تجھے یہ بھی معلوم ہونا چاہئے۔ کہ یہ علوم بدوں خلوت۔ ریاضت۔ مشاہدہ اور جذبِ الٰہی کے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے میرا خیال تھا کہ میں تجھے خلوت اور اس کے شروط اور بعض دیگر امور ضروریہ کی بابت تفصیلاً آگاہ کرتا۔ مگر مقتضائے وقت مجھے اس سے مانع ہے۔ اور مقتضائے وقت کے مانع ہونے سے میرا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ لفظ پرستی کو شریعت سمجھے ہیں اور اس کے اسرار سے محض نابلد ہیں۔ اور جن کا شعار بجز جنگ و جدل حسد و تعصب کے اور کچھ نہیں حتیٰ کہ وہ اہلِ حقیقت پر طعن و تشنیع کرنے کو اپنے لئے موجبِ فخر سمجھ کر ہر ایک صداقت کا انکار کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں میری باتوں کو نہیں سن سکینگے۔ انتہا۔ ترجمہ ؎ ۔

پھر فتوحات کے ایک باب میں لکھتے ہیں کہ اہلِ حقیقت کے علوم کا حصول

؎ دیکھو کتاب طبقات الاولیا (شعرانی)

ایمان و تقویٰ پر منحصر ہے۔ کیونکہ خداوند کریم فرماتا ہے ولو ان اھل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیہم برکات من السماء والارض۔ یعنی اگر بستیوں والے لوگ ایمان لاتے اور اتقا اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے زمینی اور آسمانی برکتوں کے نازل ہونے کے لیئے ایمان اور تقویٰ کو شرط قرار دیا ہے۔ اور زمینی اور آسمانی برکتوں سے مراد علاوہ ان برکات کے جن کو اہل ظاہر سمجھ سکتے ہیں موجودات ارضی و سماوی اسرار و دقائق بھی ہیں۔ یعنے ایسے علوم حقیقیہ کا انکشاف جو علویات سفلیات اور عالم جبروت و ملکوت اور انوار ملک و ملکوت کے متعلق ہو سکتے ہیں۔ اور پھر ویرزقہ من حیث لا یحتسب۔ اس آیت میں رزق سے رزق جسمانی اور رزق روحانی ہر دو مراد ہیں۔ پھر فرمایا وفی السماء رزقکم وما توعدون۔ اس میں ان اسرار و معارف کی طرف اشارہ ہے جو عارف کامل کو اس عالم میں حاصل ہوتے ہیں اور نیز ان نعم ابدی کی طرف جو عالم آخرت میں پیش آنیوالی ہیں۔

عزیز من تجھے لازم ہے کہ تو اس طائفہ گرامی کا انکار نہ کرے اور یہ نہ سمجھے کہ یہ لوگ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ کے نصوص کو ظاہر سے پھیرتے ہیں۔ کیونکہ ظاہر شریعت کو اس کے مفہوم سے پھیرنا کفر ہے بلکہ بات یوں ہے کہ بموجب فرمان نبوی ان لکل آیۃ ظھراً و بطناً وحدّاً ومطلعً الی سبعۃ ابطن ظاہر سے مراد وہ احکام شرعیہ ہیں جنکی پابندی سے اعمال صالح بجا لائے جاتے ہیں اور باطن سے مراد وہ اسرار و معارف الٰہیہ ہیں جو کمال ایمان و تقویٰ پر مترتب ہوتے ہیں۔ اور اگر تو متعصب کرنے والا منکر ہے تجھے جہل کی وجہ سے اہل حقیقت کی تصدیق سے روکنا چاہیے تو اسکی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ کیونکہ قرآن معارف و اسرار کا گنجینہ لفظ پرستوں سے مخفی رکھا گیا ہے۔ ان کے حصہ میں بجز اہل حق کے رد و کد

اور بغض و عناد کے کچھ نہیں آیا۔ کیونکہ نصوص و آیات اور احادیث کو انکے مفہوم ظاہری سے پھیرنا اس وقت لازم آتا ہے جبکہ ظاہر کا انکار کر دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ ان سے مراد انکے معانی ظاہری نہیں (جیسا کہ بعض نیچریہ اور متصوفہ میں فرقہ باطنیہ خذلہم اللہ تعالیٰ کے لوگ قائل ہیں) بلکہ اہلِ حقیقت ظواہر کو اپنے رتبہ میں اسطرح تسلیم کرتے ہیں جس طرح تمام اہل اسلام کو انپر ایمان لانا واجب ہے۔ یہ لوگ کوئی نئی شریعت نہیں بتلاتے۔ ہاں کتاب اللہ اور سنّت صحیحہ میں سے خدا کے دئے ہوئے نورِ فراست اور کشف و شہود حقیقی سے ان معارف و اسرار کو حاصل کرتے ہیں جن کے حاصل کرنے سے اہل جدل کوسوں دُور پڑے ہیں۔ یہ لوگ جب ان معارف و حقائق کو کسی اہلِ حقیقت کی زبان سے سن پاتے ہیں تو یہ نہیں کہ وہ اپنے قصور فطرت یا کم علمی کا اقرار کریں۔ بلکہ جھٹ یُوں کہنے لگتے ہیں کہ سلف میں سے توکسی نے یہ بات نہ کہی تھی سوایسے اعتقاد کے لوگ مشائخ عظام کے فیضان باطن سے ہرگز مستفید نہیں ہو سکتے۔ انتہیٰ ؛

وجہ انکار منکرین کے مختلف اقسام ہیں۔ بعض لوگ تو بوجہ قصور فہم کے انکار کر دیا کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن و احادیث سے اِن معارف و حقائق کو جنکا اہلِ حقیقت افادہ کیا کرتے ہیں وہ لوگ خود تو اخذ کر نہیں سکتے اور اہلِ حقیقت کے حق میں انہیں پورا پورا سوء ظن ہوتا ہے اس لئے بجز تکذیب کے کوئی چارہ نہیں دیکھتے اور بعض کو دنیوی اغراض مدِنظر ہوتے ہیں۔ اسلئے وہ حسد و تعصب سے کبھی خالی نہیں رہ سکتے اور بعض غرور و تکبّر سے انہیں اپنی خاطر میں نہیں لاتے اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تو ہم جیسے ہی آدمی ہیں۔ اور فقدر و جنابِ بشریت میں مبتلا ہیں۔ انہیں یہ رُتبہ کیسے مِل گیا۔ علیٰ ہذا اور بھی کئی ایک وجوہ انکار ہیں اور مذکورہ بالا وجوہ کوئی نئے وجوہ نہیں بلکہ اِن لوگوں کو انبیاء علیہم السلام

سے وراثتاً ملے ہیں۔ کیونکہ درحقیقت ورثۃ الانبیاء یہی لوگ ہیں۔ منکرین قسم اول کے متعلق قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوا کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ۔ اور منکرین قسم ثانی کے متعلق یوں فرمایا حسدًا من عند انفسہم اور منکرین قسم ثالث کی نسبت یوں ارشاد ہوا ما لھٰذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق ۔

شیخ ابوالحسن شاذلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل حقیقت کو منکر اہل جدال کے ساتھ امتحان کرنا چاہا ہے۔ سو تم بہت کم لوگوں کو دیکھو گے کہ کسی خاص ولی اللہ کی تصدیق کرتے ہوں بلکہ اہل اللہ کے صفات و حالات سنکر وہ زبانی یوں کہہ دینگے کہ ہاں اللہ کے مقبول بندے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ کہاں مل سکتے ہیں۔ مگر جب انکے سامنے کسی ولی اللہ کا ذکر کیا جائے تو وہ مطاعن کو اسکے برخلاف انکار پر حجت گردان لیتے ہیں اور اس بات کو نہیں سمجھ سکتے کہ ایک ولی اللہ اور اس کے کمال باطنی کا موازنہ کرنے کے لئے چشم بصیرت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ شیخ ابن تیمیہ[۱] نے ہمارے زمانہ میں اس امر کی نسبت بہت کچھ تجاوز کیا ہے اور بعض نے ان حقائق کا بھی انکار کر دیا ہے جنکی صلابت بیخ کوہ سے بھی زیادہ مضبوط ہے مگر اس نے بزعم خود انہیں مخالف شریعت قرار دیا ہے سو ایسے اشخاص سے جن کا شعار مطاعن پر مبنی ہو اور انکار کے سوا انکی زبان سے کچھ نہ سنا جائے ایسے بھاگ جیسے کسی درندے سے مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام ابتداء میں عوام کی طرف سے اذیت اور مطاعن برداشت کیا کرتے ہیں۔ تاکہ وصف صبر سے متصف ہوں۔ اولیاء اصفیاء کو بھی یہ مرحلہ طے کرنا پڑتا ہے اور بالآخر انہیں غلبہ ہوا کرتا ہے کما قال اللہ تعالیٰ کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی کیونکہ وصف ثابت

[۱] شیخ ابن تیمیہ کے بعض رسائل سے واضح ہوتا ہے کہ وہ حقیقت تصوف کے قائل ہیں۔ چنانچہ سید الطائفہ جنید اور شیخ شبلی کو جابجا بطور حجت پیش کرتے ہیں ان میں شک نہیں کہ انکے کلام میں اکثر منصور وغیرہ کی نسبت نہایت سخت الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ جیسے ابن جوزی کے کلام میں جو شیخ ابن تیمیہ سے الفاظ میں آگے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں ۱۲ منہ

سے موصوف ہونا بھی ویسا ہی ضروری ہے جیسا وصف صبر سے ولقد کذبت رسل من قبلك فصبروا علی ما کذبوا واوذوا حتی اتاھم نصرنا ؁

خاکسار کا خیال ہے کہ ہمعصریت بھی ایک بھاری وجہ انکار کی ہے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ لوگ اپنے ہمعصر اہل کمال کی خواہ وہ کسی علم یا فن یا کمال باطنی سے موصوف ہو بہت کم تصدیق کیا کرتے ہیں بلکہ عموماً انہیں معمولی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور ان کو انواع و اقسام کے مطاعن سے مطعون کیا جاتا ہے۔ برخلاف گذشتہ زمانے کے اہل کمال کے جنہیں عام طور پر صاحب کمال تسلیم کر کے انکے کارنامے سند اپیش ہوا کرتے ہیں۔ اور جس قدر ان کا زمانہ بعید ہوتا جاتا ہے اُسیقدر ان کی صداقت کو زیادہ فروغ حاصل ہوتا جاتا ہے ورنہ کسی ایک زمانہ سلف کے اہل کمال جنہیں لوگ اب تسلیم کر چکے ہیں۔ اگر ہمارے زمانہ میں موجود ہوتے تو وہی لوگ جو انکے کارناموں کو حجت سمجھتے ہیں اسی طرح انکی مخالفت کرتے جس طرح ان سلف کے ہمعصر لوگ انکی مخالفت کیا کرتے تھے۔ مگر حقیقت بین لوگ (جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے) بات کی حقیقت کو سمجھ لیا کرتے ہیں اور فی الفور انکار پر نہیں اُتر پڑتے۔ یہ سچ ہے کہ بعض اکابر اہل علم نے بخیال خود کسی نہ کسی حجت شرعی پر انکار کیا ہے۔ مگر گفتگو یہ ہے کہ اس حجت پر ہم کہاں تک وثوق کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اختلاف درباره ایسے امور کے جو محض مقام ولایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً کشف و شہود و الہام وغیرہ نہ تو محدثین کا کام ہے نہ فقہا کا اور نہ متکلمین کا۔ یہ لوگ بجز معتقدات اور احکام جائزہ ناجائزہ کے اور کیا بتلا سکتے ہیں۔ انہیں مقامات سلوک کی کیا خبر۔ بھلا ذرا شمار کر کے تو بتلاؤ کہ کس قدر محدثین اور کس قدر مجتہدین صاحب مکاشفہ اور الہام گذرے ہیں۔ اور کسقدر ایسے ہیں جنکے ہاتھ پر خرق عادات صادر ہوئے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ لوگ کتاب و سنت کے مسائل کی تشریح میں عمر گذار دیتے ہیں اور لوگوں کو احکام شریعت کے

متعلق امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے رہتے ہیں۔ اور اس خدمت کے عوض وہ اللہ تعالےٰ کے ہاں اجر عظیم کے مستحق ہیں مگر مقامات عالیہ سلوک کی خبر دینا نتیجہ ہے مجاہدات وریاضت اور زہد وتقویٰ اور اشغال و ذکر کا اگر فقہاء و محدثین مقامات سلوک کا صرف علم رکھتے ہیں تو اہل اللہ کو ان مقامات پر گذر ہوتا ہے۔ اور اگر انہیں سماع حاصل ہے تو انہیں رؤیت۔ اور شنید و دید میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ سو منکرین کا محض انکار کر دینا اس سلسلہ عالیہ کی تکذیب نہیں کرسکتا۔ اور اگر یہ ضروری ہوتا تو لازم تھا کہ جناب پیغمبر علیہ السلام کی تکذیب کوئی شخص نہ کرتا مگر یہ حکمت الٰہیہ کا مقتضا ہے کہ اس بزرگ گروہ کے فیضان سے کچھ تو مستفید ہوتے ہیں اور اکثر محروم ؎

برخلاف اس کے ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ تصوف حقیقی کا مقتضیٰ بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اکثر نام فروش لوگ کتاب وسنّت کی پیروی کو چھوڑ کر بعض ایسے امور پر زور دینے لگ گئے ہیں جو یا تو سراسر مخالف شریعت حقہ ہیں یا کم از کم مختلف فیہ مگر چونکہ عوام النّاس ایسی باتوں سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اس لئے ان کے ذہن میں یہ بات خوب جم گئی ہے کہ کتاب اللہ اور سنّت صحیحہ تو صرف علمائے دین کا کام ہے۔ سلوک طریقت ایک علیحدہ امر ہے۔ حالانکہ یہ سراسر ضلالت ہے کیونکہ جو شخص شریعت کے کسی منصوص حکم کی مخالفت کرتا ہے اس کو اہل طریقت کے ساتھ کچھ تعلق نہیں۔ قرونِ اولیٰ کے صوفیہ کرام کا دستور تھا کہ وہ کسی شخص کو اپنے حلقہ بیعت میں نہیں لیتے تھے۔ جب تک کہ اس کو احکام شریعت کے ضروری مدارج کا علم نہ ہوتا اور ان کی مجالس میں بجز کتاب اللہ اور سنّت کے کسی امر کا ذکر نہ ہوتا اور اسرار و معارف کے بیان کرنے کے لئے علیحدہ مجالس ہوتیں۔ وجہ یہی یہ تھی کہ قاصر الفہم لوگ بداعتقاد ہوکر انہیں متہم کرنے لگ جاتے۔ اور یہ طریق بعینہٖ طریق نبوی تھا کیونکہ بمقتضائے تکلموا النّاس علےٰ قدر عقولہم عام صحابہ

کی مجلس میں سب کو یکساں تعلیم ہوتی - اور جب صدیق اکبر یا حضرت علی یا دیگر اکابر ہیں سے کوئی علیحدہ ہوتا۔ تو خاص خاص اسرار و معارف کا اعادہ کیا جاتا۔ کون کہتا ہے کہ تمام صحابہ حضور علیہ السلام کے فیضان سے یکساں مستفیض تھے اور بعض صحابہ اور آئمہ اہلبیت رضوان اللہ علیہم سے منقول ہے۔ کہ سرچشمہ نبوت سے ہم نے بعض ایسے علوم کا بھی استفادہ کیا ہے۔ کہ اگر ہم تم پر ظاہر کر دیں تو تم ہمیں یقیناً کافر کہنے لگو۔ مگر نہایت حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ اکثر مجالس صوفیہ میں بعض ایسے مسائل کا ذکر بھی ہوتا ہے جس کو میرے خیال میں ایسے موقع پر نہ بیان کرنا مناسب ہے۔ یا ایسی باتوں پر زور دیا جاتا ہے۔ جن کو کسی نہ کسی پہلو میں بدعت کہا جا سکتا ہے۔ یا اگر بدعت نہ بھی ہوں تو بہر صورت کتاب اللہ اور سنت سے ان کا رتبہ کبھی مقدم نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کسی کو کہا جائے کہ کتاب اللہ و سنت کی نسبت بڑھکر ان باتوں کا ثبوت دینا تو مجلس نبوی اور ما بعد کی جماعت بزرگان دین کے برخلاف ہے تو نہایت دبی زبان سے اقرار تو کر لیتے ہیں مگر عملاً اس کے برخلاف کیا جاتا ہے میرے خیال میں یہی چند ایک باتیں ایسی ہیں جن سے اس سلسلہ تصوف کی اصلی حقیقت کے انکار کی نوبت آگئی ہے۔ سماع تصور شیخ مسئلہ علم غیب غزنخوانی۔ طواف قبور وغیر ذالک کی نسبت میں اس وقت درباره جواز و عدم جواز گفتگو نہیں کرتا۔ مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ متاخرین میں انکار تصوف کے یہی چند ایک وجوہ ہوئے ہیں اور تعجب یہ ہے کہ یہ مسائل حقیقت تصوف میں بھی داخل نہیں بلکہ زائد ہیں۔ اور خود بعض اکابر اہل سلسلہ کا انکی مخالفت کرنا کافی حجت ہے۔ مگر آجکل تصوف کے مفہوم میں بالخصوص انہیں امور کو شامل سمجھا گیا ہے۔ اور اگر قرآن و حدیث کا ذکر آئے تو علمائے شریعت کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل تصوف کو

ؔ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت امام زین العابدین رض کی طرف اشارہ ہے بخوف طوالت عربی عبارات نقل نہیں کیگئیں ۔منہ

قرآن وحدیث سے کچھ تعلق نہیں۔ حالانکہ تصوف کی بنا صرف حضور علیہ السلام کی تعلیم پر مبنی ہے۔ منکرین نے اکثر ایسی ایسی مثالوں کو دیکھ کر عام طور پر اس سلسلۂ عالیہ کی حقیقت سے انکار کردیا۔ بلکہ تکفیر وتفسیق تک نوبت پہنچادی۔ مگر سچ پوچھو تو جانبین میں افراط وتفریط کی نسبت ہے۔ کل حزب بما لدیہم فرحون ؛

مکتوبات حضرت مجدد قدس سرہٗ میں متعدد مقامات میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ صوفیائے زمان کو مجالس عامہ میں بجز کتاب وسنت کے اور کچھ بیان نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہمارا زمانہ زمان نبوی سے بہت دور ہو گیا ہے اور خیر وبرکات کم ہو گئے ہیں۔ اس لئے محدثات سے خواہ وہ حسنہ ہوں یا سیئہ کلی اجتناب لازم ہے۔ لوگ روز بروز سنت کو ترک کرتے جاتے ہیں اور محدثات کی طرف زیادہ متوجہ پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین کی نسبت مجالس صوفیہ سے لوگ بہت کم استفادہ کرنے لگے ہیں ؛

طریق تصوف کی ضرورت

بعض اشخاص کا خیال ہے کہ صرف اوامر ونواہی شریعت کا پابند ہونا تصفیہ وتزکیہ نفس کے لئے کافی ہے اور کسی شیخ کامل کی بیعت میں آنا ضروری نہیں۔ مگر خاکسار کے نزدیک حق یہ ہے کہ بیشک قرآن وسنت کی پابندی سے انسان اعلےٰ سے اعلےٰ ترقی کرسکتا ہے۔ اور جس نے کچھ لیا ہے انہیں کی پابندی سے لیا ہے۔ مگر گفتگو یہ ہے کہ مقامات عالیہ مثلاً اخلاص۔ زہد۔ اتقا۔ ورع۔ توکل۔ صبر۔ رضا۔ تسلیم وغیر ذلک کی حقیقت سے نہ تو تفسیر وحدیث کے پڑھ لینے سے حاصل ہوتی ہے اور نہ رسمی طور پر اوامر ونواہی کی پابندی سے دور کیوں جاتے ہو۔ جن علمائے شریعت نے کسی شیخ کامل کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا اور ذکر ومجاہدت وریاضت کے منازل طے نہیں کئے انہیں مذکورہ بالا مقامات میں امتحان کرکے دیکھ لو صاف معلوم ہو جائیگا کہ وہ آیات واحادیث

(ہیں) تو بال کی کھال اُتار کر دکھا دینگے۔ مگر روحانیت سے انہیں کچھ بھی بہرہ حاصل (ن)ہیں ہوتا۔ غرور۔ نخوت۔ ریا۔ عجب۔ حرص شہوت۔ غضب طلب جاہ وغیرہ مہالک امراض (م)یں اسی طرح مبتلا ہوتے ہیں جس طرح دیگر اہل دُنیا۔ اس امر واقعہ کا انکار کرنا محض (م)کابرہ اور ہٹ دھرمی ہے۔ کیونکہ درحقیقت یوں ہی ہے۔ اس سے یہ ہرگز نہ سمجھا جائے (ک)ہ ہرایک شخص جو نام نہاد کسی شیخ وقت سے بیعت کرے وہ مذکورہ بالا مقامات کو یونہی (ط)ے کر لیتا ہے بلکہ ہزاروں بیعت کنندگاں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ بچارے مقامات تو بجائے خود ظواہر شریعت کی پابندی سے بھی گئے گذرے ہوتے ہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ شیخ کامل سے صرف وہی شخص فیض حاصل کرتا ہے جو تمام آداب سلوک کا عملاً پابند ہو اور مجاہدت وریاضت میں اپنی عمر کا ایک حصّہ صرف کرے ورنہ صرف ظاہر احکام شریعت کی پابندی جس کا اثر باطن پر کچھ نہ ہو محض رسم وعادت ہے جس کی اہلِ حقیقت کے سامنے کچھ قدر ومنزلت نہیں۔ شیخ عزالدین محدّث رحمۃ اللہ علیہ جو مشاہیر علمار دین سے ہیں قبل از مصاحبت مشائخ کرام نہایت اصرار اور تعصب کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ یہ کیا بدعات پھیلانے والا فرقہ ہے۔ بھلا کتاب وسنّت[1] کی پیروی کے علاوہ کوئی اور بھی طریق ہوسکتا ہے۔ مگر جب ایک موقعپر دمیاط (مصر) میں بڑے بڑے محدّثین اور فقہا مثلاً شیخ تقی الدّین ابن دقیق العید اور شیخ مکین الدّین محدّث وغیرہ کی مجلس میں آپ کو حاضر ہونے کا موقعہ ملا تو امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ تصوّف کی بعض عبارات میں گفتگو پیش آگئی۔ اتنے میں شیخ ابوالحسن شاذلی علیہ الرحمۃ تشریف لے آئے۔ چونکہ آپ مشائخ وقت میں سے تھے سب نے استدعا کی کہ آپ اسکے متعلق کچھ فرمائیے۔ آپ نے جواب دیا کہ اس قدر ماہرین کتاب وسنّت کے ہوتے ہوئے

---

[1] ان کی استدلالی غلطی یہی کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ اس فرقہ کے پاس بھی بجز کتاب وسنّت کے اور کچھ نہیں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ احکام کا مقتضا باطن میں پیدا کرتے ہیں اور دیگر لوگ محض رسم وعادت کی عبادت بجا لاتے ہیں اور ہر دو میں بڑا فرق ہے یہ وہ فرقہ ہے جسکا ایکدم بھی اللہ کے ذکر کے بغیر نہیں گذرتا اور دیگر لوگ باوجود پابندی صوم وصلوٰۃ کے غافل پڑے رہتے ہیں ۱۲ منہ

میرے بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر بار بار کے اصرار پر آپ نے اِن مقامات کی ایسی تشریح کی کہ شیخ عزالدین بلا اختیار پکار اُٹھے کہ سنو سنو یہ وہ کلام ہے جو ابھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نازل ہوا ہے اور یہ وہ کلام ہے جس سے حقانیت کے انوار چمکتے نظر آتے ہیں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ نے غنیہ میں اِس مسئلہ پر خوب بحث کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ شروع سے اللہ تبارک و تعالےٰ نے روحانی تربیت کا سلسلہ یوں قائم کیا ہے کہ ایک فیض دیتا ہے دوسرا فیض حاصل کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے جانشین حواری یا صحابہ ہوا اور انکے بعد ان کے تربیت یافتہ علےٰ ہٰذا القیاس یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہیگا اور یہ امر نہایت ہی شاذ و نادر ہے کہ خداوند تعالےٰ کسی کو بلا کسی غیر کی تربیت کے مقامات عالیہ تک ترقی دے۔ مثلاً حضرت ابراہیم خلیل اللہ یا حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یا حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ۔ سو ہم ہرگز انکار نہیں کرتے کہ کوئی شخص بلا تربیت شیخ مقامات عالیہ تک ترقی کر سکتا ہے۔ کیونکہ اسپر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔ مگر ہم شیخ کامل کی ضرورت جمیع افراد انسان کی حالت کو مدنظر رکھ کر ثابت کرتے ہیں۔ کیونکہ اغلب و اکثر یہی ہے کہ بدوں تربیت شیخ کوئی شخص مدارج سلوک پر ترقی نہیں کر سکتا فلا ینبغی لہ ان ینقطع عن الشیخ حتی یستغنی عنہ بالوصول الٰی ربہ عزوجل یعنی شیخ کی صحبت سے اسوقت تک علیحدہ نہیں ہونا چاہئے کہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ انتہیٰ۔

اس مضمون کے متعلق صاحب جامع الاصول نے بھی ایک بحث لکھی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قدیم سے رسم چلی آتی ہے۔ اور تجربہ بھی اس امر پر شاہد ہے کہ اندرونی نجاستوں اور غلاظتوں سے پاک و صاف ہونا اور نماز کو حضور قلب اور خشوع سے ادا کرنا جس کو حدیث نبوی میں لفظ احسانؔ[1] سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بجز تربیت

[1] ان تعبد اللہ کانک تراہ کی طرف اشارہ ہے ۱۲ منہ

شیخ کامل کے ممکن نہیں۔ کیونکہ شیخ ہی اندرونی امراض کا واقف اور انکے طریق معالجہ میں مہارت رکھتا ہے یہ بات صرف امراض کے علم حاصل کرلینے اور تودہ در تودہ کتابوں کے مطالعہ کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ نفس کی نہایت باریک رہزنیوں اور خفیف وخفی آثار سے بڑے بڑے فقہ وحدیث کے علما بھی محفوظ نہیں اور انسان کا اپنا تجربہ اس میں کافی دلیل ہے بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ۔ امام شعرانی نے انوار قدسیہ میں شیخ کامل کے وجوب اتباع کو ثابت کیا ہے۔ اور لکھتے ہیں کہ ازالہ نجاسات واجب ہے اس لئے اس طریق کا حاصل کرنا بھی واجب ہوگا جس سے ازالہ ہوسکے اور وہ بجز اتباع شیخ کامل کے کوئی طریق نہیں۔ پھر لکھتے ہیں ولو تکلف لاینفع بغیر شیخ ولو حفظ الف کتاب یعنی اگر خود بخود اپنی اصلاح کرنے لگے تو اسے کچھ مفید نہیں ہوگا۔ اگرچہ ہزاروں کتابیں حفظ کرلے۔ سوائے عزیز تجھے لازم ہے کہ تو کسی شیخ کامل کی تلاش کرے اور سرکشی نہ کرے اور امر آخرت میں غور سے کام لے اور اس خیال سے بچتا رہے کہ صوفیا کا طریق کتاب اللہ اور سنت کے برخلاف ہے۔ کیونکہ یہ کفر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس طائفہ عالیہ کا طریق عین اخلاق محمدیہ اور سیرت احمدیہ اور سنن الٰہیہ ہے۔ غور کرو کہ امام احمد بن حنبل اور شیخ عزالدین جیسے بڑے بڑے جلیل القدر محدثین کس طرح آخر کار انکار رکھکے بھی صوفیائے کرام کے فیضان باطنی سے مستفیض ہونے پر مجبور ہوگئے۔ امام احمد شروع شروع میں اپنے بیٹے کو بڑے زور سے یوں نصیحت کیا کرتے تھے کہ بیٹا دیکھنا کہیں ان لوگوں کی صحبت میں جنہیں صوفیا کہتے ہیں نہ بیٹھنا کیونکہ یہ لوگ شریعت کے احکام سے بے خبر ہوتے ہیں سو تم علم حدیث کے سوا کسی کام میں نہ لگنا مگر امام صاحب جب حضرت ابوحمزہ بغدادی علیہ الرحمۃ کی مجلس میں بیٹھنے لگے اور آپ کی آنکھیں کھلیں اور دقائق شریعت آپ سے حل کرانے لگے تو بیٹے کو یوں کہا کرتے کہ بیٹا دیکھنا کہیں ان لوگوں پر جنہیں

صوفیا کہتے ہیں سوءِ ظن نہ کرنا اور کبھی انکی مصاحبت سے غافل نہ ہوتا۔ کیونکہ یہ ان اسرار معارف کے خزانوں پر دسترس رکھتے ہیں جن سے ہم لوگ بے بہرہ ہیں۔ یہ لوگ حقیقی علوم اور خشیت اور زہد و اخلاص کے مالک ہیں جنہیں علمار فقہ و حدیث اپنے سینکڑوں دفاتر سے بھی حاصل نہیں کرسکتے۔ اسی طرح شیخ عزالدین کو سخت انکار کے بعد جب شیخ ابوالحسن شاذلی علیہ الرحمۃ کے فیضانِ صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا تو یہ کہا کرتے تھے کہ صوفیائے کرام کی حقانیت پر یہی کافی دلیل ہے کہ یہ لوگ اہلِ حقیقت ہیں اور دوسرے لوگ صرف رسم و عادت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ اُن حقائق و معارف اور خرقِ عادات کے مالک ہوتے ہیں جو دوسروں کو شتر بار کتابوں کے پڑھنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔

امام شافعی جیسے مجتہد کا یہ قول ہے کہ یحتاج الفقیہ[1] الی معرفۃ اصطلاح الصوفیۃ لیفیدوہ من العلم مالم یکن عندہ۔ یعنی فقیہ کو صوفیاءِ کرام کی اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے تاکہ وہ اسے ان علوم کا افادہ کرسکیں جنکو وہ نہیں جانتا۔
اس موقعپر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر طریقِ صوفیا ضروری ہوتا تو کیا وجہ ہے کہ جماعت صحابہ اور تابعین اور آئمہ مجتہدین نے جس طرح تمام احکام شرعیہ کی تفصیل و توضیح کی ہے طریقہ صوفیہ پر بھی بحث نہ کرتے اور امراض قلبی کے اسباب اور تشخیص اور طریق معالجہ کی کیفیت نہ بتلاتے سو اس کا جواب یہ ہے کہ ان بزرگواروں کا زمانہ خیر القرون تھا اور اس قسم کی بداعتدالیوں کا نہایت ہی خفیف اثر تھا۔ عام مسلمان کتاب اور سنّت کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے اور طریقِ سُنّت سے ایک قدم بھی اِدھر اُدھر نہ ہوتے تھے۔ مگر جب بعد میں فلسفیت کا رنگ طبائع پر چڑھنے لگا اور لوگوں کے دِلوں میں انوارِ سنّت نبوی کی چمک کم ہونے لگی تو علمائے ربانی نے اس طرف بھی توجّہ کی اور امراضِ اندرونی کے دُور کرنے اور نفوس کو نجاسات سے پاک و صاف بنانے

[1] فقیہ سے مراد نکاح اور طلاق کے مسائل جاننے والا شخص نہیں بلکہ ایسا شخص مراد ہے جو اتباعِ سنت میں استقدر ثابت قدم ہو کہ اسکا ظاہر باطن یکرنگ ہو ۱۲ منہ

۔ لئے شغل وذکر وغیرہ لوازم تصفیہ وتزکیہ کے متعلق حسب ہدایات کتاب وسنت سے
۔ہاد کرنا شروع کیا مع ہذا وہ لوگ جو کتاب وسنت میں قرون اولی جیسے آئمہ کا علم و
۔ل رکھتے ہوں انہیں اگر مشائخ کی ضرورت داعی نہ بھی ہو تو کونسی تعجب کی بات ہے
۔یونکہ وہ اتباع کامل سے ظاہر و باطن میں بالکل عین شریعت حقہ کا نمونہ ہوتے ہیں
۔ور یہی صوفی کے معنی ہیں۔ ہمارے اس جواب کو امام قشیری نے اپنے رسالہ میں
۔ں بیان کیا ہے اوّل ما حدث ظہور الامراض الباطنۃ او اخر المائۃ لقولہ علیہ السلام
خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم فمن شہد لہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم بالخیریۃ فقد حاز رتبۃ الکمال کلہ۔ یعنی امراض باطنیہ
کے ظہور کا زمانہ تیسری جماعت کا آخری دور ہے جیسا کہ حضور علیہ السلام نے
فرمایا کہ بہترین امت میرے زمانہ کے لوگ ہیں پھر جو انکے بعد ہونگے اور پھر جو انکے
بعد آئینگے سو جن لوگوں کے بارے میں جناب پیغمبر علیہ السلام نے بہتری کی شہادت
دیدی وہ واقعی جمیع کمالات کے جامع ہونگے میں کہتا ہوں کہ یہ بات عقلاً بھی بالکل صحیح
اور قابل تسلیم ہے۔ کیونکہ جس طرح آفتاب کے غروب ہو جانے پر تھوڑی دیر کے
لئے روشنی کا اثر بدستور قائم رہتا ہے اور آہستہ آہستہ تاریکی چھا جاتی ہے اسی طرح حضور
علیہ السلام کے دنیا سے رخصت ہو جانے پر آپ کے انوار نبوت کا انعکاس صحابہ
اور تابعین اور تبع تابعین کے قلوب مقدسہ میں برابر جلوہ گر رہا۔ حتی کہ آہستہ آہستہ
بدعات اور ترک سنت نبویہ نے زور پکڑا اور ایک عام ظلمت سی چھا گئی ایسے نازک
موقعہ پر الٰہی غیرت اس امر کی مقتضی تھی کہ ایسے مقدس نفوس کو ان خرابیوں کے
تدارک کے لئے مختلف ممالک اور مختلف زبانوں میں مبعوث فرماتا تا کہ حضور علیہ
السلام کی حقیقی تعلیم کا سلسلہ بدستور جاری رہے پس کوئی شخص جو رسم و عادت
کے اسلام کو چھوڑ کر حقیقت کی طرف آنا چاہتا ہو اور فروعی مسائل میں نامناسب

مکابرہ ومجادلہ سے گذر کر گرد وغبار تعصب سے بالکل پاک وصاف ہوگیا ہو اور سوء ظن سے جو محض منکرین کے شنیدہ الفاظ سے اس کے دل میں جاگزین ہو چکا ہو بکلی محفوظ ہو ایک آن کے لئے بھی شیخ کامل کی ضرورت سے انکار نہیں کرسکتا۔ دیکھو متاخرین میں حافظ ابن حجر[1] کس پایہ کے محدث ہیں اور کس زور کے ساتھ مذکورہ بالا خیال کی تصدیق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طالب خدا کو چاہئے کہ کسی شیخ کامل کو اپنا راہبر مقرر کرے اور منکرین اہل تعصب کی باتوں کو ہرگز نہ سنے اور یہ خیال رکھے کہ شیخ عارف کامل ہو۔ اور احکام شریعت اور حقیقت میں ماہر۔ اور چاہئے کہ رسم وعادت کے اسلام سے برطرف ہوجائے اور اپنے شیخ کے حکم پر چلے۔ جب کسی شخص کو ایسا راہبر کامل مل جائے تو اس پر حرام ہے کہ اسے چھوڑ جائے اور ہمارے اس دعوی پر نہ صرف کتاب اللہ اور سنت نبویہ اور اجماع امت اور قیاس صحیح چاروں شہادت دے چکے ہیں۔ بلکہ چاروں آسمانی کتابیں اس دعوی کی مثبت ہیں ؛

مضمون چونکہ زیادہ لمبا ہوگیا ہے اسلئے اس کو یہیں چھوڑتے ہیں۔ گو ہم یقین کرتے ہیں کہ متعصبین ہمارے اس مضمون سے بہت کم متاثر ہونگے مگر ممکن ہے کہ کسی صاحب سعادت کو اپنے غلط خیال کی اصلاح کا موقع ملجائے اور مجھے بھی سعادت نصیب ہو ورنہ ؎

بہ مقبولی کسے را دسترس نیست
قبولِ مقبلاں در دستِ کس نیست

اللّٰھم اھدنا الصراط المستقیم ؛

---

[1] فتح الباری شرح صحیح بخاری کے مؤلف انکی اور بھی کئی ایک کتابیں فن حدیث میں مشہور ہیں ۱۲ منہ

شریعت وطریقت

تصوف درحقیقت نام ہے تعمیر الظاہر والباطن کا جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک صحیح الایمان اپنے آقا حق تعالیٰ کی یاد سے اپنے جسم اور قلب کو آباد رکھے - اور ظاہر ہے کہ کسی نو تعمیر مکان کی اندرونی و بیرونی زیبائش وہی معتبر ہے جو اس کے مالک کی منشا اور مرضی کے موافق ہو کسی معمار یا مزدور کو اس کا حق ہرگز حاصل نہیں کہ تراش وخراش کرے اور مالک کی رائے میں دخل انداز ہو اور اسی طرح انسان کا جسم اور قلب جو مکان کا بیرونی اور اندرونی حصہ ہے سچے مالک وخالق حق تعالےٰ جلشانہٗ کی طرف سے اسی لئے عطا ہوا ہے۔ کہ معمار و مزدور بنکر اس کو مالک کی منشا کے موافق سجائیں اور آقا کی مرضی کے مطابق اس کی ایسی زیبائش کریں جسکو دیکھکر مالک خوش ہو جائے - مالک کا خوش ہو جانا ہی لاکھ انعاموں کا ایک انعام ہے چہ جائیکہ اسپر دائمی لذت اور پائدار جنت کے ساتھ شرف دیدار کا وعدہ بھی دیا گیا ہے یہ ہے اصل حقیقت سلوک کی جس کو حق تعالےٰ نے اس آیۂ مقدسہ میں ارشاد فرمایا ہے وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون - (میں نے جن وانس کو نہیں پیدا کیا مگر اس لئے کہ میرے غلام بنے رہیں) یعنی اپنی رائے کا دخل دئے بغیر غلامانہ آداب کے ساتھ جسم کی ظاہری اور قلب کی باطنی آرائش میں مشغول رہیں اور آقا کے حکم کی تعمیل کئے جائیں ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدست دگرے دادن وحیراں بودن

اور چونکہ ظاہری وباطنی زیبائش کا سجا سجایا ایک مکان مالک نے اصل یا نقشہ دکھا کر

آپ کے سامنے کردیا ہے اسلئے غلامانہ حیثیت سے معمار بنکر یعنے جدید مکان اندرونی وبیرونی آرائش کے کسی چھوٹے سے جزو میں بھی آپ کو رائے زنی کا حق نہیں ہے اور اگر کوئی خود رائے اپنے آقا کی تجویز میں کوئی تغیر یا ترمیم کرے تو مالک مجرم اور آقا کا نافرمان بنے گا اور اسپر مکان کی ہیئت بگاڑنے کا الزام قائم ہو اور قانون خداوندی کی اس دفعہ کا ملزم قرار پائیگا جو مالک کی ساری لاگت برباد کر والے دخل در معقولات دینے والے معمار پر قائم ہؤا کرتی ہے ؛

یہی ہے اصل گر اور سچا رمز بدعات سے بہ تشدّد منع کئے جانے اور اتباع سنّت نبویہ کے بتاکید شدید مامور ہونے کا جس کو ادنےٰ عاقل بھی ذرا سی توجّہ سمجھ سکتا ہے اور جس کو شیخ شیراز رحمۃ اللہ علیہ نے ذیل کے الفاظ میں ظاہر کیا ہے ؎

محال است سعدی کہ راہ صفا   تواں رفت جز در پئے مصطفےٰ
خلافِ پیمبر کسے راہ گزید   کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

خلاصہ یہ ہؤا کہ اعضاء کے جملہ حرکات وسکنات اور قلب کے تمام جذبات وخیالات غرض سارے قوائے بشریہ ظاہریہ وباطنیہ کو مثیل نمونہ خداوندی یعنی ذات سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے حالات ومعمولات کا ایسا تابع بنا لینا کہ عبادات ودیانات اور معاملات ومعاشرت غرض ہر امر میں جہاں جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ برتا ہے اُس کو اختیار کرنا انسان کا اقتضائے طبعی بن جائے سلوک اور طریقت کہلاتا ہے اور چونکہ خلاصۂ عالم وعالمیان سپہ سالار لشکر انس وجاں سیّدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا تمدن اور حالاتِ زندگی کا مجموعہ سُنت کہلاتا ہے اِس لئے ایسی اطاعت جس کا اوپر ذکر ہؤا ہے آپ کی سنّت کا اتباع کامل اور اتّقاءِ تام کہلائے گی - اور اسی پر اوّل محبّیت اس کے بعد محبوبیت وپروانہ مغفرت موعود ہے جس کی خبر اِس آیہ شریفہ میں دی ہوئی ہے قل ان کنتم تحبون اللہ

فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم ۞

سنّت نبویہ اور شریعت مصطفویہ کے کمال اتباع کی تعلیم جگہ جگہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ اور کھلے الفاظ میں نہایت صاف حکم ہے اس کو نجات و مغفرت اور ولایت و قرب خداوندی کا موقوف علیہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں تاویل کرنے کی بھی کسی بندہ مسلمان کو گنجائش نہیں۔ یہی اتباع کامل جب تک نفس پر جبر و تکلف کرنے سے ہوتا ہے۔ شریعت کہلاتا ہے۔ اور عمل کرنے والے کو مطیع و زاہد کہتے ہیں اور جس وقت اس اطاعت کا مقتضیٰ عادت بنکر طبیعت ثانیہ ہو جاتا ہے طریقت کہلاتا ہے۔ اور عمل کرنے والے کو صوفی اور صاحب دل کہنے لگتے ہیں ۞

اس میں شک نہیں کہ نجات اخروی کا مدار اتباع سنّت نبویہ پر ہے۔ گو تکلّف اور نفس پر جبر کرنے سے حاصل ہو اسی لئے تصوّف کی تحصیل پر فرضیت کا حکم کسی نے نہیں لگایا۔ بلکہ سب مستحب ہی بتاتے رہے۔ مگر پہلی حالت محل خطر ضرور ہے۔ کیونکہ جب تک نفس جیسا دشمن ہلاک نہ ہو اور اتّباع سنّت نبویہ میں جو عین اطاعت حق سبحانہ ہے قلب کو لذت نہ آنے لگے اُس وقت تک نفس و شیطان کی رخنہ اندازی سے امن حاصل نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ کوئی آزاد منش اتباع و اطاعت کے بوجھ سے گھبرا کر اسکو چھوڑ بیٹھے اور حرج عظیم میں واقع ہو کر مورد عذاب خداوندی ہو۔ اس لئے نفس کا مطمئنہ بنانا اور اتّباع شریعت میں وہ مرتبہ حاصل کرنا جسکے سبب اطاعت خدا و رسول اول عادت بنے اور پھر محبوب اور لذیذ شے کی طرح مرغوب اور دل پسند ہو جائے جس کو طریقت کہتے ہیں۔ اگر فرض نہیں تو متمم فرض ضرور ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نفس ایمان اور جملہ ثمرات ایمان خطرناک غار کے کنارے پر پڑے رہتے ہیں۔ چنانچہ کسی صاحب دل نے کہا ہے ؎

اگر خواہی حیاتِ دل زندگی ۞ بندگی کن بندگی کن بندگی
زندگی مقصود بہر بندگی است ۞ زندگی بے بندگی شرمندگی است

جز خضوع و بندگی و اضطرار ٭ اندریں حضرت ندارد اعتبار
ہر کہ اندر عشق یابد زندگی ٭ کفر باشد پیش او جز بندگی
ذوق باید تا دہد طاعات بر
مغز باید تا دہد دانہ شجر

ایک بیمار شخص جس کو مرض کے سبب مطلق بھوک کا احساس نہ ہو اپنے معالج طبیب کے حکم سے غذا کھاتا ہے تاکہ وہ طاقت بنی رہے جسکی وجہ سے مرض کا تحمل اور عوارض کی مدافعت کرسکے اس بیچارے کو غذا میں کیسی ہی لذیذ کیوں نہ ہو کچھ مزا نہیں آتا طبیب کے حکم کی تعمیل میں تھوڑا بہت کھانا ضرور ہے مگر طبیعت پر جبر کرکے نوالے نگلتا ہے۔ لقمہ اوپر کو اُبلا چلا آتا ہے مگر یہ قابل رحم سقیم الحال آئندہ حاصل ہوجانے والی تندرستی کا لحاظ کرکے مصلحت کو نظر کے سامنے لاتے ہوتے بہ تکلف نیچے کو لیجاتا اور تیوڑی چڑھا چڑھا کر حلق سے اتارتا ہے۔ اس بیچارے کی حالت پر ہر کسی کو ترس آتا ہے۔ اور دوسرا شخص وہ ہے جو چلتا پھرتا پورا تندرست اور جوان ہے، بلا کسی ترغیب کے ہر لذیذ نعمت اور مزیدار غذا کی طرف اس کو طبعاً رغبت ہوتی ہے۔ اسکا ہمیشہ جی چاہتا ہے کہ لذیذ سے لذیذ غذا کھاؤں۔ چنانچہ فرمائش کرکرکے پکواتا اور مزے لے لے کر کھاتا ہے۔ اندر سے جی بحال ہوتا ہے اور ساری غذا جزو بدن بنکر تنومند و توانا ہوجاتا ہے۔ اس خوش نصیب شخص کی حالت کیسی قابل رشک ہے۔ جسکو بیمار دیکھکر ضبط کرتا اور رہی جیسا تندرست قوی المعدہ بننے کی ہوس کرتا ہے۔ پس یہی حال ہے اس عامی عامل شریعت کا جسکے قلب میں حلاوت ایمان پیدا نہیں ہوئی۔ اور اس بندۂ خاص ولی صاحب دل کا جسکا دل حُب خداوندی سے معمور و آباد ہوچکا ہو اور اپنے مولی تعالیٰ شانہٗ کی اطاعت و یاد سے مانوس ہوچکا ہو کیونکہ اول الذکر شخص سنّت نبویہ کا اتباع تو کرے گا مگر جبرًا و قہرًا جنّت کی نعمتوں اور دوزخ کی مصیبتوں کا نقشہ جماکے اور مؤخر الذکر شخص شر۔ نعت مصطفویہ کا اقتدا کریگا اپنی طبعی رغبت اور دلی اُنس و محبت کے ساتھ جسکا مطلب یہ ہے کہ

اگر دوزخ جیسا خطرناک مقام نافرمانوں کے لئے اور جنت جیسی پر بہار جگہ فرمانبرداروں کے لئے نہ بھی پیدا کی جاتی تب بھی بہ اقتضاءِ طبعی بہ انس قلبی ان حضرات سے یہی اطاعت و تابعداری ظاہر ہوتی جواب ہو رہی ہے۔ اس میں سرِ مو فرق نہ ہوتا۔ ایسے سرشار ان محبّت کی غایت تمنّا اپنے محبوب کو راضی کرنا ہے۔ اور بس ۔ تغیرات عالم رات دن دیکھتے ہیں اور بزبانِ حال پکارتے ہیں ؎

روزہا گر رفت گو رو باک نیست
تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

ان طالبانِ رضا کی یہ شان ہوتی ہے ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

آپ نے دیکھا کیسی قابلِ رحم اور خطرناک حالت ہے۔ اس عامی زاہد خشک کی ایک نامرغوب اور غیر دلکش نمونہ پر تعمیر کرنی چاہتا ضرور ہے مگر بخیال خود ہر زیبائش میں مصلحت ڈھونڈ کر اپنی ہمت بڑھاتا اور طبیعت کو ابھارتا ہے تاکہ ہاتھ چلے اور تعمیر پوری ہو۔ اس کو تعمیر کے اجزا میں جب تک حکمت کا علم نہیں ہو جاتا۔ اس وقت تک قدم آگے بڑھانا بار گراں ہے۔ افسوس اگر کبھی کوئی حکمت کا مزہ اسکی سمجھ میں نہ آئے تو کیا نمونہ میں نقص نکالیگا؟ ہاں بیشک اگر طبیعت کا یہی انداز ہے ۔ اور مالک کی عظمت و محبّت کی جگہ حکمت و مصلحت کی وقعت دل میں جمی ہوئی ہے تو ایکدن یہی ہوتا اور کام کرتے کراتے ہلاکت و تباہی کے دریا میں ڈوبتا ہے۔ برخلاف اس کے کس قدر پیاری حالت ہے۔ اس صاحب دل بزرگ کی جس کی زمین قلب میں آقا کی محبت کا تخم جم گیا اور مالک کے ساتھ وہ انس پیدا کیا جس کی وجہ سے نمونہ حسنہ کے مطابق اپنے جسم و قلب کی تعمیر و آرائش میں مشغول ہے اور اچھا لگا سمجھے ہوئے ہے کہ نمونہ خداوندی کا ہر پہلو موزوں اور زیبائش کا پورا حصّہ لئے ہوئے ہے۔ اس کو اتباع شریعت پر آمادہ کرنے والی شے اگر ہے تو صرف محبت خدا اور رسول ہے کہ اپنے محبوب کی رضا کا جویا بنکر تعمیل حکم کے لئے مجنونانہ لپکتا اور بہ اقتضائے طبعی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات و معمولات کا

شیدا بنکر اس جانب دوڑتا ہے۔ اس کے نزدیک اگر عزت ہے تو اسی میں ہے کہ متبع شریعت بن جائے اور مال ومتاع ہے تو یہی ہے کہ اتباع سنت نبوی کرے ؎

شریعت کو اگر تمثیل کے طور پر شیریں مانا جائے تو ان کو فرہاد کوہ کن کہنا پڑیگا۔ کیونکہ وہ تعمیل حکم میں ہر ایک مشقت کو راحت سمجھتے ہیں۔ اور اگر شریعت کو لیلیٰ عامریہ کہا جائے تو یہ اسکے مجنون ثابت ہونگے۔ اسکی ہر ادا ان سے پوچھنی چاہیئے کہ کیسی پیاری ہے کسی نے خوب کہا ہے

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی بے زر وگنج بصد حشمت قاروں باشی
در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

ان بزرگواروں کے نزدیک شریعت کے حکم میں بڑی مصلحت یہی ہے کہ وہ انکے آقا کا حکم ہے اور اس کی تعمیل سے مالک راضی ہو جاتا ہے اور سنت نبویہ کی ہر طرز کو خواہ از قبیل عادات ہو یا از قبیل عبادات معاشرت ہو یا تمدن حالات غم ہوں یا کیفیات شادی وسرور اپنا شعار و وقار بنائے رکھے کیونکہ پیارے کی ہر ادا پیاری ہوتی ہے سخت افسوس ہے کہ کسی ڈاکٹر کا ہر قول وفعل تو بے چون وچرا مان لیا جاتا ہے اور محبوب رب العالمین محمد بن عبداللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام طبیب روحانی کے ارشادات عالیہ پر گفتگو کی جاتی ہے کیا شان محبت سے یہ انداز بعید نہیں ہے ذرا غور فرما کر خود ہی فیصلہ کیجیئے۔ کیا جواب دیجیئے گا۔ قیامت کے دن اگر جناب پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم جو ہر ایک ایماندار کے لیئے اس کے ماں باپ سے زیادہ مہربان ہیں اور آپ نے فلاح دارین میں کوئی دقیقہ اٹھا کر نہیں رکھا شکایت فرمائیں کہ اے میرے روحانی فرزندو کیا میرے احسانات عظیمہ کا طریق شکر یہی تھا جو تم نے برتا؟ اور کیا میری محبت اور دلسوزی کا یہی صلہ تھا واللہ العظیم اس وقت شرما کر بجز گردن جھکا لینے کے کوئی جواب بن نہ پڑیگا اور ندامت اٹھانا ہوگی مگر بے سود۔ اس مضمون کو جناب رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس حدیث میں ظاہر فرمایا ہے لا یکون احدکم مؤمنا حتی اکون احب الیہ من نفسہ ومالہ وولدہ والناس اجمعین اور اسی حالت کو کسی مسلوب الارادہ

فرمانبردار نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

ز دل نشاں چہ خواہی کہ ز دل خبر ندارم ✦ تو بگو کہ دل چہ باشد من از و اثر ندارم

حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ وہ انس و محبت جس کی بدولت مشکلات اطاعت آسان اور آقا کی خدمت میں ہر دم مشغول رہنا مرغوب خاطر ہو جائیں اصطلاح صوفیہ میں نسبت کہلاتی ہے کیونکہ یہ خالق و مخلوق کے درمیان ایک قسم کے رابطہ کا نام ہے اور اس کو مضبوط کرنے والا شخص وہ پیاسا ہے جو سمندر کے پانی سے پیاس بجھانا چاہتا ہے اور جس قدر پیتا ہے۔ اسیقدر العطش العطش پکارتا ہے جس مرض میں مبتلا ہے وہی اس کی دوا ہے اور جو اس کے لئے شفا ہے وہی اسکا عین مرض ہے۔ یہاں تک کہ اسی میں فنا ہو کر حیاتِ ابدی حاصل کرتا اور مر مٹ کر زندگی جاوید پاتا ہے ؎

تداویت من لیلی بلیلی من الھوی

کما یتداوی شارب الخمر بالخمر

اپنی محبت کا جوہر حق تعالیٰ نے فطری طور پر ہر ذی روح کو عطا فرمایا ہے اور بندۂ مومن کے حصہ میں تو یہ دولت اسقدر آئی ہے کہ کوئی محبت اسکا مقابلہ نہیں کرسکتی چنانچہ خود کلام اللہ میں ارشاد ہے والذین امنوا اشد حبا للہ یعنی ایمان والوں کو سب سے زیادہ محبت اللہ کی ہے مگر غفلت و بے خبری اور ماسوے اللہ کے ساتھ تعلقات کی کثرت و قوت نے اس فطری محبت خداوندی کو ایسا دبا رکھا ہے جیسے چولہے کی راکھ چنگاری کو دبائے ہوتی ہے۔ اسی لئے عوارض کا اٹھا دینا اور موانع کا ہٹا دینا اسکے مشتعل ہونے کا موجب ہے۔ اسی چنگاری کو ایک صاحبدل نے دردِ محبت کے ساتھ تعبیر کیا ہے ؎

عجب دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد

وگر دم درکشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

اور یہ راکھ کا ڈھیر نہیں ہٹ سکتا جب تک کہ چند روز بہ تکلف نفس پر جبر کرکے قدم قدم پر

اتباع سنت نبویہ کو ملحوظ نہ رکھا جائے۔ سچ مانئے کہ جس وقت اس چنگاری کے مشتعل کرنے کا آپ محض ارادہ کرینگے توفیق ازلی آپ کے شامل حال ہوگی۔ ہوائے رحمت خداوندی جھونکے لگینگے اور حدیث قدسی کا یہ مضمون صادق آئیگا من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیہ باعا ومن اتانی یمشی اتیتہ ھرولۃ ابھی تک آپ طالب تھے اب آپ مطلوب بن جائینگے اور اس وقت تک آپ محب کہلاتے تھے اب محبوب کہلائینگے شفیق ماں اپنے پیارے بچے کو گود میں لے لینے کے لئے صرف اسی کی منتظر ہے کہ اس کا ناطاقت بچہ گرتا پڑتا مرتعش پاؤں پہ کھڑا ہو کر ایک دو قدم ماں کی طرف بڑھے۔ پھر ماں کو تاب نہیں کہ اسے گرنے دے اور لپک کر گود میں نہ اٹھائے۔ یاد رکھئے کہ یہ وہ چٹک ہے کہ جب حاصل ہو جاتی ہے تو دوسری چیزوں سے مستغنی بنا کر چھوڑتی ہے۔ آپ اسی کے ہو رہینگے اور کہینگے ؎

من ہر چہ خواندہ ام ہمہ از یاد من برفت ✤ الا حدیث دوست کہ تکرار مے کنم

کوئی دوسرا خیال آپ کے لئے وبالِ جان ہوگا اور دوسرا شغل شغلِ اغیار کی طرح بارِ خاطر اس وقت آپ کی طبیعت کا اقتضا یہ ہوگا ؎

نخواہم جز تو یک ساعت تفکر در دگر کردن ✤ کہ در ہر دو جہاں جاناں ندارم جز تو دلدارے

دُنیا کے ضروری مشاغل بھی آپ کے دینی مشاغل بن جائینگے۔ اعضا بضرورت تحصیل معاش کسب میں مصروف ہونگے مگر قلب مشغول بحق سبحانہ، اور دل اپنے مولیٰ کی طرف متوجہ بقول شخصے ؎

دل پیش تو ام دیدہ بجائے دگر ستم ✤ تا غیر ندانند کہ ترا می نگرستم

خلاصہ یہ ہے کہ طریقت عین شریعت ہے مگر اس وقت جبکہ شریعت کا مقتضا قلب میں پیدا ہو جائے اور اتباع سنت و اطاعت حق سبحانہٗ اقتضائے طبیعت بن جائے۔ قلب کو عبادت میں لذت آئے اور دل کو مشغولیت بہ خالق سے اُنس پیدا ہو کر مزا آنے لگے۔ اور اسکی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ معمولات و عادات اور تمدن و معاشرت بلکہ ہر حرکت و سکون پر جناب رسول اللہ

(صلی) اللہ علیہ وسلم کے اتباع واقتدار کا لحاظ رکھا جائے۔ حق تعالےٰ ہمیں اس نعمت سے (ما)لامال فرمائے اور قال کو حال بنائے ؂

از ساحتِ دل غبار کثرت رُفتن ٭ خوشتر کہ بہرزہ دُرِ وحدت سُفتن
مغرور سخن مشو کہ توحیدِ خدا ٭ واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

(م)نعم حقیقی کے انعامات کا دروازہ ہر بندہ کے لئے کھلا ہوا ہے کیا عجب ہے کہ ہمیں بھی (بھ)یک مل جائے ؂

ہر چند نیم لائقِ درگاہِ سلاطین نومید نیم
کآخر بکرم بہ نوازند گدا را۔ گاہے بہ نگاہے

باب دہم

تالیف القرآن

یہ امر مسلم ہے کہ جس قدر صحت اور استحکام کے ساتھ مسلمانوں کی آسمانی کتاب یعنی قرآن کریم آج تک صفحہ دنیا پر محفوظ وموجود ہے دیگر مذاہب کی کتب سماویہ ہرگز اسکا مقابلہ نہیں کرسکتیں اور یہ امر اس کتاب مقدس کے منجانب اللہ ہونے کے لئے ایک دلیل واضح ہے جس کا کوئی راستی پسند انسان ہرگز انکار نہیں کرسکتا۔ مصنفین یورپ جنھوں نے گاہ و بیگاہ مذہب اسلام کے متعلق موافق ومخالف رائیں قائم کی ہیں۔ بالاتفاق اس امر کی صداقت کو تسلیم کرچکے ہیں۔ کہ قرآن مجید بلاکم وکاست انہیں الفاظ میں آج تک اہل اسلام میں موجود ہے جو جناب شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانِ حقیقت ترجمان پر بتعلیم وحی جاری ہوئے۔ اور اس لحاظ سے یہ کہنا بالکل ایک واقعہ نفس الامری خیال کیا جاسکتا ہے کہ اگر روئے زمین کوئی

کتاب بلا تحریف و تبدیل نہایت صحت کے ساتھ موجود ہو سکتی ہے تو وہ صرف قرآن کریم ہے۔ عیسائیوں نے اپنی کتب سماویہ پر سے الزام تحریف دُور کرنے کی خاطر قرآن شریف کو محرف ثابت کرنے میں وہ وہ زور لگائے ہیں کہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ مگر انکی کوششیں بے سُود ثابت ہوئیں اور گو بظاہر ضد اور تعصب سے ہمارے مذکورہ بالا دعویٰ کی صداقت کو تسلیم نہ کریں مگر وہ دل سے خوب یقین رکھتے ہیں کہ انکی ناخن زنیاں اسلام کی آہنی دیوار میں کچھ کارگر نہیں ہو سکتی۔ چودہ صدیاں پوری ہونے لگیں مگر ان کے تمام منصوبے خاک میں ملگئے۔ اور آخر کار وہ اپنا سا مُنہ لیکر رہ گئے انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون[۱] اور یہ جو آئے دن مخالفین اسلام کی طرف سے نکتہ چینیاں گوش زد ہوتی رہتی ہیں یہ فقط اُن لوگوں کی حرکات مذبوحی ہیں اور چبائے ہوئے لقموں کو چبا رہے ہیں۔ زمانہ کے انقلابات نے قرآن مجید کی صداقت کے خیال کو مخالفین کی نظروں میں اور بھی مضبوط کر دیا ہے اور روز بروز مضبوط ہو رہا ہے۔ اللّٰہم زد فزد ؛

یہ امر عقلاً بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ جس کتاب کو دنیا کا آخری اور قطعی دستور العمل قرار پانا ضروری تھا اسکی حفاظت کے اسباب کا مضبوط سلسلہ بالکل غیر مشتبہ ہونا عین منشاء ایزدی کے مطابق تھا۔ حضور علیہ السلام نے اپنی مدت رسالت میں قرآن مجید کے آیات شریفہ کو حسب ارشاد جبریل علیہ السلام اِس ترتیب سے لکھوایا جس ترتیب سے بارگاہ رب العزت سے نازل ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت زید ابن ثابت انصاری اور اُبی بن کعب اور عبداللہ بن سعد اور بعض دیگر اکابر صحابہ رض کاتبان وحی ہیں جو حسب ہدایت جناب نبوی چمڑے اور ہڈیوں پر آیات قرآنیہ لکھا کرتے تھے۔ سبحان اللہ شان ایزدی ہے کہ جس شخص پر قرآن مجید نازل ہوتا ہے وہ اسکے قلمبند کرنے سے بھی عاری ہے۔ ؎

کہ اُمی قلم را نگیرد بدست

[۱] بیشک ہم ہی نے قرآن شریف کو اُتارا ہے اور بیشک ہم اسکے نگہبان ہیں ۱۲ منہ

مگر ضبط و حفظ آیات کا اہتمام اسقدر عالی اور مستحکم واقع ہوا کہ اگر دنیا بھر کی سلطنتیں ملکر بھی کسی کتاب کی حفاظت کرنا چاہیں تو اس قدر طویل مدت کے گذرنے پر وہ کبھی تحریف و تبدیل سے محفوظ نہیں رہسکتی۔ یہ اس کتاب مقدس کا ایک بڑا زبردست معجزہ ہے جس کا مقابلہ کوئی آسمانی کتاب نہیں کرسکتی اور اس دعویٰ کی صداقت کو بجز تسلیم کرنے کے کوئی چارہ نہیں کیونکہ گفتگو واقعات کی صداقت پر مطلوب ہے نہ جہال حاسدین کی ہرزہ درائی پر بعض اوقات اکثر نیچر یہ خیالات کے مسلمان بھی احادیث نبویہ کے متعلق یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ احادیث کی جمع اور ترتیب زمانہ نبوی میں نہیں ہوئی تھی بلکہ بعد کے زمانہ میں علماء قرن ثانی و ثالث نے ان کی جمع اور ترتیب کی طرف توجہ مبذول کی اور اس لئے احادیث میں بہت سا غیر معتبر حصہ داخل ہوگیا۔ اس اعتراض کے مفصل جواب کا کوئی اور موقع ہونا چاہیئے۔ مگر اسقدر جان لینا نہایت ضروری ہے کہ خود حضور علیہ السلام شروع ایام رسالت میں احادیث کے لکھنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ اور اسلئے صحابہ رضہ کو سلسلہ روایات زبانی محفوظ رکھنا ہوتا تھا۔ اور وجہ مخالفت یہ تھی کہ مسلمان حضور علیہ السلام کی خدمت میں قرآن شریف سیکھا کرتے تھے۔ اور اس خیال کے پیدا ہوجانیکا قوی موقعہ تھا کہ کہیں احادیث اور آیات قرآنیہ کو لوگ خلط کر کے قرآن مجید میں عمداً یا سہواً تحریف نہ کر ڈالیں۔ گویا احادیث کا تمامہا[1] زمانہ نبوی قلمبند نہ ہونا بھی منجملہ ان اسباب کے تھا جن کے رو سے قرآن مجید میں کسی قسم کا تصرف عائد نہیں ہوا۔ بہرصورت آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں نہایت احتیاط سے کام لیا جاتا تھا۔ آیات قرآنیہ تو بمجرد نزول قلمبند ہوجاتیں اور صحابہ رضہ زبانی بھی حفظ کرلیتے۔ اور احادیث کے متعلق سلسلہ روایت نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اگر ایک یا دو یا زیادہ آدمی کسی خاص مواقع پر کسی ارشاد نبوی یا فعل نبوی کو سنتے یا دیکھتے تو فی الفور جماعت صحابہ رضہ میں انکی اشاعت ہوجاتی۔ پھر جب ایکدفعہ وہ حدیث قولی یا فعلی صحابہ رضہ منتشر ہوجاتی تو

---

[1] تمامہا کے لفظ سے اس امر کیطرف اشارہ مقصود ہے کہ بعض صحابہ رضہ نے اجازت ملجانے پر کچھ کچھ یادداشتیں قلمبند کر رکھی تھیں مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرو اکثر احادیث کو نقل کر لیا کرتے تھے ۱۲ منہ

اسکی نسبت آئندہ یہ اندیشہ نہ ہوتا۔ کہ اسکی اصل گم ہو جائیگی۔ کیونکہ وہ لوگ جو حضور علیہ السلام کی ادنیٰ ادنیٰ بات کو نہایت غور سے مطالعہ کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اور آپ کی روش پر عامل ہونے کو باعث نجات اخروی باور کرتے تھے۔ انکی نسبت یہ ظن بالکل فاسد ہے کہ کسی شخص نے کسی خاص موقعہ پر کوئی حدیث سنی اور بعد میں اُسکو یاد نہ رہی۔ اور جس طرح اُس نے چاہا روایت کر دیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ معترضین نے حضورؐ کے مستفیضین کو عوام الناس کی مجالس پر قیاس کیا ہے جن میں ادھر اُدھر کی لغویات بکی جاتی ہیں اور بعد میں انکو کوئی شخص باصلها روایت نہیں کرسکتا۔ یہ سچ ہے کہ اکثر احادیث بالمعنی روایت کی گئی ہیں۔ مگر اسکا یہ مطلب نہیں کہ احادیث کے الفاظ جو کتب احادیث میں ثبت ہیں حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے نہیں نکلے بلکہ اس سے یہ مقصود ہے کہ جو استحکام آیات قرآنیہ کو حاصل ہے وہ احادیث میں نہیں کیونکہ احادیث میں اختلاف روایت اکثر الفاظ میں کمی بیشی یا تقدیم و تاخیر موجود ہے۔ مگر اس سے نفس احادیث کی ضرورت اور حکم مبین کی اصلیت میں کسی قسم کا نقص عاید نہیں ہوتا۔ کیونکہ احادیث کی روایت تمام دیگر تاریخی روایات سے زیادہ معتبر ہے۔ احادیث میں ارشادات نبویہ دوسروں تک پہونچا دینے کی تصریح آچکی ہے مثلاً نضر اللہ امرأ سمع منا حدیثا فحفظہ حتی یبلغہ غیرہٗ یعنی خدائے تعالےٰ دین و دنیا میں اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جو ہم سے کسی حدیث کو سنکر ضبط کرے حتیٰ کہ وہ دوسرے شخص کو (بطور امانت کے) پہونچا دے اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ احادیث کو صرف بغرض عمل ہی ضبط نہیں رکھا کرتے تھے بلکہ وہ جانتے تھے کہ تبلیغ بھی بجائے خود ایک ثواب عظیم ہے پس معترضین کا یہ خیال کہ احادیث کا سلسلہ غیر معتبر ہے ہرگز سننے کے قابل نہیں۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ اگر حدیث نہ ہوتی تو آج قرآن کا سمجھنے والا دنیا میں ڈھونڈے نہ ملتا۔ اور لطف یہ کہ خود منکرین احادیث کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ مگر انکار کئے جا رہے ہیں[1] یعرفون نعمۃ اللہ ثم ینکرونہا

[1] اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جانتے ہیں اور پھر انکار کئے جاتے ہیں ۱۲ منہ

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ احادیث کا سلسلہ بھی منجملہ اسباب ضروریہ کے ایک سبب قوی ہے۔ قرآن مجید کے نزول اور اسکے جمع و ترتیب اور محفوظیت کے متعلق غور و خوض کرنیکا جس سے ایک فاضل محقق کو اس مقدس اور عظیم الشان کتاب کے متعلق نہایت آسانی کے ساتھ صحیح رائے قائم کرنیکا موقع ملسکتا ہے۔ بخاری وغیرہ معتبر کتب حدیث میں آیات قرآنی کی جمع و ترتیب کی نسبت یوں لکھا ہے۔ کہ خلیفہ اول صدیق اکبر رض نے زید ابن ثابت رض کو اپنے پاس بلوا بھیجا۔ اور آپ نے انہیں فرمایا کہ عمر بن خطاب رض نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ چونکہ مسیلمہ کذاب کے مقابلہ میں بہت سے مجاہدین صحابہ رض جنہیں قرآن مجید ضبط تھا شہادت پا چکے ہیں۔ اس لئے مجھے ڈر ہے کہ قرآن مجید لوگوں سے جاتا رہیگا۔ مناسب یہ ہے کہ آپ جمع و ترتیب کا حکم صادر فرمادیں۔ میں نے عمر رض کو یہ جواب دیا ہے کہ جس کام کے کرنیکا جناب پیغمبر نے اپنی زندگی میں حکم نہیں فرمایا اُسے ہم کیسے کرسکتے ہیں مگر عمر رض مصر اور مُصِرّ قرار ہے ہیں کہ ھذا واللہ خیر (بخدا یہ بھلا کام ہے) یعنی اس میں ہرگز خدا تعالےٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہیں بلکہ نہایت ضروری ہے سو مجھے بھی خداوند کریم کی طرف سے اطمینان ہوگیا ہے کہ عمر رض کی رائے نہایت درست اور قابل عمل ہے تم (اے زید) چونکہ صاحب عقل و فراست ہو اور امانت سپارہو نیکے علاوہ جناب پیغمبر کی زندگی میں کاتب الوحی رہ چکے ہو پوری پوری کوشش سے قرآن مجید کو ترتیب دو۔ زید ابن ثابت رض فرماتے ہیں کہ صدیق اکبر رض کی یہ بات سنکر مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس امر اہم کی بجائے اگر مجھے پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک اٹھالے جانے کی تکلیف دیجاتی تو میرے لئے قرآن مجید کی ترتیب سے بڑھکر زیادہ گراں نہ تھی میں نے عرض کیا کہ جس کام کو خود جناب حضور علیہ السلام نے نہیں کیا آپ اسے کیسے کرسکتے ؟ آپ نے فرمایا کہ بخدا یہ بہتر ہے چنانچہ آپ مجھسے بار بار اصرار کرتے رہے۔ حتیٰ کہ میرے دل میں بھی اس رائے کی عمدگی کا یقین ہوگیا۔ تب میں نے ہڈیوں۔ خرما کی چھالوں۔ سفید پتھروں وغیرہ کو جن پر قرآن مجید لکھا گیا تھا۔ جمع کیا اور

قاریوں سے جنہیں قرآن مجید ضبط تھا مدد لی اور آیات کو ترتیب دی۔ چنانچہ سورہ توبہ کی آیت لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم ابو خزیمہ انصاری رضؓ کے سوا کسی کے پاس نہ پائی گئی۔ یہ مصحف شریف جو اس طرح مرتب ہوا صدیق اکبر رضؓ کے پاس بعد ازاں عمر ابن خطاب رضؓ کے پاس پھر ام المومنین حفصہ بنت عمر رضؓ کے پاس محفوظ رہا۔

خلیفۂ سوم حضرت عثمان رضؓ کے زمانۂ خلافت میں جبکہ حذیفہ بن یمان خلیفہ کی طرف سے آرمینیہ اور آذربائیجان کے علاقہ میں جہاد کر رہے تھے تو آپ نے اہل عراق کو قرأت میں بہت اختلاف کرتے دیکھا۔ کوئی کسی قرأت کے مطابق پڑھتا اور کہتا یہی صحیح ہے اور کوئی دوسری قرأت کے مطابق پڑھتا اور اسی پر اصرار کرتا۔ حذیفہ رضؓ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ حال دیکھ کر عزم کر لیا کہ خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ عرض کروں گا کہ ان سب کو ایک ہی قرأت پر متفق کرنے کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ جب وہ خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے عرض کیا کہ آپ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ جس طرح زمانہ کے گذرنے پر یہود اور نصاریٰ نے اپنی کتابوں میں اختلاف پیدا کر لئے تھے یہ لوگ بھی قرآن مجید میں اختلاف کرنے لگیں۔ خلیفہ نے انکی اس التماس کو قرین مصلحت سمجھ کر ام المومنین حفصہ بنت عمر رضؓ کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ آپ قرآن شریف ارسال فرماویں تاکہ اس کی نقل لیکر آپ کو واپس کر دیا جائے۔ ام المومنین نے فی الفور قرآن مجید ارسال کر دیا اور اس کی چار یا پانچ نقلیں لی گئیں۔ امام سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں کہ حضرت ام المومنین والا قرآن مجید بلحاظ ترتیب آیات مرتب ہوا تھا مگر سورتوں کی ترتیب خلیفہ عثمان رضؓ کے عہد میں ہوئی اور یہ ترتیب بحضور اکابر صحابہؓ و قراءؒ قرار پائی۔ چنانچہ خلیفہ نے حضرات زید بن ثابت اور عبداللہ بن زبیر اور سعید ابن عاص اور عبدالرحمن بن حارث رضؓ کو حکم دیا کہ جہاں کہیں قرأت میں اختلاف پیدا ہو وہاں محاورۂ قریش کو مدنظر رکھو۔ کیونکہ قرآن مجید قریش ہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ یہ نقلیں جب تیار ہو گئیں تو علیحدہ علیحدہ ممالک میں ارسال کر دی گئیں اور حکم دیا گیا کہ کوئی شخص ان مصاحف کے برخلاف قرأت نہ کرے۔ ناظرین اس امر کو بھی خوب یاد رکھیں کہ ان مصاحف

پھر اعراب و اوقاف وغیرہ بعد میں قائم کئے گئے تھے کیونکہ وہ لوگ اہل زبان تھے اور انہیں ہرگز اس امر کی ضرورت نہ تھی کہ اعراب اور اوقاف کو جو بعد میں قائم کئے گئے۔ بذریعہ نشانات مکتوبہ سیکھتے۔ قرأت زبانی بذریعہ تعلیم و تعلیم کی جاتی تھی۔ اور اسی کی پابندی کیا کرتے تھے۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض متعصب عیسائیوں نے جب دیکھا کہ تفاسیر میں ایک ہی لفظ کے متعلق مختلف قرأتوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو انہوں نے ان علماء اسلام کے مقابلہ میں جو توریت و انجیل کی تحریف کا الزام عیسائیوں پر قائم کیا کرتے ہیں بطور معارضہ یہ بات کھڑی کر دی کہ قرأت کا اختلاف بھی قرآن مجید کی تحریف پر مبنی ہے حالانکہ اس بے اصل اعتراض کو خود جناب پیغمبرؐ نے رفع فرمایا حیث قال اقرأنی جبرائیل علی حرف فراجعتہ فلم ازل استزیدہ و یزیدنی حتی انتہی الی سبعۃ احرف یعنی مجھے جبرائیلؑ نے قرآن مجید ایک خاص تلفظ کے مطابق پڑھایا۔ میں اسے بار بار دہراتا رہا اور تلفظ کے دوسرے طریق کی بابت ان سے استدعا کرتا رہا۔ اور وہ بتلاتے رہے حتیٰ کہ سات مختلف طریقوں پر انہوں نے مجھے پڑھنا سکھایا۔ اس حدیث میں اگرچہ شراح حدیث کا اختلاف ہے کہ لفظ سبعۃ احرف سے کیا مراد ہے۔ مگر اقرب الی الصحت یہی معنی ہیں کہ ان سات طریقوں سے وہ سات مختلف وجوہ تلفظ[1] مراد ہیں جو قرأت سبعہ کے نام سے مشہور ہیں۔ بعض محدثین نے یہ بھی لکھا ہے کہ قرأت سبعہ ایک ہی لفظ میں ہوا کرتی ہیں اس لئے یہ صحیح نہیں کہ سبعۃ احرف سے سات قرأت مراد لی جائیں بلکہ سات مختلف عربی زبانوں کا استعمال مراد ہے دیکھو حدیث اذا اختلفتم فاکتبوہ بلغۃ قریش یعنی حضرت عثمانؓ نے لکھنے والوں کو حکم دیا کہ اگر

[1] مختلف وجوہ کی بابت استدعا کرنے سے یہ مقصود تھا کہ مختلف لوگوں کی زبانوں پر بآسانی جاری ہو سکے اور کسی کو پڑھنے میں دقت نہ ہو ۱۲ منہ

تمہیں اختلاف کا موقع پیش آئے تو لغت قریش کے مطابق لکھو۔[1] مگر واقعہ ذیل سے جو صحیح بخاری وغیرہ کتب احادیث میں مندرج ہے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ لفظ سبعۃ احرف سے سات مختلف وجوہ قرأت مراد ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ہشام بن حکیم کو زمانہ حیات نبوی نماز میں سورہ فرقان پڑھتے سنا۔ معلوم ہوا کہ وہ مختلف حروف پر قرآن مجید پڑھ رہے ہیں۔ میں نے چاہا کہ نماز ہی میں ان کی خبر لوں مگر میں منتظر رہا حتی کہ وہ نماز سے فارغ ہو گئے۔ میں نے ان کے گلے میں کپڑا ڈال دیا اور کہا کہ تمہیں یہ سورت اس طرح کس نے تعلیم کی ہے؟ انہوں نے کہا کہ مجھے جناب پیغمبرؐ نے یوں ہی تعلیم دی ہے۔ میں نے کہا کہ تو جھوٹ بولتا ہے کیونکہ مجھے جناب پیغمبرؐ نے اسکے برخلاف تعلیم کی ہے۔ آخر میں کشاں کشاں انہیں حضور علیہ السلام کی خدمت میں لے گیا۔ اور عرض کیا کہ یہ شخص سورہ فرقان کو برخلاف اس طریق کے پڑھتا ہے جس کے مطابق حضورؐ نے مجھے تعلیم فرمائی تھی۔ جناب پیغمبرؐ نے فرمایا کہ اس کے گلے سے کپڑا اتار ڈالو۔ پھر حضورؐ نے انہیں حکم دیا کہ ہشام پڑھو۔ انہوں نے سورت کو اسی طریق پر پڑھنا شروع کیا جس کے مطابق میں نے انہیں پڑھتے سنا تھا جناب پیغمبرؐ نے سن کر ارشاد فرمایا کذالک انزلت یعنی یونہی نازل ہوئی ہے۔ پھر مجھے ارشاد فرمایا کہ تم پڑھو میں نے سورت پڑھنا شروع کی۔ سنکر آپ نے فرمایا۔ کذالک انزلت ان هذا القرآن انزل علی سبعۃ احرف فاقرؤا ما تیسر منہ یعنی یونہی نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ قرآن شریف سات مختلف وجوہ قرأت پر نازل ہوا ہے۔ سو تم لوگ جس کو بہ آسانی پڑھ سکو پڑھا کرو۔ اس واقعہ سے عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ قرآن مجید میں مختلف طریق تلفظ کا موجود ہونا اس کی تحریف پر دلالت کرتا ہے بالکل باور ہوا ثابت ہوتا ہے۔ اور اگر لفظ سبعۃ احرف سے ہم یہ مراد لیں کہ ایک لفظ کی بجائے بعض روایات میں اس کا مترادف پڑھا جانا

[1] یہ اس امر کا جواب ہے کہ لکھنا قرأت کے منافی نہیں ہو سکتا یعنی تلفظ وہی سات طریق پر رہا اور لکھنے میں تلفظ قریش کی پابندی کی گئی اور جملہ انما نزل بلغتھم کا یہ مطلب ہے کہ اولاً لغت قریش میں نازل ہوا اور دوسرے وجوہ حضرت کی استدعا پر جبریل نے تعلیم کیے ۱۲ منہ

مروی ہے جیسے اقبل کی جگہ تعال کا پڑھنا جس کا ترجمہ فارسی میں بصیغہ امر بیا کیا جاتا ہے۔ تب بھی اس کو تحریف نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ یہ شارع سے ثابت ہے اور جو امر خود شارع سے بتعلیم وحی ثابت ہے۔ یا جو امر خود بہ شارع بتعلیم وحی ارشاد فرمائے اس کو تحریف کون کہہ سکتا ہے؟

ناظرین بخوبی سمجھ گئے ہونگے کہ قرآن مجید کو ترتیب موجودہ کے مطابق مرتب ہونے تک تین مرحلےلہ ایسے پیش آئے جن کی ہیئت پر غور کرنے سے اس میں اس کی محفوظیت پر ایک یقینی شہادت کا پتہ ملتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ جناب پیغمبرؐ کا ملک روحانی یعنی جبرئیلؑ سے قرآن مجید کا اخذ کرنا اور اس کو بحکم آیہ ان علینا جمعہ وقرآنہ ضبط رکھنا امر لازم تھا۔ چنانچہ ایک حدیث میں جس کو بخاری وغیرہ محدثین نے روایت کیا ہے یوں وارد ہے کہ حضور علیہ السلام ہر سال قرآن مجید کو جبرائیلؑ کے سامنے پڑھتے اور جبرئیل آپ کو سناتے اور حضور کے آخری سال حیات پر جبرئیل علیہ السلام نے دو دفعہ ایسا کیا جس پر حضور علیہ السلام نے اپنی رحلت کی پیش گوئی کر دی تھی جو اسی طرح واقعہ ہوئی اور صرف یہی نہیں بلکہ حضور کا فی الفور تعلیم جبرئیلؑ کے مطابق قلمبند کرا لینا اور خواص صحابہ کا فی الفور حفظ کر لینا ضبط آیات کی اعلیٰ اور اقویٰ دلیل ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود۔ سالم مولیٰ ابی حذیفہ۔ ابی بن کعب۔ معاذ بن جبل وغیرہم رضی صحابہ کبار بڑے بڑے مشہور قاری تھے جن سے حضورؐ لوگوں کو قرآن مجید سیکھنے کی ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ اور جنگ یمامہ میں قریبًا ستر بڑے بڑے قاری شہادت پا گئے جنہوں نے خود جناب پیغمبرؐ کی زبان مبارک سے قرآن مجید سیکھا تھا۔ اور شب و روز ان کا کام تلاوت کلام اللہ تھا۔ ان حالات پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود جناب پیغمبرؐ کے زمانہ حیات میں قرآن مجید بدرجہ اکمل محفوظ ہو چکا تھا۔ صرف اس کی ترتیب کی

لہ (۱) ترتیب آیات جو زمانہ نبوی ہو چکی تھی (۲) بشکل مصحف ایک جگہ جمع کرنا خلیفہ اول نے کیا (۳) اختلاف قرأت کو دور کرکے ایک قرأت متفق علیہ پر قرآن کو جمع کرنا اور مختلف ممالک میں بھیجنا خلیفہ ثالث نے کیا ۱۲ منہ

باقی تھی - چنانچہ صاحب تفسیر خازن نے مقدمہ تفسیر میں لکھا ہے کہ حضورؐ نے اپنی زندگی کے آخری سال میں زید بن ثابت رضؓ کو قرآن شریف سنایا اسلئے ان کا حضورؐ کی زبان مبارک سے سُننا قرآن مجید کی محفوظیت اور اس کی ترتیب پر ایک محکم دلیل ہے - اور یہی وجہ ہے کہ صدیق اکبرؓ نے انہیں آیات کو اسی ترتیب سے لکھنے کا حکم دیا جس ترتیب پر انہوں نے جناب پیغمبرؐ سے ضبط کر رکھا تھا - چنانچہ وہ لکھتے ہیں فکتبوہ کما سمعوہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یلقن اصحابہ ویعلمہم ما ینزل علیہ من القرآن علی الترتیب الذی ھو الآن فی مصاحفنا بتوقیف جبرئیل علیہ السلام ایاہ علی ذلک واعلامہ عند نزول کل آیۃ ان ھذہ الآیۃ تکتب عقب آیۃ کذا فی سورۃ کذا فثبت ان سعی الصحابۃ کان فی جمعہ فی موضع واحد لا فی ترتیبہ فان القرآن مکتوب فی اللوح المحفوظ علی النحو الذی ھو فی مصاحفنا الآن ... الخ یعنی بزمانہ صدیق اکبرؓ صحابہؓ نے قرآن مجید کو ٹھیک اسی صورت میں قلمبند کیا جس میں انہوں نے خود جناب پیغمبرؐ کی زبان مبارک سے سُنا تھا اور حضورؐ کا شیوہ تھا کہ جونہی کوئی آیت نازل ہوتی اُس کی تلقین صحابہؓ کو فرما دیتے اور اسی ترتیب پر تعلیم فرماتے جس ترتیب پر اب اس وقت ہمارے پاس موجود ہے اور یہ ترتیب جبرئیلؑ کی ہدایت کے مطابق تھی - کیونکہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو جبرئیلؑ فرما دیتے کہ اس کو فلاں سورت کے فلاں مقام پر رکھو - اس تقریر سے معلوم ہوا کہ صحابہؓ نے قرآن مجید کو صرف ایک جگہ جمع کر دیا اور ترتیب کسی کمی بیشی کے بغیر بعینہٖ وہی تھی جو جناب پیغمبرؐ نے بذریعہ تعلیم وحی قائم کی کیونکہ قرآن مجید اسی صورت میں لوح محفوظ کے اندر ثبت ہے جس صورت میں ہمارے پاس اب موجود ہے - اس صورت میں دو امر قابل غور ہیں اوّل حضورؐ کا صحابہؓ کو قرآن مجید سکھلا دینا - چنانچہ قرآن مجید میں اسکی شہادت موجود ہے یتلو علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ دوم - قرآن مجید کا لوح محفوظ میں ثبت ہونا - اسکی نسبت قرآن مجید فرماتا ہے بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ - اس لئے قرآن مجید کا محفوظ رہنا خود قرآن مجید سے ثابت ہو رہا ہے اور

...سی دلیل خارجی کا محتاج نہیں۔ مفسر خازن کی عبارت سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ مختلف
...رتوں کے نام بھی شارع ؑ سے منقول ہیں چنانچہ احادیث صحیحہ بکثرت اس کی تصدیق کرتی
...۔ پس ایک نیچری کا یہ اعتراض بالکل باطل ثابت ہوگیا کہ قرآن مجید کی آیات کی ترتیب
...سورتوں کے نام بعد میں علمائے اسلام نے قائم کئے ہیں۔ اس معترض سے کوئی یہ تو
...افت کرتا کہ تمہارے اس خیال کی کہیں سے تائید بھی ہوتی ہے یا صرف ظن کاذب کی پیروی
...رہے ہو؟ الغرض قرآن مجید کی محفوظیت کے اسباب کے سلسلہ میں غور کرنے سے معلوم
...ہے کہ جس خداوند کریم نے اپنی حکمت کاملہ سے اپنی اس بے بہا نعمت کو آسمان پر سے
...ل کیا تھا۔ اسے بحکم انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون۔ اس کو تحریف وتصرف
...یا ل بال مصون و مامون رکھا۔ یہ ہے قرآن مجید کا وہ معجزہ جس کو ہم مسلمان بڑے
...ے ساتھ تمام مذاہب عالم کے سامنے پیش کیا کرتے ہیں۔ اور جو کسی اور دوسری قوم کو
...یب نہیں ہوا۔ ناظرین غور کریں کہ آیا عیسائی لوگ اپنی کتب آسمانی کے متعلق اس قسم کے
...ردست دعویٰ کو اہل اسلام کے روبرو پیش کرکے سرخرو ہو سکتے ہیں؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

منجملہ اسباب حفظ قرآن کے ایک بڑا زبردست سبب یہ بھی تھا کہ قرآن مجید پورے
...یس سال کے عرصہ میں مختلف واقع اور مختلف حالات کے عائد ہونے پر نازل ہوتا رہا۔ چنانچہ
...ن مجید میں یہ امر کفار کی طرف سے بطور اعتراض پیش کیا گیا ہے کہ کیوں قرآن مجید ایک
...دفعہ نازل نہیں کیا گیا؟ چونکہ وہ لوگ حکمتِ ایزدی کے راز سے ناواقف تھے اور انکی نظریں
...ق امور تک نہ پہنچ سکتی تھیں اسلئے وہ قرآن مجید کے تدریج نازل ہونے کو موجب قدح
...نے لگے۔ مگر غور کرو کہ اس تدریجی نزول سے کیسے کیسے اہم فوائد حاصل ہوتے۔ مثلاً :-

(۱) تکالیف شرعیہ یعنی احکام متعلقہ عبادات بدنیہ و مالیہ اور نیز حلال و حرام وغیرہ کی
...ی کا ایک ہی وقت میں عائد کرنا مقتضائے فطرتِ انسانی کے بالکل برخلاف تھا۔ یقیناً
...ی اس کے متحمل نہ ہو سکتے کیونکہ جو طبائع فسق و فجور میں مستغرق اور ہر ایک قسم کی

بداعتقادی اور بدعملی کے نشہ میں چور ہو چکی تھیں انہیں آہستہ آہستہ صراط مستقیم شریعت
چلانا بالکل قانون الٰہی کے مطابق تھا۔

(ب) جناب پیغمبرؐ کو مخالفین کی اذیتوں پر صبر و تسلی دلانا نہایت اہم امر تھا۔ ا
مختلف مواقع پر وحی کا نازل ہونا حضورؐ کی بشریت پر غالب آکر آپ کو تبلیغ رسالت کے
ہمیشہ سرگرم و مستعد رکھتا۔ اس طریق پر حضورؐ کو سابقہ انبیاء علیہم السلام کے نظائر اور
وعدۂ نصرت کی خبر سنا کر ثابت قدم رکھا جاتا اور یہ نہایت ہی ضروری تھا۔ پڑھو آیہ کذا ل
لنثبت بہ فؤادک ... الخ جو کفار کے مذکورہ بالا اعتراض کے جواب میں واقع ہوئی

(ج) عملی طور پر احکام کی پابندی نہایت اطمینان اور یقین کے ساتھ صرف اسی وق
نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی تھی جبکہ مسلمان اوامر کی خوبی اور نواہی کے مضر نتائج کا بذات خو
کافی امتحان کر لیتے۔ کیونکہ ایسا علم بمنزلہ ایسے دعوے کے ہوتا ہے جو دلیل کے ساتھ تسلیم
جائے۔ برخلاف اسکے علم ملتا بعد تجربہ و مشاہدہ مفید یقین نہیں ہو سکتا۔

(د) احکام شریعت کے اسرار و حکم کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ احکا
اسباب اور ان کے نتائج کا علم حاصل ہو جائے تاکہ نفس انسانی انہیں بآسانی قبول کرے
اور چونکہ انہیں لوگوں کی صحیح روایات پر آئندہ شریعت اسلامی کا عظیم الشان قصر تیار ہون
اس لئے ضروری تھا کہ انہیں احکام کے علل اور نتائج کے استنباط کا موقع دیا جاتا چنا
آیۂ لعلمہ الذین یستنبطونہ میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ علم حدیث کے واقف
امر کو خوب جانتے ہیں کہ علم فقہ کی اجمالی اجتہادی صورت صحابہؓ کے زمانہ میں قائم ہو چکی تھی
تفصیلی صورت تابعین اور تبع تابعین رضہ کے علمائے عظام نے مکمل کر دی فالحمد
علٰی ذلک۔

(ھ) ہر ایک حکم کے متعلق خواہ امر ہو یا نہی یہ ضروری تھا کہ مخالف و موافق کو اس
غور کرنے کا پورا موقع دیا جاتا۔ تاکہ بعد میں بڑے بڑے احکام شریعت میں کسی قسم کا تغ

د رہتا کیونکہ ایسے امور شریعت کا خود شارعؑ کے سامنے طے ہونا ضروری ہے یہی وجہ کہ شریعت اسلامی بہ نسبت دیگر شریعتوں کے زیادہ وسیع اور مدلل ہے اور اس کے دلائل بالکل، روز روشن کی طرح واضح ہیں ؛

(۵) قرآن مجید کے تدریجی نزول کا ثمرہ اعلیٰ مقصد یہ تھا کہ آیات کو مسلمان لوگ نہایت استحکام کے ساتھ ضبط کرلیں تاکہ ان کی جمع اور ترتیب میں کوئی دقت پیش نہ آئے چنانچہ ایسا ہی ہوا کیونکہ مختلف صحابہؓ کو مختلف حصص ضبط تھے مگر سب کی مجموعی کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ خلیفہ اوّل ہی کے عہد میں یہ امر اہم نہایت عمدگی کے ساتھ مکمل ہوگیا اور اگر کچھ عرصہ زائد گذر جاتا تو ممکن تھا کہ وہ لوگ زندہ نہ رہتے اور خبط پڑجاتا جس کی نظیر یہود و نصاریٰ کی کتابوں کے متعلق ہم مشاہدہ کر رہے ہیں اور ایک عظیم الشان اور نہایت خفی و دقیق مصلحت خداوندی قرآن مجید کے تدریجی نزول میں یہ ہے کہ جناب پیغمبرؐ کی قدوسیت اگرچہ تمام انبیاء علیہم السلام کی نسبت کہیں بہت بالا تھی مگر با ایں ہمہ آپ کی بشریت قرآن مجید جیسی ایک گراں وزن امانت کے یکدفعہ متحمل ہونے کیلئے صرف اسی صورت میں ہوسکتی تھی جبکہ آپ کی ذات گرامی کی نوعیت افراد انسانی کی نوعیت سے علیحدہ کوئی اور نوعیت رکھتی مگر تبلیغ قرآن کے فریضہ بجالانے کے لئے آپ کا بشری لباس میں جلوہ گر ہونا ضروری تھا ؛

الغرض قرآن مجید کے تدریجی نزول میں قرآن مجید کے ضبط و استحکام کی ایک بری شہادت موجود ہے جس میں غور کرنے سے ایک ذرہ بھر بھی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ قرآن مجید کو بھی اللہ تعالےٰ نے اپنے دست قدرت میں سنبھالے رکھا اور آئندہ بھی جب تک آسمان پر ثوابت و سیارے چمکتے نظر آتے ہیں اور زمین پر نوع انسان آباد ہے بدیں ہیئت کذائی آفتاب نصف النہار کی طرح پرتو افگن رہیگا۔ اس میں مخالفین کا طعن و تشنیع کچھ اثر نہیں کرسکتے پڑھو آیہ لا یأتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه تنزیل من حکیم حمید۔ سبحان اللہ کیسی بڑی زبردست پیشگوئی ہے اس سے روئے زمین کے مخالف کو بھی انکار کا موقعہ نہیں مل سکتا۔ آج اگر بالفرض تمام قرآن مجید کے نسخے

انا سنلقی علیک قولا ثقیلا اور آیہ لو انزلنا هذا القرآن علی جبل کے معانی میں غور کرو۔ ۱۲ منہ

صفحۂ دنیا سے گم کر دئے جائیں تو پھر بھی یہ نعمت بیش بہا حفاظ وقراء کے پاس بدستور رہ
ہے۔ یہ بھی اس کا ایک زبردست معجزہ ہے۔ کیا کوئی دوسری قوم ایسی نظیر دکھلا سکتی ہے
مسلمانوں میں قرآن کا پڑھنا پڑھانا بجائے خود ایک بڑی عبادت ہے جس پر احادیث میں بڑے
بڑے ثواب عظیم کا ذکر آچکا ہے اور نیا نیا جاہل سے جاہل مسلمان بھی سورۂ فاتحہ اور سورۂ فاتحہ
کا حافظ ضرور ہوتا ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ اور ایسے خدا کے بندے تو لاکھوں موجود ہیں جو ہر
روز اسکی تلاوت کرتے اور اس کے خیر وبرکات سے مستفید ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں کسی
دوسرے مذہب میں یہ انتظام نہیں کیا گیا اور اسکی وجہ وہی ہے جو اوپر بتلائی جا چکی ہے کہ
احادیث میں قرآن مجید پڑھنے پڑھانے کے متعلق ثواب عظیم کا ذکر آچکا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث
میں یوں وارد ہے خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ یعنی تم میں سے بھلا آدمی وہ ہے جو قرآن مجید
کو سیکھتا اور دوسروں کو سکھلاتا ہے۔ پھر فرمایا من قرأ حرفا من کتاب اللہ فلہ بہ حسنة
والحسنة بعشر امثالہا لا اقول الم حرف ولکن الف حرف ولام حرف ومیم حرف یعنی
جو شخص قرآن مجید کا ایک حرف پڑھتا ہے اس کے لئے ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا عوض
دس گنا خدا کے ہاں مقرر ہے اور حرف سے مراد یہ نہیں کہ پورا (الم) ایک حرف ہو بلکہ الف
ایک حرف اور لام ایک حرف اور میم ایک حرف سمجھو۔ پھر فرمایا۔ ان الذی لیس فی جوفہ شئ
من القرآن کالبیت الخرب یعنی جس شخص کے دل میں قرآن شریف کا کچھ حصہ بھی داخل
نہیں ہوا وہ ایک اجڑے گھر کی طرح ہے۔ علٰے ہذا القیاس اور بہت سی احادیث ہیں جو اس
بارہ میں کتب احادیث میں مذکور ہیں۔ خدائے تعالٰے نے جنہیں توفیق دے رکھی ہے وہ ہر روز
بلا تردد و تساہل اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

اعجاز القرآن

دنیا میں جس قدر انبیاء علیہم السلام خدا کی طرف سے کسی قوم میں مبعوث ہوتے وہ

اپنے منجانب اللہ نبی ہونے کے ثبوت میں اپنی اپنی قوم کے سامنے ہر ایک قسم کے دلائل پیش کرتے رہے۔ کیونکہ یہ عام دستور ہے بلکہ یوں کہو کہ فطرت انسانی کا اقتضا ہے کہ کوئی دعویٰ بلا دلیل قابل تسلیم نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ ضرورت نبوت کو تسلیم کرتے ہیں وہ اس امر کا یقین رکھتے ہیں کہ انبیاء دنیا میں وہ کام کرتے ہیں جس کو کوئی دوسرا شخص ہرگز نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شرائع و دیانات کے اصول و احکام کا وضع کرنا اور بندوں اور خدا کے تعلقات کی حقیقت کا کھولنا تعلیم وحی کے بغیر ممکن نہیں۔ اشیاء کی ماہیت اور اسباب و مسببات میں ربط حقیقی کی تعلیم کا مدار اگر حکماء کی تحقیق پر ہوتا تو آئے دن فلسفہ اور سائنس کے اصول میں کسی قسم کا تغیر و تبدل پیدا نہ ہوتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ شروع آفرینش سے آجتک حکماء کی تحقیق نے انسانی دنیا میں کسی قسم کا استقلال پیدا نہیں کیا۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ گو انسانی قوائے فطری کے عمل کا دائرہ بہت وسیع ہے مگر پھر بھی انکا عمل محدود ہے۔ اس لئے حکماء کی تحقیقات میں ہر وقت تبدیل و ترمیم کی گنجائش موجود ہے اور ہمیشہ یوں ہی رہیگا۔ برخلاف اسکے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم شروع عالم سے آجتک ایک ہی روش پر چلی آئی ہے۔ کیونکہ اصول اسلام کی تعلیم تمام انبیاء میں ہمیشہ یکساں رہی ہے اور ان کی تعلیم میں تخالف نہیں پایا جاتا وجہ یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا منبع آسمانی وحی ہوتا ہے جس میں کسی قسم کی شائبہ کذب اور احتمال وساوس کو جو قوت واہمہ کا نتیجہ ہے مطلقاً دخل نہیں ہوتا اور حکماء کی تحقیق کا مدار محض تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہے اور تجربہ[1] و مشاہدہ قوائے فطرت انسانی کا نتیجہ ہے جن کا عمل محدود اور بوجہ اختلاط وہم ناقابل اطمینان ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ کبھی فلسفی تحقیق غیر متبدل اور قطعی نہیں کہلا سکتی۔ اگر کوئی شخص غلطی سے غیر متبدل خیال کرے تو یوں سمجھا جائیگا کہ وہ اپنے ناقص قویٰ کے نتیجہ تک تمام افراد انسانی کو محدود دیکھنا چاہتا ہے مگر یہ کیسی فاش غلطی ہے

چو آں کرمے کہ در گندم نہان است
زمین و آسمان او ہمان است

---

[1] انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا مدار نہ صرف تجربہ و مشاہدہ پر منحصر ہے بلکہ ان کے تجربہ و مشاہدہ کی تصدیق بذریعہ وحی و الہام ہوتی ہے اور اسی لئے وہ قطعی ہوتے ہیں ۱۲ منہ

کلام بھی منجملہ صفات باری ایک صفت ہے۔ اِس لئے جس طرح ہم دیگر صفات باری کی حقیقت کو نہیں جان سکتے بلکہ ان کی نسبت ہمارا علم اضافی ہے اسی طرح کلام ذات باری کی حقیقت کی نسبت بھی ہمارا علم محض اضافی ہوتا ہے۔ کیونکہ الفاظ سے ہم صرف بقدر حوصلۂ فطرت حقائق و معارف کا علم حاصل کر سکتے ہیں۔ کوئی شخص اِس امر کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کلام ذات باری کی حقیقت سے کما حقہ واقف ہے۔ یہی وجہ اعجاز ہے جو قرآن شریف کے متعلق علمائے اسلام بیان کیا کرتے ہیں مگر مجھے اس کے متعلق ذرا زیادہ تشریح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مناسب نظر آتا ہے کہ پہلے چند مبادی کا ذکر کیا جائے۔ ناظرین ذرا غور سے کام لیں:

(۱) انسان بمفاد ان اللہ خلق آدم علیٰ صورتہ نمونۂ ذات باری ہے۔ چنانچہ جن صفات کی نسبت ہم ذات باری کی طرف حقیقی طور پر کرتے ہیں انہیں صفات کی نسبت انسان کی طرف بھی مجازی طور پر کیجاتی ہے۔ مثلاً ذات باری کے صفات میں سمیع و بصیر داخل ہیں کیونکہ سمیع و بصیر کا اطلاق خداوند کریم نے اپنی ذات پر کیا ہے۔ اسی طرح انسان کے لئے بھی ہم ان صفات کو تجویز کر سکتے ہیں۔ کیونکہ قرآن مجید میں انسان کی نسبت فجعلناہ سمیعًا بصیرًا آچکا ہے۔ صرف فرق اس قدر ہے کہ ذات باری کے صفات کسی علت کے معلول نہیں یعنی اسکے صفات ذاتی ہیں جو کسی غیر سے مکتسب نہیں مگر انسان کے صفات اس کی ذات کی طرح ذات باری کا معلول ہیں۔ ظاہر ہے کہ معلول و غیر معلول کی حقیقت ایک نہیں ہو سکتی۔ بلکہ دونوں میں صرف ایک اشتراک لفظی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس سمع و بصر کی نسبت انسان کی طرف کی جاتی ہے اسکی حقیقت اس سمع و بصر سے مختلف ہے جو ذات باری کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اسی طرح وصف کلام کی حقیقت بھی دونوں صورتوں میں یکساں نہیں ہوگی۔ اس اصل کو خوب یاد رکھنا چاہیئے کیونکہ اسی اصل پر اعجاز قرآن کا مسئلہ طے ہوگا۔

(۲) صفات ذات باری چونکہ کسی علت کے معلول نہیں اسلئے وہ ہر ایک جہت سے کامل ہیں۔ کیونکہ کسی چیز کا معلول ہونا منافی کمال حقیقی ہے اور وہ ازلی اور ابدی ہے اور

اپنی نوعیت مجہولہ میں وہ انسانی صفات کی طرح آلات اعضاء کے محتاج نہیں ۔ اور اس لئے غیر متناہی بھی ہیں۔ اگر ہم صفات کو من کل الوجوہ کامل اور لامتناہی تسلیم نہ کریں تو ہمیں ان کو ضرورۃً ناقص اور محدود تسلیم کرنا پڑیگا۔ اس صورت میں ذات باری کو علت موجودات بھی نہیں مانا جائیگا کیونکہ جو چیز فی حد ذاتہٖ ناقص ہے وہ علت تامہ قرار نہیں پا سکتی پس خدا کا کلام جو اسکی ایک صفت ہے لامتناہی ہے اور من کل الوجوہ کامل ؛

(۲) ذات باری کے تمام صفات کو ہم دو طور پر قیاس کر سکتے ہیں یا یوں کہو کہ ہر ایک صفت کے لئے دو پہلو اعتبار کے قائم کئے جا سکتے ہیں ۔ اول بہ تعلق ذات باری۔ دوم بہ تعلق مظاہر موجودات ۔ اعتبار اوّل کے رُو سے صفات مجہول الکنہ ہیں یعنی انکی حقیقت کو ہم نہیں جان سکتے اور اسلئے وہ قابلِ بحث بھی نہیں ۔ گو فرقہ معتزلہ نے ان پر بہت طویل بحثیں کیں اور گمراہ ہوئے مگر سوائے خبط کے انکے مباحث سے کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا ۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ صفات ذات باری اسکی ذات کی طرح ناقابلِ فہم ہیں ۔ ہمارا فرض صرف ان صفات پر ایمان لانا ہے اور بس ۔ آبہ لیس کمثلہ شئی میں غور کرو ۔ البتہ صفات اعتبار دُوم کے رُو سے قابلِ بحث ہیں[1] کیونکہ ہم انکے آثار مظاہر قدرت میں دیکھتے ہیں جن سے کسی عاقل کو انکار نہیں ہو سکتا ۔ کلام کے لئے اعتبار دوم کے رُو سے الفاظ قرآنیہ مظاہر ہیں ؛

(۳) مظاہر صفات یعنی افراد موجودات بروجہ کمال موجود ہیں ۔ کیونکہ اگر ہم ان میں کوئی نقص تسلیم کریں تو یہ نقص نقصان علت کا مستلزم ہے بعض اوقات ہم کسی چیز کو غیر مکمل یا ناقص کہہ دیتے ہیں مگر اسکا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ اس نقص کی وجہ علت کے نقصان پر مبنی ہے ؎

نقصاں ز قابل است وگرنہ علی الدوام ؛ فیضِ سعادتش ہمہ کس را برابر است

[1] یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بار بار مظاہر قدرت میں تفکر و تدبر کرنے کی تاکید کرتا ہے ۔ چونکہ الفاظ قرآنیہ صفت کلام کا مظہر ہیں اسلئے بطور زجر استفہام کرتا ہے ۔ افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا ۔ امنہ

مذکورہ بالا مبادی کے سمجھ لینے پر اعجاز قرآن کا مسئلہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کیونکہ جب ہم قرآن مجید کو کلام الٰہی تسلیم کرلیں تو اس کا ضروری نتیجہ یہ ہونا چاہئیے کہ وہ کلام بے مثل و بے ہمتا ہے - ہاں علمائے امت کا فرض ہے کہ وہ منکرین کو ثابت کر دکھلائیں کہ واقعی قرآن مجید میں وہ تمام وجوہ اعجاز پائے جاتے ہیں جن کا کسی کلام الٰہی میں موجود ہونا ضروری ہے - ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید نہایت زور کے ساتھ مخالفین کو اپنے مقابلہ کے لئے بلاتا ہے - اور ساتھ ہی یہ بھی سنا دیتا ہے کہ تم قطعاً اور یقیناً اس کلام کا مثل و نظیر نہیں لاسکو گے خواہ تم اور تمہارے چھوٹے بڑے ملکر اس بات میں زور لگائیں از صرف تم یعنی نوع انسان بلکہ نوع جن بھی ۔ چنانچہ قرآن مجید کی یہ پیشینگوئی پوری ہوگئی اور پوری رہیگی - ایسی حالت میں خواہ مخواہ ایک محقق کی توجہ اس امر کی طرف مبذول ہوجاتی ہے کہ اس بڑے زبردست دعوےٰ کا موازنہ کرے جو نہ صرف معدودے چند آدمیوں کے برخلاف کیا گیا ہے بلکہ تمام روئے زمین کی آبادی کے برخلاف اور نہ کسی مخصوص زمانہ تک یہ دعوےٰ محدود ہے بلکہ تاقیامت بدستور قائم ہے - ثانیاً ایسا محقق آیات قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے وقت اس دعوے کی قطعیت کو تسلیم نہیں کرتا ہوگا مگر میں یقین کرتا ہوں کہ حق تفکر و تدبر ادا کرنے کے بعد وہ شخص حیرت زدہ ہوکر رہ جائیگا اور بلا ساختہ وہ کہنے لگیگا سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم - اس خیال کی تصدیق کرلینا کچھ بھی مشکل نہیں - کیونکہ جس طرح گوہر شاہوار سوا ایک خاص طبعی طریق کے جو معلوم ہے پیدا نہیں ہوسکتا گو بظاہر مصنوعی طور پر اسی قسم کے کئی ایک گوہر آبدار بنا رکھے جاسکتے ہیں - اسی طرح کلام الٰہی بھی سوا اس طریق معین کے جو انبیاء علیہم السلام سے مخصوص ہے دنیا میں لوگوں تک نہیں پہنچ سکتا - ہاں انسان کا کلام بھی مصنوعی آبدار موتیوں کی طرح ناواقف آدمی کو ایسا ہی نظر آتا ہے جیسا خدا کا کلام - مگر جس طرح گوہر شناس کے بدون ہر دو قسم کے موتیوں میں کوئی ناواقف آدمی تمیز نہیں کرسکتا اسی طرح سوائے علمائے راسخین فی العلم کے

کلام الٰہی اور کلام انسان میں نا واقف کو تمیز کرنا دشوار ہے۔

اعجاز قرآن کے متعلق وجوہ ذیل نہایت قابلِ توجہ ہیں:۔

(۱) فصاحت و بلاغت۔

جو لوگ عربی زبان کی فصاحت و بلاغت سے واقف ہیں اُنہیں اِس امر کا تسلیم کر لینا مشکل نہیں ہوگا کہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت بجائے خود ایک معجزہ ہے کیونکہ عرصہ تئیس سال تک لگاتار حضور علیہ السلام بڑے بڑے فصحا و بلغا مشرکین عرب کو مقابلہ کے لئے بلاتے رہے مگر کسی کو حوصلہ نہ پڑا کہ چند ایک آیاتِ الٰہی کا معارضہ کرتا۔ حالانکہ وہ لوگ اپنی زبان میں قادر الکلام اور ہر ایک قسم کے مضمون کو نہایت پر زور الفاظ میں ادا کر سکتے تھے۔ چنانچہ انکے خطبات و اشعار سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ وہ فصاحت و بلاغت کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے اور اپنے مقابلہ میں کسی غیر کو فصیح و بلیغ تسلیم نہیں کرتے تھے انکے ہاں ایام حج میں سالانہ مجالس مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں فیصلہ کے لئے ثالث مقرر ہوتے اور سب سے بڑھکر نمبر لینے والوں کا کلام کھال پر لکھ کر دیوار کعبہ پر آویزاں[1] کر دیا جاتا۔ فصاحت و بلاغت کا چرچا حضور علیہ السلام کے زمانہ میں اسقدر ہو گیا تھا کہ اُنہوں نے اسی کو معیار صداقت قرار دے رکھا تھا۔ چنانچہ باہم مشورہ کر کے اُنہوں نے ولید بن مغیرہ کو جو بڑا فصیح و بلیغ تھا حضور علیہ السلام کے پاس بغرض الزام حجت روانہ کیا جسکی استدعا پر حضور علیہ السلام نے قرآن مجید کی کچھ آیتیں پڑھیں۔ جب اُس نے یہ آیت سنی ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربی وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی ۔ ۔ ۔ ۔ الخ تو بے اختیار بول اُٹھا واللہ ان له لحلاوة وان علیه لطلاوة وان اسفله لمغدق وان اعلاه لمثمر۔ ابو عبید ایک اعرابی کا ذکر کرتے ہیں کہ اُس نے آیہ فاصدع بما تؤمر سُن کر فی الفور سجدہ کیا اور کہا کہ میں اس کلام کی تاب

[1] بعض یورپین جہال نے دیوار کعبہ پر آویزاں کرنے کے واقعہ کو تسلیم نہیں کیا جنکی تقلید میں ہمارے ملک کے بعض جہال بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں دیکھا سرلیس مقدمہ میں میرکہ انکی نظر اہل عرب کی تحقیق سے زیادہ مستحق اعتماد نہیں۔ یہاں غلط فہمی کی تحقیق کا کوئی دوسرا مقام ہے ۱۲ منہ
بمعاملہ اس کلام میں حلاوت اور رونق معلوم ہوتی ہے اس کا نچلا حصہ تو سیراب ہے اور اوپر کا حصہ بار دار ہے ۱۲ منہ

نہ لاسکا۔ اس کی فصاحت و بلاغت انسانی قدرت سے خارج ہے۔ اسی لئے میں نے سجدہ کیا ایک اور اعرابی نے جب آیہ فلما استیئسوا منہ خلصوا نجیا سنی تو کہا کہ خدا کی قسم میں شہادت دیتا ہوں کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت عمر خطابؓ ایک دن مسجد میں لیٹے تھے کہ یکایک ایک شخص سر پر آکھڑا ہوا۔ آپ کے دریافت کرنے پر اس نے جواب دیا کہ میں روم کا بطریق ہوں اور میں نے ایک مسلمان سے یہ آیت سنی ہے ومن یطع اللہ ورسولہ ویخش اللہ ویتقہ فاولئک ھم الفائزون مجھے اس آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ اس آیت کا منبع وہی ہے جو مسیح علیہ السلام کے اسی کلام کا منبع تھا۔ الغرض اسی قسم کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں جن سے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے سامنے بڑے بڑے فصحاء عرب نے اپنے عجز کا اقرار کر لیا۔ جو لوگ فصاحت و بلاغت عربی سے ناواقف ہیں ان کے لئے اسی بات پر اکتفا کرنا ضروری ہے کہ جب فصحاء عرب عاجز آگئے تو دوسرا کون مقابلہ کر سکے گا؟

(۴) نظم عجیب و اسلوب غریب۔

یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ قرآن مجید کا طریق بیان دیگر فصحا و بلغا کے طریق بیان سے بالکل نرالا ہے اس امر کو عربی نہ جاننے والا بھی سمجھ سکتا ہے کیونکہ آیات کے مقاطع اور فواصل یعنی مقامات وقف بالکل نئی قسم کے ہیں جو نہ تو قرآن مجید سے پہلے کسی کلام میں موجود ہیں اور نہ بعد کے کسی کلام میں اور طرفہ یہ کہ کوئی شخص اس اسلوب کو نباہ نہیں سکتا۔ خواہ کوئی فصیح و بلیغ ادیب کیسی محنت و کوشش کیوں نہ کرے۔ چنانچہ اس جدید و عجیب اسلوب کو دیکھ کر فصحاء عرب دنگ رہ گئے کیونکہ انہیں اس اسلوب کا کوئی کلام نثر یا نظم یا سجع یا رجز یا شعر نہ مل سکا جس کو وہ مقابلہ میں پیش کر سکتے۔ جب ولید بن مغیرہ حضور علیہ السلام سے قرآن مجید سنکر واپس آیا تو اس کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ ابوجہل لعین نے اسے ڈانٹا کہ دیکھو اپنی اس حالت کا قریش کے سامنے اظہار مت کیجو۔ ایسا نہ ہو کہ اس ساحرانہ کلام سے وہ متاثر ہو جائیں۔ ولید نے کہا کہ تم جو چاہو کرو مگر میں اسقدر کہنے سے تو باز نہیں رہ سکتا

کہ میں کلام عرب میں تم سے بڑھ کر مہارت رکھتا ہوں مگر اس کلام کا مثل آج تک میرے کان میں نہیں پہنچا۔ اُنھوں نے کہا کیا وہ کلام کسی کاہن کا سجع ہے؟ کہا نہیں۔ اُنھوں نے کہا کیا کسی دیوانہ کا کلام ہے؟ کہا ہرگز نہیں۔ پھر اُنھوں نے کہا کیا شعر کی قسم سے ہے اس نے جواب دیا واللہ میں شعر کے تمام اقسام سے واقف ہوں۔ یہ کلام شعر بھی نہیں اُنھوں نے کہا کیا وہ سحر ہے؟ کہا سحر بھی نہیں مگر تم یونہی کہوگے کہ سحر ہے۔ اکثر آئمہ محققین کا یہ مذہب ہے کہ فصاحت و بلاغت بجائے خود ایک وجہ اعجاز ہے اور اسلوب غریب بجائے خود یعنی ہر دو علیحدہ علیحدہ وجہ اعجاز قرار پاسکتے ہیں مگر بعض دیگر لوگ مجموعہ فصاحت و بلاغت اور اسلوب عجیب کو وجہ اعجاز قرار دیتے ہیں۔ قاضی عیاض اس پچھلے خیال سے مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو شخص قواعد فصاحت و بلاغت سے واقف ہے وہ کبھی تسلیم نہیں کرے گا کہ فصاحت و بلاغت بجائے خود اور اسلوب غریب بجائے خود علیحدہ علیحدہ معجز نہیں۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ جودت الفاظ او حشمت معنی مع قواعد بلاغت ایجاز و اطناب۔ حذف۔ تقدیر وغیرہ کسی کلام میں اس طرح نہیں پائے گئے جس طرح قرآن مجید میں۔ یہی وجہ ہے کہ عرب اسکے مقابلہ سے عاجز آگئے ؛

(۳) اخبار بالمغیبات۔

باآنکہ موجودہ زمانہ میں علوم جدیدہ ترقی کے اعلیٰ معراج تک پہنچ گئے ہیں مگر آئندہ واقعات ے متعلق صحیح اور درست خبر دینا کسی فرد بشر کا کام نہیں منجم لوگ بعض اوقات اٹکل پچو کوئی ت کہہ دیا کرتے ہیں اور وہ پوری ہو جاتی ہے مگر اکثر باتیں غلط جاتی ہیں اس لئے اتفاقاً کسی ت کا پورا ہو جانا ہم بھی تسلیم کرتے ہیں مگر سب کی سب باتوں کا پورا ہو جانا اور ان میں سے سی ایک کا بھی مفہوم لفظ سے سرمو تفاوت نہ کرنا اس امر کی صاف اور واضح دلیل ہے کہ ن الفاظ کا منبع کوئی مافوق العقل ہستی ہے جسکا علم حضوری ہے نہ حصولی۔ حضور علیہ السلام زبان مبارک سے بذریعہ وحی جس قدر پیشینگوئیاں ظاہر ہوئیں اور جنکا جا بجا قرآن مجید

میں ذکر آیا ہے اپنے اپنے وقت میں ٹھیک طور پر واقع ہوئیں تا آنکہ مخالفین نے بھی ان کی صحت کا اقرار کیا۔ حاملانِ قرآن مجید جانتے ہیں کہ اس پاک کلام میں اس قدر پیشینگوئیاں آچکی ہیں کہ کسی دوسری آسمانی کتاب میں اسکی نظیر نہیں مِل سکتی۔ ذیل میں بطور نمونہ چند ایک کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے :۔

(۱) لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ امنین۔ (تم عنقریب انشاء اللہ با امن و امان مسجد حرام میں داخل ہوگے) ۱۲ منہ

چنانچہ مسلمان صلح حدیبیہ کے بعد مسجد حرام میں داخل ہوئے اور مناسک حج کو بجا لائے حالانکہ ہجرت کے بعد مشرکین یہ کہتے تھے کہ اب مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ہم بیت اللہ سے خارج کر چکے ہیں ٭

(۲) وھم من بعد غلبھم سیغلبون۔ (رومی مغلوب ہو کر عنقریب ایرانیوں پر غالب آجائینگے) ۱۲ منہ

پہلے روم والے مغلوب ہو گئے پھر اس پیشینگوئی کے مطابق رومی سلطنت ایران پر غالب آگئی ٭

(۳) ورفعنا لک ذکرک (ہم نے تیرے ذکر کو بلند کیا) ۱۲ منہ

غور کرو کہ خداوند کریم نے حضور علیہ السلام کے نام مبارک کی کس قدر عزت کی ہے کہ آٹھ پہر میں کل دُنیا کے مسلمان جس قدر آپ کا نام مبارک زبان پر لاتے ہیں یقیناً کسی فرقہ کے لوگ اپنے پیشوا کا اتنا ذکر نہیں کرتے۔ بعض خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جو ہزارہا بار درود شریف ہر روز پڑھتے ہیں۔ جاہل بھی اذان نماز کو سنا کر کلمہ پڑھتے ہیں خود اذان و نماز میں آپ کے نام کا ذکر داخل کیا گیا اور یہ پیشگوئی اس وقت کی ہے جبکہ مسلمان ابھی مکہ میں چند در چند تھے اور ظاہر حالات سے یہ قیاس ہوتا تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکے گا ٭

(۴) لیظھرہ علی الدین کلہ (اللہ نے اسلام دے کر اپنے رسول کو بھیجا ہے تاکہ تمام

ادیان پر اسکو غالب کرے) ۱۲ منہ

چنانچہ تمام ادیان باطلہ پر اسلام کو غلبہ حاصل ہوگیا اور حضور علیہ السلام دنیا سے اس وقت رخصت ہوئے جبکہ تمام عرب میں اسلام کا زور تھا اور آپ نے فرمایا کہ میں جاتا ہوں اور اب قیامت تک عرب میں بت پرستی نہیں ہوگی ؀

(۵) وعد اللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصلحت لیستخلفنہم فی الارض (خدا نے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایماندار ہیں اور اعمال صالحہ بجالاتے ہیں خلافت کا وعدہ کرلیا ہے) ۱۲ منہ ؀

علم تاریخ کے واقف جانتے ہیں کہ مسلمان حضور علیہ السلام کے بعد پچاس سال ہی میں مشرق سے مغرب تک پہنچ گئے۔ اس پیشگوئی کا ذکر ایک حدیث میں یوں آیا ہے کہ مجھے تمام روئے زمین کو مشرق سے مغرب تک خداوندکریم نے اکٹھا کرکے دکھلا دیا اور میری اُمت عنقریب ان حدود تک ترقی کرکے پہنچیگی ؀

(۶) انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (قرآن مجید ہم نے اُتارا ہے اور ہم ہی اسکے نگہبان ہیں) ۱۲ منہ

غور کرو کہ تمام دُنیا میں کوئی اس قسم کی کتاب نہیں ملتی جسکے الفاظ بلا فرق زیر و زبر محفوظ رہ سکے ہوں۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ کتاب والے نے وہ کتاب اپنے ہاتھ سے نہ لکھی ہو یہ بات کسی دوسری آسمانی کتاب میں نہیں ملتی۔ توریت و انجیل کا جو حال ہورہا ہے وہ ناظرین پر مخفی نہیں۔ قرآن مجید اگر کاغذوں میں لکھا ہوا تمام دُنیا میں نہ مل سکے پھر بھی قرآن مجید مسلمانوں سے گم نہیں ہوسکتا کسی مذہب کے لوگوں کو اپنی ساری کتاب کبھی ازبر ضبط نہیں ہوئی مگر مسلمانوں میں لاکھوں حُفاظ دُنیا میں موجود ہیں جو ایک ایک حرکت کو بڑی احتیاط کے ساتھ ضبط کرتے ہیں۔ اگر قرآن مجید میں اس قسم کے تصرف کو دخل ہوتا تو مخالفین مذہب تو کیا مسلمانوں کے اپنے مختلف فرقے آجتک اس کی اصلی صورت کو بدلکر کسی اور صورت

ہیں سے آئے ہوتے ؛

(۷) انا کفینٰک المستھزءین (اے پیغمبر ہم نے تجھ سے استہزا کرنے والوں کا فیصلہ کر دیا ہے) ۱۲ منہ

حضور علیہ السّلام کی اہانت کرنے والے مخالفین کا آپ کی زندگی ہی میں اس طرح خاتمہ ہو گیا کہ زمانے نے اُن کا پتہ تک نہ دیا کہ وہ کون تھے اور کہاں تھے ؟

(۸) واللہ یعصمک من الناس (اے پیغمبر خدا تجھے تیرے دشمنوں سے محفوظ رکھیگا) حب اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کی حفاظت جان کا وعدہ فرما لیا تو آپ نے اس دن سے اپنی جسمانی حفاظت کرنا چھوڑ دیا اور فرمایا کہ خدا مجھکو کبھی دشمن کے بس میں نہیں ڈالیگا ؛

الغرض اس قسم کی اور بہت سی پیش گوئیاں قرآن مجید میں مذکور ہیں اور یہ بات تو اکثر تھی کہ اگر مخالفین کوئی منصوبہ باندھتے تو قرآن مجید فوراً نازل ہوتا اور اُنکی قلعی کھولدیتا ؛

(۴) اخبار بالامم الماضیۃ ۔

قرآن مجید ان اقوام کا مفصل ذکر کرتا ہے جنھوں نے انبیاء علیہم السّلام کی مخالفت کر کے اپنے تئیں مورد عذاب الٰہی ٹھہرایا ۔ حالانکہ حضور علیہ السّلام محض امی تھے ۔ کبھی گمان نہیں ہو سکتا کہ آپ نے علم تاریخ الاقوام حاصل کیا بلکہ اس زمانے کے علماء یہود و نصاریٰ بھی اسقدر شرح و بسط حالات سے واقف نہ تھے جو قرآن مجید میں مذکور ہے ۔ اہل کتاب اکثر حضور علیہ السّلام سے امتحاناً بعض قصص کی صحت کی بابت سوال کیا کرتے اور صحیح جواب پاتے چنانچہ قصہ اصحاب کہف قصہ یوسف ۔ قصہ ذوالقرنین ۔ قصہ لقمان ۔ قصہ موسیٰ و خضر قرآن مجید میں اسی قسم کی مثالیں ہیں مع ہذا حضور علیہ السّلام کے اکثر مواقع پر اہل کتاب کو احکام توریت دربارہ حلال و حرام بتلائے اور حدود اللہ کا پتہ دیا اور بطور اتمام حجت انہیں کہا گیا ۔ کہ اچھا اگر تم میری بات پر یقین نہیں رکھتے تو لاؤ توریت اور پڑھو ۔ آیا اس میں میری بات کی تصدیق ہے یا تمہاری بات کی ؛

یہ سب امور ایک ایسے شخص کی طرف سے ہیں جس نے ایک جاہل سوسائٹی میں پرورش پائی اور ایک دن بھی کسی اُستاد سے سبق حاصل نہیں کیا اور اگر ایسا ہوتا تو حضورؐ کے مخالفین جھٹ مُنہ پر کہدیتے ❊

(۵) تعجیز و مباہلہ۔

علاقہ نجران کے نصاریٰ مباہلہ سے عاجز آکر واپس ہو گئے۔ کیونکہ اسقف نے اُنہیں کہدیا کہ مجھے یقین آگیا ہے کہ یہ شخص سچا نبی ہے۔ اگر تم مباہلہ کے لئے سامنے آئے تو ہلاک کر دئے جاؤ گے۔ چنانچہ وہ سب کے سب مباہلہ سے ڈر کر باز آئے اور آئندہ حضور علیہ السلام کی تکذیب سے توبہ کر گئے۔ اسی طرح یہود کو حکم ہوا کہ اگر تم آحبّا ر اللہ ہونے کا دعوے کرتے ہو تو تم خدا سے موت کی تمنا کرو۔ تاکہ دار آخرت میں تمہیں عزت و اکرام کی زندگی نصیب ہو۔ مگر کسی نے تمنا ظاہر نہ کی۔ کیونکہ اُنکے دلوں میں ہیبت و خوف کلام الٰہی کا پورا پورا سکہ جما ہوا تھا ❊

(۶) خشیت و حشمت۔

کسی کلام میں یہ وصف نہ پاؤ گے مگر کلام الٰہی میں یہ وصف نہایت مستحکم طور پر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ خود قرآن مجید اس امر کا اظہار کرتا ہے لو انزلنا ھذا القرآن علےٰ جبل لرایتہ خاشعاً متصدّعاً من خشیۃ اللہ یعنی حقیقت قرآنیہ پہاڑ پر متجلی ہوتی تو وہ خشیت و ہیبت و جلال و سطوت الٰہی سے چکنا چور ہو جاتا یہی وجہ ہے کہ جب عتبہ بن ربیعہ کفار کی طرف سے حضور علیہ السلام کے پاس آیا تو حضورؐ نے سورہ حٰمٓ سجدہ پڑھنا شروع کی جب اُسنے آیت صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد و ثمود سُنی تو اُس نے حضورؐ کے دہان مبارک پر اپنا ہاتھ رکھدیا اور کہا کہ خدا کے لئے بس کریں مجھے اس سے آگے سننے کی تاب نہیں۔ حضورؐ پڑھتے گئے اور عتبہ دونو ہاتھ حضور علیہ السلام کی پیٹھ مبارک پر رکھکر کھڑا سنتا رہا۔ آیت سجدہ میں پہنچکر حضور علیہ السلام نے سجدہ کیا اور عتبہ واپس

چلا گیا۔ جب اس کے ساتھی اس کے پاس آئے تو اُن سے کہنے لگا کہ بخدا اُس نے کچھ ایسا کلام پڑھا ہے کہ آجتک میرے کان میں نہیں پڑا۔ میں نہیں جانتا کہ میں اس کلام کا کیا نام لوں۔ یحییٰ بن حکم اندلس کا فصیح و بلیغ کہتا ہے کہ میں نے بطور امتحان سورہ خلاص کا جواب لکھنا چاہا کہ یکایک میرے دل میں ایک خوف سا پیدا ہوا اور غیر معمولی ہیبت نے مجھے ایسا منکسر کیا کہ بے اختیار میرے آنسو بہنے لگ گئے اور میں نے توبہ کی۔ کتب سیر اور تواریخ میں اس قسم کے بیشمار واقعات صحیحہ موجود ہیں ہر ایک شخص اپنا اطمینان کرسکتا ہے۔

(۷) بقاء و ثبات۔

انبیاء علیہم السلام کو جس قدر معجزات عطا ہوئے وہ سب فانی تھے جنکا اثر بعد میں صرف بذریعہ سماع، روایت باقی رہ گیا۔ مگر حضور علیہ السلام کو اس قسم کے معجزات کے علاوہ قرآن مجید ایک ایسا معجزہ ملا جو بدستور تا قیامت قائم رہیگا لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید[۱]۔

(۸) استلذاذ مع التکرار۔

کوئی کلام خواہ کیسا ہی فصیح و بلیغ کیوں نہ ہو طبیعت انسانی کو اسکے دوبارہ سُننے یا زیادہ مزاولت کرنے سے ایک گونہ ملال پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر قرآن مجید سے باوجود تکرار کے ہر آن میں ایک نئی فرحت و مسرت دل کو حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ یہ وصف قرآن مجید کا تجربہ میں آچکا ہے کہ دُنیا کے غم و الم دل سے دور کرتا ہے۔ بالخصوص جبکہ تفکر و تدبر سے پڑھا جاوے۔

(۹) معارف و حقائق۔

کوئی کلام دُنیا میں اس قدر وجوہ کثیر کا جامع نہیں جس قدر قرآن شریف چنانچہ اس میں علوم اوّلین و آخرین درج ہیں باوجود اختصار اور ایجاز عبارت کے اس میں احکام

[۱] قرآن مجید میں نہ تو اب نہ کسی بعد کے زمانہ میں باطل کو دخل ہوگا یہ خدائے حکیم و حمید کا نازل کیا ہوا کلام ہے۔ ۱۲

عبادات و معاملات قصص اقوام جمیع مظاہر قدرت - اخلاق - تمدن - اصول سلطنت اسرار مبدء و معاد سلسلہ دلیل و مدلول وغیرہ کا مفصل بیان ہے - چنانچہ آیت ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شیٍٔ[1] میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے - اسی خیال کو جناب امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہٗ نے شعر ذیل میں یوں ظاہر فرمایا ہے ؎

جمیع العلم فی القرآن لکن
تقاصر عنہ افہام الرجال[2]

اور لطف یہ ہے کہ اہلِ فلسفہ اہل تصوف اہل فقہ اہل ادب الغرض سب کے سب اپنے اپنے مذاق کے مطابق اسے معجز تسلیم کرتے ہیں ؛

(۱۰) سہولت حفظ -

تعجب کی بات ہے کہ اَن پڑھ لوگ بھی اِس کلام کو نہایت عمدگی سے پڑھ سکتے ہیں اور بآسانی حفظ کر لیتے ہیں - برخلاف اسکے کسی دوسری کتاب کا ایک صفحہ بھی اَن پڑھ آدمی سے حفظ نہیں ہو سکتا - مسلمانوں میں آٹھ آٹھ نو نو سال کے بچے حافظ قرآن موجود ہیں ؛

میں نے نہایت اختصار کے ساتھ وجوہ اعجاز کا ذکر کیا ہے - کیونکہ اکثر وجوہ اعجاز علوم عالیہ کے جاننے پر موقوف ہیں - مگر ناظرین کی ایمانی تقویت کے لئے یہ بھی کافی ہیں - اس زمانے کے بعض اہلِ بدعت یہ خیال کرتے ہیں - کہ قرآن مجید کا کلام معجز نہیں - مگر ان کا یہ خیال ویسا ہی بے معنی ہے جیسا انکا بعض دیگر امور قطعیہ سے انکار کر دینا - وہ یہ کہتے ہیں کہ آج تک اگر کسی نے اس کلام کا معارضہ نہیں کیا - تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ درحقیقت اس کا معارضہ نہیں ہو سکتا - مگر میں کہتا ہوں کہ مشرکین بھی لو نشاء لقلنا

---

[1] اے پیغمبر ہم نے تجھ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جو تمام اشیاء کی حقیقت کو واضح کرتی ہے ۱۲ منہ

[2] سب علم قرآن مجید میں مندرج ہیں - مگر لوگوں کے افہام انکے سمجھنے سے کوتاہ ہیں ۱۲ منہ

مثل ھذا[1] کہا کرتے تھے۔ پھر کیوں کسی نے ویسا کلام پیش نہ کیا۔ کیونکہ کسی مخالف و موافق سے اس قسم کی کوئی روایت مروی نہیں۔ سچ ہے ؎

وکم من عائب قولا صحیحا[2]

وآفتہ من الفہم السقیم

سبحان اللہ اس قسم کے خفاش فطرت لوگ بھی موجود ہیں۔ جو نور قرآن کی تاب نہیں لا سکتے بھلا ان دشمنان عقل سے کوئی یہ تو پوچھے کہ تمہارے پاس کوئی دلیل قطعی بھی ہے یا یونہی عداوت فی سبیل الشیطان کے طور پر اپنے وہم کی پیروی کر رہے ہو۔ مجھے اس خدائے خالق السموٰت والارض کی قسم ہے کہ جسکا یہ کلام ہے کہ یہ خیال کلام مقدس پر سراسر اتہام اور بہتان ہے جس کو ایک ایمان دار شخص سنکر فوراً کانپ اٹھتا ہے وما قدروا اللہ حق قدرہٖ۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک کرسچین نے اعتراض کیا تھا۔ کہ مسلمان لوگ قرآن مجید کو فصیح و بلیغ مانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس کی فصاحت و بلاغت معجزہ ہے۔ حالانکہ دنیا میں ہر ایک زبان کی فصیح و بلیغ کتابیں موجود ہے۔ سو یہ اسی قسم کا قیاس ہے جیسے کوئی خاکروب یوں کہنے لگے کہ میں بھی شہنشاہ ہندوستان کی طرح آدمی ہوں۔ اسلئے میرا اور اس کا رتبہ باہم برابر ہے۔ ایسے منطقی اور فلاسفر پادری صاحب کو یوں کہنا چاہئے کہ ہاں صاحب بے شک قرآن مجید وہی حروف تہجی اور قواعد نحو رکھتا ہے جو دیگر کتب مگر فرق صرف اتنا ہی ہے کہ وہ خدائے برتر کا کلام ہے اور یہ عاجز بندوں کا۔ اور خدا اور بندے کے کلام میں وہی فرق ہے جو خدا اور بندہ میں۔ آپ صرف الفاظ کو الفاظ پر قیاس کرنے لگ گئے یہ کیسی سراسر حماقت ہے ؎

تو ز قرآں لفظ ظاہر را مبیں

دیو آدم را نہ بیند جز کہ طیں

---

[1] اگر ہم ایسا کلام کہنا چاہتے تو کہہ دیتے ۱۲ منہ [2] اکثر لوگ کسی صحیح یا معنی کلام کو ناقص کہدیتے ہیں مگر ان کم بختوں کی اپنی سمجھ کا قصور ہوتا ہے ۱۲ منہ

تبصرہ صاحبو! اس امر کو خوب یاد رکھنا چاہئیے کہ کلام الٰہی کا رتبہ دُنیا کے تمام انواع کلام سے برتر اور اعلےٰ ہے۔ جس طرح اس حکیم مطلق کے دیگر مصنوعات کا مقابلہ کوئی انسانی طاقت نہیں کرسکتی۔ بعینہٖ اسی طرح کلام الٰہی کا معارضہ کرنا نا ممکن ہے۔ یا یوں کہو کہ جس طرح تین و پانچ و سات وغیرہ طاق اعداد کا دو صحیح عددوں میں تقسیم ہونا عقل کبھی تجویز نہیں کرسکتی۔ اسی طرح کلام الٰہی کا معارضہ بھی محال عقلی ہے وہ کیسے کج سرشت لوگ ہیں جو بلا دلیل مُنہ سے ایک بات نکال پھینکتے ہیں اور اپنی ہوائے نفس کو قطعی رائے قرار دیتے ہیں؟

فائدہ ناظرین اس نکتہ کو خوب یاد رکھیں کہ کلام الٰہی جو صفت باری تعالےٰ ہے ان معانی و حقائق کا نام ہے جو ذات باری سے متعلق ہیں اور اس تعلق کی نوعیت دیگر صفات مثلاً سمع اور بصر کی طرح مجہول الکنہ ہے یا نا قابلِ دریافت ہے۔ چونکہ صفات ذات باری قدیم ہیں اسلئے کلام الٰہی بھی قدیم ہے۔ قرآن مجید میں جو بار بار انزلنا۔ نزلنا۔ تنزیل۔ تنزل وغیرہ الفاظ کلام الٰہی کے بارہ میں آچکے ہیں ان سے اس کلام کا نازل کرنا مقصود نہیں جو مذکورہ بالا معنی کی رُو سے ذات باری کی صفت ہے بلکہ نزول ان الفاظ کی صفت ہے جنکو ہم روزمرہ پڑھتے سنتے ہیں۔ ارادہ ازلی سے معانی کی غیر مادی صورتیں قلم نے لوح محفوظ میں مرقوم کیں اور ان حقائق کو الفاظ کی صورت میں بحکم اللہ تبارک وتعالےٰ جبریل علیہ السلام جناب ختمیت مآب کے پاس لائے۔ کیونکہ جس طرح عالم کی ہدایت کیلئے نوع انسان سے انبیاء مبعوث ہوئے اسی طرح وہ ہدایت بھی انسانی کلام کی صورت میں نازل ہوئی۔ تاکہ لوگ بآسانی اسے پہلے پہل الفاظ کی صورت میں سمجھ سکیں۔ بعدازاں بذریعہ تزکیہ و تصفیہ ان کے نفوس میں لوح محفوظ کے حقائق مجردہ غیر مادیہ کے حاصل کرنیکی قابلیت پیدا ہو جائے اور انبیاء علیہم السّلام کے نفوس قدسیہ اس مقام سے آگے کہیں دُور نکل گئے ہوتے ہیں اور ان میں بھی مدارج ہیں تلک الرسل فضلنا بعضہم علیٰ بعض۔ اس طریق ہدایت میں حکمت یہ ہے کہ روحیں چونکہ علم مادی میں زیادہ مستغرق ہونے کی وجہ سے غیر مادی حقائق کا ادراک نہیں کرسکتیں اسلئے بذریعہ مجاہدت و ریاضت

ان میں غیر مادی عالم کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی صلاحیت آجاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان کبھی روحانی منازل کی سیر نہ کر سکتا۔ درحقیقت انسان کے اشرف المخلوقات ہونیکی وجہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ اس کے سوا انسان کو دیگر موجودات پر کوئی وجہ شرف نظر نہیں آتی۔ اسی صلاحیت کی وجہ سے انسان مادی دنیا میں بھی تمام مخلوقات میں تصرف کرتا ہے۔ اس ترقی میں انسان کی مثال بعینہ بعض ان حیوانات کی سی ہے جنکو جنگل سے قابو میں لاکر مختلف قسم کے حیلہ اور تدبیر سے سدھایا جاتا ہے۔ انسان بھی جب الفاظ قرآنیہ سے ہدایت کو حاصل کر لیتا ہے تو حسب ریاضت اسے منازل روحانی کی سیر کا موقع پیش آتا ہے ؎

اعجاز قرآن کا مسئلہ کچھ ایسا دلچسپ اور بسیط ہے کہ اس میں ایک محقق کے لئے بحث کی بڑی گنجائش ہے ے۔

فان وجدت لسانا قائلا فقل

اب میں ذیل میں حضور علیہ السلام کی ایک حدیث اور جناب علی کرم اللہ وجہہ کے ایک خطبہ کے بعض فقرات کا ترجمہ لکھکر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں تاکہ ناظرین کیلئے موجب تقویت ایمان اور باعث مزید ایقان ہو ؎

فرمایا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہ خداوند کریم نے قرآن مجید نازل کیا ہے جو گناہوں سے روکتا ہے اور نیک کاموں کی طرف بلاتا ہے۔ یہ پہلے انبیاء علیہم السلام کی سنت کو بیان کرتا ہے۔ اس میں گذشتہ اور موجودہ اور آنیوالی قوموں کے حالات مندرج ہیں باوجود بار بار تلاوت کے طبیعت میں کسی قسم کا ملال پیدا نہیں ہوتا۔ اسکے عجائبات کی تھاہ کا کچھ پتہ نہیں۔ یہ حق ہے کچھ ہنسی مخول نہیں۔ جو شخص اسکو زبان پر لاتا ہے وہ صدق کا اظہار کرتا ہے۔ اور جو شخص اس کے مطابق حکم کرتا ہے وہ عادل ہے۔ اور جو شخص حجت میں اس کو پیش کرتا ہے وہ غالب رہتا ہے اور جو شخص اس کو معیار تقسیم قرار دیتا ہے۔ وہ انصاف

ے اگر تجھے زبان گویا حاصل ہے تو کہے چل ۱۲ منہ

اور ان بزرگواروں نے بلاکم وکاست ان عالی ہمت مردانِ خدا کے سپرد کر دیئے۔ جنہوں نے بڑے بڑے دفاتر میں نہایت عرقریزی اور جانفشانی کے ساتھ عمریں صرف کرکے ایسی متانت سے قلمبند کئے کہ آج ہم لوگ بلا دقت اپنے ہر ایک قسم کے شک وشبہ کو دُور کر سکتے ہیں۔ اور اپنے نفوس سقیمہ کا معالجہ تجویز کرکے تقرب الی اللہ کا درجہ پا سکتے ہیں۔ انہیں نے اسماء الرجال کی بنا ڈالی تاکہ راویانِ حدیث کے حالات علمی اور حفظ وضبط اور اتقاء و اخلاق وغیرہ امور کا ہمیں پتہ لگ سکے کیونکہ جب تک ایسے اشخاص کے جوہر ایک طرح سے قابلِ اطمینان ثابت ہوں کسی دوسرے کی روایت کو پایہ اعتبار حاصل نہیں ہو سکتا انہیں نے اُصول حدیث کو باندھا اور اقسام حدیث متواتر مشہور۔ عزیز۔ غریب۔ مرفوع و موقوف۔ منقطع ومرسل وغیرہ کو قائم کرکے ہر ایک کی حُجیّت کا موازنہ کیا۔ اور تطبیق وترجیح کے قواعد مقرر کئے اور موضوع اور ضعیف وقوی کی پوری پوری تنقید کی جس سے ملحدین کی تمام موضوعہ اور غلط احادیث ایسے طور پر علیحدہ کر دکھائیں جیسے دودھ سے مکھی نکال کر باہر پھینکدی جاتی ہے؎

اِن حضرات کے بعد آنیوالے علماء ملت نے لغات حدیث پر کتابیں لکھیں اور بڑی بڑی بسیط وسیع شرحیں قلمبند کیں جن سے سنت جناب رسول علیہ السلام کا قلعہ اس طرح مضبوط ہو گیا کہ اگر آج تمام روئے زمین کی سلطنتیں ملکر اس کو منہدم کرنا چاہیں تو سَر کی کھا کر رہ جائیں۔ کیا ایک انصاف پسند آدمی کے لئے جو اپنے امعان نظر سے کام لے اس امر میں شک کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ یہ سب کچھ حضور علیہ السلام کے اس نور پاک کا پرتو تھا جو بذریعہ وحی جناب باری سے سینہ مبارک نبوی میں القاء ہوا اور مسلسل ان نفوس قدسیہ تک پہنچا جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ علمی معجزات کا ذکر کرتے ہوئے حضورؐ کے اس معجزہ کا مقابل کوئی دوسرا معجزہ ہو سکتا ہے کہنے کو تو کتب صحاح تمام لوگ کہا کرتے ہیں مگر کوئی حقیقت بین اور سلامت کیش فطرت چاہیئے جو حقیقت قرآنیہ کو چشم بصیرت سے

ان میں جلوہ گر دیکھے۔ اور اُسے یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ ودیعت جو آدم علیہ السلام سے مسیح علیہ السلام تک یکے بعد دیگرے تمام انبیاء علیہم السلام کے پاس منتقل ہوتی رہی اور اہل عالم اس سے مستفید ہونے سے محروم تھے۔ بالآخر بوساطت جناب ختم المرسلین اس اُمت مرحومہ کے نصیب ہوئی ؎

تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

سنّت مطہرہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حقانیت پر اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہوگی کہ جن بزرگوارانِ دین نے اس کو سفر و حضر میں ظاہر و باطن میں لیل و نہار میں اپنی روش زندگی کا دستور العمل قرار دے لیا۔ انہیں تقرب الی اللہ کے مدارج عالیہ پر پہونچنا نصیب ہوگیا۔ وہ صاحب کشف و کرامات ہوگئے۔ انکی دعائیں مستجاب ہوئیں وہ لاکھوں کیلئے راہنما بنے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا مستغنی بنا دیا کہ دُنیا و مافیہا کی انکی نگاہ میں کچھ حقیقت نہ رہی اور انکے مبارک نام قیامت تک کیلئے صفحۂ عالم پر کندہ کر دئے گئے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے خوش ہوئے اور اللہ تعالیٰ اُن سے خوش ہوگیا یہ وہی بزرگوار ہیں جن کا اشارہ آیہ واٰخرین منھم لما یلحقوا بھم میں آچکا ہے۔ برخلاف اس کے جن لوگوں نے اس صراط مستقیم سے مُنہ پھیر لیا اور این و آں کے پیچھے دوڑتے پھرے اور اپنے معلومات اور تحقیقات پر اتراتے رہے اور بزعم خود سالکانِ طریق کو غلط راستے پر سمجھتے رہے اور سوء ظن سے انہیں مشکوٰۃ النبوۃ سے اقتباس انوار کا موقع نہ ملا اور غلط طریق کو حق باور کرتے رہے۔ نہ تو انہیں کسی منزل تحقیق تک پہنچنا نصیب ہوا۔ اور نہ اپنے دعاوی باطلہ کو اپنے بعد قائم رکھ سکے۔ چند روز کے لئے کرمک شب تاب کی طرح اپنی چمک دکھلا گئے۔ مگر خدا کے نور کو ماند نہ کر سکے۔

اب ہم اس سوء ظن کو دُور کرتے ہیں کہ کتب احادیث میں بناوٹی اور فرضی باتیں لکھی ہیں ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ خیال ایک بڑی سخت گستاخی ہے اور نشان شقاوت ہے کیونکہ اگر ہم ان بزرگوارانِ دین کے حق میں سوء ظن پیدا کرلیں۔ جنھوں نے نزول وحی کے مواقع اور

اسباب کا بزمانہ نبوی بچشم خود مشاہدہ کیا اور حضور علیہ السلام کی صحبت بابرکت میں رہ کر علمی
اور عملی کمالات کے رنگ میں رنگے گئے - اور جن کی تصدیق میں قرآن مجید کی آیات نہایت
زور کے ساتھ ناطق ہیں تو پھر ہم نہیں سمجھتا کہ حق اور صداقت کی تلاش ہم کس جگہ کر سکتے
ہیں اور وہ کونسے ایسے ماخذ ہیں جہاں سے ہم اپنا اطمینان کر سکیں - کیونکہ قرآن مجید بھی
تو ہمیں انہیں حضرات کی معرفت ملا ہے اور انہیں کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے جس خدا نے
اس مقدس کتاب کو تحریف سے آجتک محفوظ رکھا ہے اسی نے ہمیں یہ بھی تلقین کی ہے
لقد[1] کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ اور اسی نے ہمیں یہ ہدایت فرمائی قل ان
کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ - یہی دو آیتیں سمجھدار صداقت پسند کے لئے
سنت مطہرہ نبویہ کے ثبوت میں کافی و وافی ہیں بشرطیکہ کج بحثی سے کام نہ لیا جائے *

جس نبی اللہ کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے اور قرآن مجید جھوٹوں
کی نسبت لعنت اللہ علی الکاذبین کا حکم کرتا ہے - کیا اس کے حاشیہ نشین
اور تربیت یافتہ لوگ اللہ اور اللہ کے رسول پر بہتان باندھنے کی جرأت کرینگے؟ معاذ اللہ
ایسا خیال صرف اسی شخص کا ہو سکتا ہے جس کے دل میں مطلق خدا کا خوف باقی نہ رہا
ہو اور وہ شیطان کے دام میں ایسا گرفتار ہو چکا ہو کہ اسکا رہائی پانا ناممکن ہو جائے - ورنہ
عقل و ہوش کا آدمی خود سمجھ سکتا ہے کہ وہ لوگ تو جناب رسولؐ کی خدمت سراپا برکت میں
صلاح و تقویٰ اور نجات آخرت کی امید پہ گھر بار چھوڑ کر آ بیٹھے تھے - اگر انہوں نے جھوٹ
بولنا ہی سیکھا تھا تو معاذ اللہ یہ کس قدر بھاری تہمت ہے نہ صرف انہیں حضرات پہ بلکہ
رسول خدا اور خدا پر وہی لوگ تو اس حدیث کے راوی ہوں مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا
فلیتبوأ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ - اور خود ہی اللہ کے سچے رسول کی طرف جھوٹی باتیں نسبت

[1] یہ خیال کہ رسول یعنی قرآن ماخوذ ہے - ایک ایسی فاش غلطی ہے جو سیاق و سباق آیت کے منافی ہے - بھلا آیۃ
یایہا الرسول بلغ ما انزل الیک کے یہ معنی ہونگے کہ اے قرآن تو قرآن مجید کو لوگوں کے سامنے پیش
کردے - ۱۲ منہ

کرنے بیٹھ جائیں اور اگر بفرض محال اسکو سچ مان لیا جائے تو لازم آئیگا کہ شروع اسلام سے آجتک تمام لوگ ضلالت و غوائت کے گڑھے میں پڑے رہے اور ان میں سے کوئی بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ صرف قرآن مجید ہی تمام احکام کی وضاحت کے لئے کافی ہے احادیث کی کیا ضرورت ہے؟ اور یہ بات سمجھ میں آئی تو ان لوگوں کو جنہیں نہ تو علم ہے نہ عمل نہ صلاح نہ تقویٰ ؎

کس نیاید بزیر سایہ بوم
ور ہما از جہاں شود معدوم

اسلام میں مطلق کذب کی سخت مذمت وارد ہوئی ہے۔ اور گو اس کی ممانعت میں تمام مذاہب متفق ہیں۔ مگر ہم چند احادیث کو ذیل میں بطور شہادت کے پیش کرتے ہیں۔ اہل ایمان خود اندازہ لگا لینگے کہ جو لوگ ان احادیث کے راوی ہیں آیا وہ جھوٹ بولنے والے لوگ تھے ؟

(ا) ابوداؤد اور ترمذی ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں ایاکم والکذب فان الکذب یھدی الی الفجور وان الفجور یھدی الی النار۔ یعنی جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ آدمی کو بدکاری کی ہدایت کرتا ہے۔ اور بدکاری جہنم میں پہنچا دیتی ہے۔

(ب) مسند امام احمدؒ میں بروایت ابن لہیعہ مروی ہے۔ اِذَا کَذَبَ الْعَبْدُ فَجَرَ واذا فجر کفر واذا کفر دخل النار۔ یعنی آدمی جب جھوٹ اپنی عادت بنا لیتا ہے تو بدکاری تک پہنچ جاتا ہے۔ اور جب بدکاری کا مرتکب ہوتا ہے تو کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور جب کفر کرتا ہے تو مستوجب جہنم ہو جاتا ہے ؛

(ج) صحیحین میں مروی ہے کہ منافق آدمی کے تین نشان ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے اِذَا حَدَّثَ کَذِبَ۔ یعنی جب بات کہے تو جھوٹ کہے ؛

(د) مسند امام احمد اور طبرانی میں مروی ہے لَا یُؤْمِنُ العبد الایمان کلہ حتی

یترك الكذب فی المزاح والمراء وان كان صادقا۔ یعنی آدمی کامل الایمان نہیں ہو سکتا۔ جب تک ہنسی مخول اور جھگڑے میں بھی جھوٹ بولنا ترک نہ کر دے گو وہ سچا ہی ہو ؁

(ہ) طبرانی۔ بیہقی۔ ابویعلی بسند صحیح راوی ہیں یطبع المومن علی كل خلة غیر الخیانة والكذب۔ یعنی ایمانداری میں تمام خصائل طبعی ہو سکتے ہیں۔ مگر خیانت اور جھوٹ اسکی فطرت سے دور ہوتے ہیں ؁

(و) مالک رضہ بطریق ارسال راوی ہیں قیل یا رسول اللہ ایكون المومن جبانا قال نعم۔ قیل له ایكون المؤمن بخیلا قال نعم قیل له ایكون المومن كذابا قال لا یعنی حضور سے سوال کیا گیا کہ ایماندار آدمی بزدل ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر سوال کیا گیا کہ ایماندار آدمی بخیل ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر سائل نے سوال کیا کہ آیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں!

(ز) مسند امام احمدؒ میں بروایت ابوہریرہ رضہ مروی ہے من قال لصبی تعال هاك اعطك ثم لم یعطه فهی كذبة۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی بچے کو یوں کہے کہ آؤ میں تمہیں کچھ دوں پھر وہ اسے کچھ نہ دے تو یہ بھی ایک جھوٹ ہے۔ ان مسطورہ بالا احادیث میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جھوٹ کی شارع علیہ السلام نے کس قدر مذمت فرمائی ہے اور قرآن مجید کا جھوٹے کو مستوجب لعنت قرار دینا کس قدر سخت وعید ہے۔ یہ تو عام طور پر جھوٹ کی نسبت حکم ہے مگر اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول مقبول کی طرف کوئی جھوٹی بات نسبت کرنا اس سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ چنانچہ قرآن مجید صاف صاف اس حکم کو بدیں الفاظ واضح کرتا ہے وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ۔ یعنی قیامت کو تم ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا سیاہ رو دیکھو گے۔ اور حدیث مَنْ كَذَبَ عَلَیَّ متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار جو اوپر مذکور ہوئی محققین اہل حدیث کے نزدیک متواتر تسلیم کیگئی ہے۔ چنانچہ قریباً اسی۸۰ صحابہ سے

ملہ جیسے طبرانی اور ابن منده نے ۸۰ طریق پر اس حدیث کی تخریج کی ہے اور محدث ابن حجر عسقلانی مؤلف فتح الباری شرح صحیح بخاری نے اس حدیث پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے ۱۲ منہ

مختلف طریقوں پر مروی ہے۔ پھر ایک دوسری حدیث میں جو بروایت مسلم مروی ہے اس امر کی تصریح ہوئی ہے من حدث عنی بحدیث یریٰ انہ کذب فھو احد الکاذبین یعنی جو شخص میری طرف کسی ایسی حدیث کی نسبت کرے جس کو وہ جھوٹ باور کرتا ہو تو وہ شخص بھی جھوٹوں میں ایک جھوٹا ہے۔

ناظرین بانصاف غور کریں کہ جو لوگ اس حدیث کو اپنا دستورالعمل بنالینگے کیا وہ خدا کے رسول مقبول کی طرف کوئی جھوٹ بات منسوب کرسکیں گے؟ انہوں نے سچ اور جھوٹ میں کامل تمیز کرنے کے لیئے علم اسماء الرجال وضع کیا اور جھوٹوں اور موضوع اور ضعیف حدیثوں کے راویوں کی فہرستیں لکھیں تاکہ لوگ شریعت میں کسی جھوٹی بات پر دھوکا کھاکر اس کو حکم شرعی نہ سمجھنے لگیں۔ درحقیقت وہ زمانہ سخت ابتلاء کا زمانہ تھا جبکہ مختلف قسم کے اہل بدعت نے اپنے اپنے دعاوی کے اثبات میں جھوٹی حدیثیں بنانی شروع کردیں اور حق و باطل میں ایسا اختلاط پیدا کردیا کہ جس کو دور کرنا انہیں مردانِ خدا کا کام تھا جن کو اللہ تعالےٰ نے اہل ایمان کے لیئے پیشوا اور قدوہ قرار دیا۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ ان کا ذکر خیر دلوں میں ایمانی طاقت کو مضبوط کردیتا ہے اور ان کی روش مستقیم کو سُن کر محبت شریعت دل میں پیدا ہوتی ہے کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ عبداللہ ابن عباسؓ اور عبداللہ ابن مسعود اور عبداللہ بن عمر اور ابو ہریرہ رضؓ جھوٹ بولا کرتے تھے یا ابوحنیفہ۔ شافعی۔ مالک۔ احمد رحمہم اللہ جھوٹے لوگ تھے؟ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ جھوٹا تو خدا کی لعنت کا مستحق ہوکر یہ عزت نہیں پاسکتا۔ جو انہیں چاردانگ عالم میں حاصل ہے۔ کیا اگر ان حضرات میں سے کوئی شخص آج زندہ ہوکر یہ کہے کہ فلاں حدیث ہم کو نہایت صحیح طریق پر جناب رسول مقبول علیہ السلام سے یوں پہنچی ہے تو کیا کوئی کہہ سکیگا کہ نہیں حضرت آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ حاشا و کلا۔ بلکہ ان لوگوں کی صداقت کا اعلام دنیا میں اسقدر رسا۔ و خطبہ مسلم ہو چکا ہے کہ ایک آن کے لیئے بھی کوئی شخص ایسا سوءظن ان کی نسبت پیدا نہیں کرسکتا۔ اور اگر سوءظن کو اتنا ہی وسیع کرنا چاہتے ہو تو ان لوگوں

پتہ دو۔ جن کی نسبت ہمیں سوء ظن پیدا نہ ہو۔ ان حضرت نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا ... نہ کوئی ماخذ شرعی انہوں نے اپنی جگہ قرار دے لیا ہے۔ گو بہ خیال ہر ایک حالت میں صحیح ہے کہ ہر ایک مجتہد یا ہر ایک محدث یا ہر ایک فقیہ اپنے اجتہاد میں غلطی کر سکتا ہے مگر وہ عمداً جھوٹ نہیں کہہ سکتا ؎

ہم اپنے ناظرین پر یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ جن احادیث کو محدثین نے قابل حجت سمجھا ہے وہ صرف وہی احادیث ہیں جو صحیح کہلاتی ہیں۔ ہاں صحیح کے کئی ایک اقسام ہیں بلحاظ قوت وضعف کے متفاوت ہیں۔ مگر اس امر کو ہرگز جائز نہیں رکھا گیا کہ حدیث ضعیف اور بالخصوص ایسی حدیث کو جس کے موضوع ہونے کا یقین ہو چکا ہو کوئی شخص معرض استدلال میں پیش کرے۔ حافظ سیوطی اپنی کتاب تدریب الراوی جو علم اصول حدیث کی ایک معتبر کتاب ہے لکھتے ہیں:۔

النوع الحادی والعشرون الموضوع هو الکذب المختلق المصنوع وهو شر الضعیف وتحرم روایته مع العلم به ای بوضعه فی ای معنی کان سواء الاحکام والقصص والترغیب وغیرها الا مبینا ای مقرونا ببیان وضعه لحدیث مسلم من حدث عنی بحدیث یری انه کذب فهو احد الکاذبین۔ یعنی اکیسویں قسم حدیث موضوع ہے اور وہ کذب کا نام ہے جو خود ساختہ اور من گھڑت ہوتا ہے اور ضعیف حدیث میں اس کو نہایت قبیح سمجھا گیا ہے اور اس کا روایت کرنا حرام ہے جبکہ راوی کو اس کے مصنوع ہونے کا علم ہو اور کسی امر کے استدلال میں اس کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ وہ کوئی امر شرعی ہو یا کوئی واقعہ ہو یا کوئی ترغیب و ترہیب کا موقع ہو۔ ہاں اس وقت اس کو بیان کیا جا سکتا ہے جبکہ لوگوں پر اس کا موضوع ہونا بیان کرنا مدنظر ہو اور ایسی حدیث کی حرمت روایت حدیث مسلم سے ثابت ہے جیسا اوپر مذکور ہو چکی۔ اسی طرح حافظ عراقی الفیۃ الحدیث میں لکھتے ہیں ؎

شر الضعیف الخبر الموضوع — الکذب المختلق المصنوع
وکیف کان لم یجیز واذکرہ — من علم ما لم تبین امرہ

اس کا حاصل بھی بعینہ وہی ہے جو مذکورہ بالا عبارت حافظ سیوطی کا ہے۔ حافظ سخاوی اس کی شرح میں لکھتے ہیں وکفی بھذہ الجملۃ وعیدا شدیدا فی حق من روی الحدیث وھو یظن انہ کذب فضلا عن ان یتحقق ذلک ولا یبینہ لانہ صلی اللہ علیہ وسلم جعل المحدث بذلک شریکا لکاذب فی وضعہ۔ یعنی یہ جملہ حدیث مسلم اس شخص کے لئے جو کہ اس جھوٹی حدیث کو روایت کرے کافی وعید ہے چہ جائیکہ اس کو ثابت کرے اور اس کے موضوع ہونے کا بیان نہ کرے کیونکہ جناب پیغمبر علیہ السلام نے ایسے راوی کو حدیث کے واضع کے ساتھ شریک کذب فرمایا ہے ÷

اور سفیان ثوری حبیب بن ابی ثابت سے راوی ہیں من روی الکذب فھو الکذاب یعنی جو شخص کسی جھوٹ بات کو روایت کرتا ہے وہ بڑے درجہ کا جھوٹا ہے ÷

خطیب بغدادی لکھتے ہیں یجب علی المحدث ان لا یروی شیئا من الاخبار المصنوعۃ والاحادیث الباطلۃ الموضوعۃ فمن فعل ذلک باء بالاثم المبین ودخل فی جملۃ الکذابین یعنی محدث پر واجب ہے کہ خود ساختہ اور جھوٹی حدیثوں کو روایت نہ کرے جو شخص ایسا کرے وہ اپنے گنہگار ہونے کا خود اقرار کرتا ہے اور جھوٹوں میں داخل سمجھا جائیگا ÷

اور امام بخاری حدیث موضوع کے ذیل میں لکھتے ہیں من حدث بھذا استوجب الضرب الشدید والحبس الطویل یعنی جو شخص موضوع حدیث کی روایت کرتا ہے وہ ضرب شدید اور زندان کا مستوجب ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں لکن محل ھذا ما لم یبین ذلک امرہ کان یقول ھذا کذب او باطل او نحوھما من الصریح فی ذلک یعنی مذکورہ بالا سزا کا وجوب وہاں عائد ہوگا جہاں راوی حدیث اس حدیث کی اصلیت کو بیان نہ کرے

مثلاً بالصراحت یہ نہ کہے کہ یہ حدیث جھوٹ ہے یا باطل ÷

محدث ابن حجر کتاب زواجر میں امام شافعیؒ سے ناقل ہیں ومن الکذب الکذب الخفی وھو ان یروی الانسان خبراً عمن لا یعرف صدقہ من کذبہ یعنی جھوٹ کے اقسام میں سے ایک جھوٹ خفی بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کسی ایسے شخص سے روایت کرے جسکے صدق وکذب کا اسے علم نہیں۔ صیرفی اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اسکی مثال بعینہٖ ریاکی سی ہے جو شرک خفی کا حکم رکھتا ہے ÷

الغرض ہم کہاں تک عبارات کو نقل کیے جائیں۔ جا بجا آئمہ اہل حدیث نے احادیث موضوعہ کی روایت کی سخت ممانعت کی ہے اور وہ سب کے سب جناب پیغمبرؐ کے فرمان واجب الاذعان سے اس ممانعت کو بنص صریح پیش کرتے ہیں۔ پھر کس شخص کی مجال ہے کہ باوجود کتاب اللہ اور سنت رسول علیہ السلام کے پورا علم رکھنے کے کوئی ایسی بات اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف نسبت کرے جو انہوں نے نہیں کہی۔ میرے خیال میں ایسا شخص واجب التعذیر ہے جو جھوٹ موٹ شریعت حقہ میں الہی بات کو داخل کرتا ہے یہ ایک ایسا فتنۂ عظیم ہے جس پر کسی معمولی ایماندار کو بھی جرأت نہیں ہوسکتی چہ جائیکہ حضرات صحابہؓ اور تابعینؒ اور دیگر آئمہ مجتہدین جن کی نسبت عمداً جھوٹ بولنے کا گمان تک بھی نہیں ہوسکتا۔ مگر حق یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے شقاوت سر پر سوار ہوجانے تو کسی بھلے مانس کو ایسی ہی باتیں سوجھا کرتی ہیں کہ وہ بزرگانِ دین کو طرح طرح کی تہمتوں سے بدنام کرنا شروع کرتا ہے اور عوام الناس کو ان کے اتباع سے روکتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ خود ہی خائب وخاسر ہوکر خدا کے عذاب کا مستوجب قرار پاتا ہے

وما قلت واعظاً فی ھذا المقام :۔

الایا من تصدی للخصام ÷ الیک فلا تبالغ فی الکلام[1]

[1] اے فلاں جس کا کام جھگڑا ہے چل ہٹ۔ زیادہ گفتگو مت کرو ÷

فکم من عابث بالحق ذوۡرًا ؁ ٭ وباطلہ علی الھدی مرام

تکذب عصبۃ الاخیار ظرًا ؁ ٭ وھم خیر الوری اعلی المقام

فکیف تطیق امرًا لم یرمہ ؁ ٭ اُولوا الالباب قبلک فی المنام

تکذب بالحدیث تقول فیہ ؁ ٭ بما یزری بقاطنۃ الکرام

اتنکر قول من یھدی الحق ٭ بنور الوحی ضد الظلام

فھذا لیس من عادات قوم ؁ ٭ مضوا اسلفًا براء من ملام

وسوء الظن لا یجدیک شیئًا ؁ ٭ فتب قبل الممات الی السلام

فرب العرش ذو بطش شدید ؁ ٭ ستبلی کل نفس بالاثام

صلٰوۃ اللہ قرنًا بعد قرن ؁ ٭ علی جرثومۃ المجد الھمام

(ق)

نبی اللہ من عاداہ جھلًا ؁ ٭ فقد عادی ملیکًا ذا انتقام

صاحبو! ہمارا زمانہ درحقیقت نہایت ابتلا اور امتحان کا زمانہ ہے۔ جابجا شورہ پشتی اور مذہبی آزادی کے آثار نمودار ہو رہے ہیں اور مدعیان کاذب لوگوں کو دین کے لباس میں آکر عجیب عجیب طریق پر صراط مستقیم شریعت سے ہٹا رہے ہیں۔ ہر ایک جاہل

؁ اکثر لوگ حق کو بگاڑنا چاہتے ہیں حالانکہ ان کا باطل طریق ایک خوفناک مقصد پر مبنی ہوتا ہے۔ ؁ تو تمام سلف صالحین کی جماعت کی تکذیب کرتا ہے حالانکہ وہ بہترین خلق اور عالی پایہ کے لوگ تھے ؁ تو ایسے امر پر کیسے قدرت پائے گا جس کا خیال کسی عقلمند کو خواب میں بھی نہیں آیا (۵) تو حدیث رسول اللہ صلعم کی تکذیب کرتا ہے اور ایک ایسی بات کہتا ہے جو تمام اکابر کے لئے موجب عیب ہے (۶) کیا ایسے شخص کے اقوال سے جو نور وحی کے ساتھ ظلمت کفر و شرک سے نکال کر لوگوں کو حقیقی منزل کی طرف ہدایت کرتا تھا تو انکار کرتا ہے؟ ؁ یہ تو ان شریف لوگوں کی عادات سے بعید ہے جو اس دنیا سے نہایت عزت کے ساتھ نیکنام ہو کر رخصت ہوئے ؁ تجھے بدظنی کچھ مفید نہیں ہوگی سو تو مرنے سے پہلے اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع کر (۹) کیونکہ وہ زبردست خدا سخت غضب والا ہے اور عنقریب ہر شخص اپنی اپنی برائیوں کی پاداش میں مبتلا ہوگا ؁ سالہا سال تک اللہ تعالےٰ کی رحمت نازل ہو اس شریف الاصل بلند ہمت (۱۱) یعنی رسول اللہ صلعم پر کہ جہالت سے جو شخص آپ کا دشمن ہوا وہ درحقیقت خدائے تعالےٰ کا دشمن ہو گیا جو صاحب انتقام ہے ۱۲ منہ

بازاری جس کو نہ علم ہے نہ عمل اور جس کا مقصد بجز دنیا کمانے کے اور کچھ نہیں۔ رہنما اور محقق اور امام بن رہا ہے۔ دہریت۔ نیچریت۔ میرزائیت۔ چکڑالویت وغیرہ مذاہب باطلہ کو آپ نہایت غور سے دیکھیں گے تو ان سب میں اس امر کو قدر مشترک پائیں گے کہ بزرگانِ سلف کی ہتک عزت اور توہین کی جائے اور ان کے طریق کو بُرا نا اور رمردہ اسلام کہہ کر لوگوں کو بدظن کیا جائے اور زندقہ اور الحاد کی طرف توجہ دلائی جائے۔ چنانچہ بعض لوگ دعاوی باطلہ میں اس قدر دُور نکل گئے ہیں کہ اب کوئی مرحلہ کسی دعویٰ کا باقی نہیں رہا۔ خدا ہے کہ غریب اور بے کس مسلمانوں کو اس طوفان بے تمیزی سے نجات دے۔ ورنہ بظاہر نہایت مشکلات کا سامنا نظر آرہا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ امور دنیا میں اس حد تک کہ منافی شریعت نہ ہوں جس طرح چاہیں زمانہ کا ساتھ دیں اور اسباب ترقی میں ہمہ تن ساعی رہیں مگر خدا کے لئے دین کے معاملہ میں بھیڑ چال نہ اختیار کریں۔ کیونکہ دین کا معاملہ نہایت نازک ہے اور وہی حق ہے جس پر قرون اولیٰ کے لوگ قائم تھے اور جو جمہور علمائے اسلام میں اب تک موجود ہے ؎

نور است سرآب دریں بادیہ ہشدار ۔۔۔ تاغولِ بیابان نفریبد بسرابت

باب یازدہم

الحقوق

بنی نوع انسان کے علاوہ دیگر جاندار مخلوقات پر بھی رحمدلی سے سلوک کرنا عین منشاء اسلام ہے

جس شخص نے قرآن مجید کی تعلیم میں غور و خوض کیا ہو گا۔ وہ یقیناً جانتا ہوگا کہ شریعت سب کی سب آداب اور حقوق کی تعلیم پر مشتمل ہے۔ پس جو شخص آداب

حقوق اسلامی سے واقفیت نہیں رکھتا وہ کمال ایمان کے معنی سمجھنے سے بھی عاری ہے - ایمان کی تکمیل آداب اور حقوق کی بجا آوری سے ہوتی ہے - حفظ مراتب اسلام کی پہلی تعلیم ہے ؎

ایک حدیث میں وارد ہوا لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا یعنی جو شخص چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی تعظیم نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے اور ایک دوسری حدیث میں دین کی حقیقت کو یوں ارشاد فرمایا التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی خلق اللہ یعنی دین اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعظیم اور خلق خدا پر شفقت کرنے کا نام ہے - اس حدیث میں لفظ خلق اللہ کے مفہوم میں ہر ایک قسم کی مخلوقات شامل ہے کسی مذہب کی کوئی تخصیص نہیں - اس کی تائید میں ایک اور حدیث میں یوں وارد ہوا ہے ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء یعنی تم زمین والوں پر رحم کرو - خدائے برتر تم پر رحم کریگا - اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ہر ایک قسم کی مخلوق خدا کے ساتھ شفقت و رحمت سے پیش آنیکی تعلیم دیتا ہے ذیل میں چند ایک حقوق ضروریہ کا ذکر کیا جاتا ہے - جن کا جاننا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے؎

حقوق عامۂ مسلمین

قرآن مجید کے الفاظ انما المؤمنون اخوۃ سے جو تعلیم مدنظر ہے وہ اسقدر وسیع اور جامع ہے جس کو کسی دوسرے الفاظ میں بدیں اختصار پیش کرنا ناممکن ہے - تمام اہل ایمان کو اخوت کے ایسے مضبوط سلسلہ میں جکڑا گیا ہے - جس میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دیگئی - یہ رابطۂ اخوت ہر ایک اہل ایمان پر کئی ایک قسم کے حقوق عائد کرتا ہے - جن کی نگہداشت فرض شرعی ہے چنانچہ واجب ہے کہ ہر ایک ایماندار جب اپنے کسی بھائی مسلمان سے ملاقات کرے تو خواہ سابقہ تعارف یا تعلق ان ہردو میں قائم ہو یا نہ ہو السلام علیکم کہے - اور دوسروں کو چاہیئے کہ اس کا جواب دیں اور جس جلب منفعت یا دفع مضرت کو اپنے لئے چاہیئے وہی اپنے دوسرے مسلمان

بھائی کے لیئے بھی چاہئے اور اپنی طرف سے کسی کو زبان یا ہاتھ سے اذیت نہ پہنچائے کیونکہ کامل مسلم کا نشان ایک حدیث میں یہی بتایا گیا ہے اور نہ کسی کی بُری بات کو دوسروں تک پہونچائے - کیونکہ یہ چغلی ہے - اور چغلی کھانے والے کی نسبت وارد ہوا ہے کہ وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا - اور اگر کسی مسلمان بھائی سے ناراض ہو تو تین دن سے زیادہ فی مابین رنجش نہ رہنے دے - اور احسان و مروّت کرتے وقت اپنے اور بیگانے میں امتیاز نہ کرے اور یہ ایک بڑا بھاری وصف ہے اور اگر کسی دوست کے مکان پر اُس کی ملاقات کو جائے تو اجازت لیکر اندر داخل ہو - اگر اجازت حاصل ہو تو اس کے گھر میں داخل ہو ورنہ واپس چلا آئے - اور ہر ایک شخص کے ساتھ حسن اخلاق کے ساتھ پیش آئے اور اپنے کلام میں لطف و مدارات کو ملحوظ رکھے - آیۂ قولوا للناس حسنا کے یہی معنی ہیں اور کشادہ روئی اور خندہ پیشانی سے ملاقات کرنا حُسن اخلاق کا پہلا مرحلہ ہے اور اپنے وعدے کا ایفا کرے - اس کے علاوہ کسی مسلمان کے جنازہ میں شامل ہونا یا اس کا کسی امر جائز میں کسی دوسرے مسلمان کی امداد کرنا اور دو مسلمان بھائیوں میں مصالحت کرا دینا اور بیمار پُرسی کرنا اور کسی امر جائز میں اسکو صحیح راہنمائی کرنا اور کسی کے عیوب پر پردہ پوشی کرنا اور یتیم رانڈ مسکین اور دیگر اہل حاجت کی خبر گیری اور اعانت کا حتی الوسع متکفل ہونا اور کسی مصیبت زدہ یا مظلوم کی اعانت کرنا اور زیارت قبورِ مسلمین اور ان کے حق میں دعائے مغفرت اور عبرت حاصل کرنا وغیر ذالک سب کے سب حقوق عامہ مسلمین میں داخل ہیں ؎

افسوس کہ مسلمانوں میں اکثر ایسے نفوس بھی نظر آتے ہیں جو اپنی وجاہت دنیوی کو مدنظر رکھ کر مذکورہ بالا حقوق کی نگہداشت اپنے لئے موجب عار و ننگ خیال کرتے ہیں - مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ وہ غرور و نخوت ہے جس سے دوسروں کے دلوں میں مبغوض سمجھا جاتا ہے - ایک حدیث میں وارد ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی خاطر فروتنی کرتا ہے خدا اُسے اور بھی بلند

کرتا ہے مگر حکومت کی کرسی پر بیٹھنے والوں کو یہ بات کیوں نصیب ہونے لگی؟

حقوق الجوار قبل از اسلام حق جوار اہل عرب میں بدرجہ غایت ملحوظ تھا۔ اخبار عرب اور ان کے دواوین اشعار اس امر پر ناطق ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

وما ضرنا انا قلیل وجارنا ؛ عزیز وجار الاکثرین ذلیل

یعنی ہمارا شمار میں کم ہونا ہمیں کچھ مضر نہیں۔ جبکہ ہمارا ہمسایہ ہماری حمایت میں باعزت زندگی بسر کرتا ہے۔ حالانکہ بعض دوسرے لوگوں کے ہمسایہ ذلیل سمجھے جاتے ہیں ؛

شریعت اسلام نے اس حق جوار کی عزت کو ملحوظ رکھنے کی بہت تاکید کی ہے اخوت اسلام کے علاوہ شریعت اسلام نے اس حق کی نگہداشت کا تاکیدی حکم صادر فرمایا۔ ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے ۔ الجیران ثلاثۃ۔ جار له حق واحد وجار له حقان وجار له ثلاثۃ حقوق فالجار الذی له ثلاثۃ حقوق الجار المسلم ذوالرحم فله حق الجوار وحق الاسلام وحق الرحم واما الذی له حقان فالجار المسلم له حق الجوار وحق الاسلام واما الذی له حق واحد فالجار المشرک له حق الجوار۔ یعنی ہمسایہ تین قسم کے ہیں۔ اول جسکا صرف ایک حق ہے۔ دوم جس کو دو حق حاصل ہیں۔ سوم جس کو تین حق حاصل ہیں۔ تین حق والا ہمسایہ مسلمان رشتہ دار ہمسایہ ہے اور دو حق والا مسلمان ہمسایہ ہے اور ایک حق والا ہمسایہ ہمسایۂ مشرک ہے غور کرو کہ ہمسایہ مشرک کو بھی حق جوار سے محروم نہیں چھوڑ گیا سو مسلمان ہمسایہ بالخصوص رشتہ دار مسلمان ہمسایہ کا کس قدر حق ہونا چاہئے۔ اور ایک دوسری حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حق ہمسائیگت کو اچھی طرح بجالاؤ صحیح مسلمان بن سکو گے۔ پھر ایک دوسری جگہ فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام مجھے ہمیشہ حق جوار کی وصیت فرمایا کئے۔ حتیٰ کہ مجھے یہ خیال پیدا ہو گیا کہ وہ ہمسایہ کو وراثت میں بھی شریک کرنے کی وصیت فرمائینگے

اور پھر فرمایا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے والے کو چاہئیے کہ اپنے ہمسایہ کی عزت کرے اور پھر فرمایا کہ آدمی صحیح الایمان نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس کا ہمسایہ اس کے شر سے نہ بچ سکے۔ سلف صالحین میں اس حق جوار کے متعلق ایک روایت میں یوں آیا ہے کہ ایک صاحب کے گھر میں بہت سے چوہے پیدا ہو گئے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ گھر میں ایک بلی رکھ لو چوہے بھاگ جائینگے۔ اس نے جواب دیا کہ اگر میں ایسا کروں تو چوہے بلی کی آواز سنکر میرے کسی ہمسایہ کے گھر میں پناہ لینگے اور اس صورت میں مومن کی اس وصف سے محروم رہ جاؤنگا جس کو حضور علیہ السلام نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی شخص خالص ایمان نہیں پا سکتا۔ جب تک اپنے بھائی کیلئے وہ بات نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے آیہ الجار الجنب والصاحب بالجنب کی تفصیل میں بعض علماء نے لکھا ہے کہ حق جوار کی حفاظت اس طرح پر کرے کہ انکو اپنی خوشی میں شریک کرے اور مصیبت میں انکا ہمدرد ہو اور انکے اندرونی حالات کی نسبت ٹوہ نہ لگائے اور انکے عیوب نہ تو افشا کرے اور نہ انکے مستورات کی طرف نظر کرے اور قول وفعل میں اسے کسی قسم کی تکلیف نہ دے۔ الغرض کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو ہمسایہ کے لئے موجب اذیت ہو یا اس کے لئے بارِ خاطر ثابت ہو اور ایک حدیث میں جو عمرو بن شعیب کی روایت سے مروی ہے حق جار کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔ کیا تم ہمسایہ کا حق جانتے ہو؟ اس کا حق یہ ہے کہ اگر تجھ سے کسی قسم کی مدد مانگے تو اسے مدد دے اور اگر قرض طلب کرے تو اسے قرضہ دے۔ اور اگر وہ محتاج ہو جائے تو تو اس کی خبر گیری کرے۔ اور بیمار ہو تو عیادت کرے اور اگر مر جائے تو جنازہ میں شامل ہو اور اگر اس کے ہاں کوئی خوشی کا موقع ہو تو تو اسے تہنیت کہے اور اگر کوئی اسے مصیبت پہنچے تو تعزیت کرے اور اپنے مکان کو اس کے مکان سے اونچا نہ بنائے جس سے اس کے گھر میں ہوا نہ پہنچ سکے اور اسے اذیت نہ دے۔ اور اگر تو اپنے گھر میں میوہ یا پھل لائے تو اسے بھی شریک کر

اور اگر تو ایسا نہ کرسکے تو پھل اپنے گھر میں پوشیدہ طور پر لائے اور اپنے بچہ کو پھل دیکر اُسکے بچّہ کو حسرت زدہ نہ کرے اور کسی کھانے کی بو اُس کے گھر تک نہ پہنچنے دے۔ ورنہ اُس کھانے میں اسے بھی شریک کر۔ کیا تم ہمسایہ کا حق جانتے ہو؟ بخدا کہ حق ہمسایہ کو وہی شخص ادا کرتا ہے۔ جو خدا کی رحمت کا مستحق ہو ٭

مجاہد فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمرؓ کے ہاں موجود تھا۔ اور ان کا ایک غلام بکری کی کھال اُتار رہا تھا۔ غلام کو حکم دیا کہ جب کھال اُتار چکو تو پہلے ہمسایہ کو جو ایک یہودی شخص تھا یہ گوشت بھیجدو اور یہ بات وہ بار بار فرماتے رہے۔ تو اس نے کہا کہ آپ کب تک بار بار فرماتے رہینگے تو اُنہوں نے فرمایا کہ حضورؐ ہمیں بار بار حق ہمسایہ کی وصیّت فرمایا کرتے۔ تا آنکہ ہمیں یہ خیال پیدا ہوُا کہ وہ ہمسایہ کو مال اور وراثت میں بھی شریک فرما دینگے۔ اور حسنؓ یہودی یا نصرانی ہمسایہ کو قربانی کا گوشت دینے میں کوئی حرج نہیں خیال کرتے تھے۔ ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کا مجھے ارشاد تھا کہ ہنڈیا پکاتے وقت شوربا زیادہ کر دیا کرو اور اپنے ہمسایہ کے گھر میں بھیجدیا کرو ٭

افسوس کہ آجکل مسلمانوں میں حق جوار کی نگہداشت نہیں کی جاتی بلکہ بسا اوقات سخت عداوت ہوتی ہے ٭

حقوق ذوی القربیٰ

ذوی القربیٰ یعنی رشتہ داروں کے حقوق کا ذکر آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں بتاکید تمام وارد ہوُا ہے۔ شریعت اسلام نے کوئی حکم ایسا عائد نہیں کیا کہ جس میں تمدّنی بمعاشرتی حقوق کو ملحوظ نہ رکھا ہو۔ تمدّن و معاشرت کی بنا دفع مضرت اور جلب منفعت پر قائم کی گئی ہے۔ اس لئے جس قدر ان ہر دو امر میں امداد اور استمداد کا زیادہ سلسلہ مستحکم ہوگا۔ اسیقدر تمدّن و معاشرت کے لوازم نہایت مضبوط ہونگے۔ عامۃ المسلمین کے حقوق کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ذوالقربیٰ کے ساتھ ان کے حقوق کے علاوہ دیگر زاید حقوق کی نگہداشت کا حکم بھی صادر ہوُا ہے

ان حقوق کی نگہداشت کا نام صلہ رحمی ہے یعنی تعلّقات رشتہ داری کو قائم رکھنا +
ایک حدیث میں وارد ہُوا ہے کہ اللہ تبارک وتعالے فرماتا ہے ۔کہ میرے اسم
رحمان اور رحیم کا ایک ہی مادہ ہے سو جو شخص صلہ رحم کو ملحوظ رکھیگا وہ میرے ساتھ اپنے
تعلّقات کو قائم رکھیگا اور جو شخص ان تعلقات کو قطع کر دیگا وہ مجھ سے بھی منقطع ہو جائیگا
پھر فرمایا کہ جو شخص اِس بات سے خوش ہونا چاہتا ہے کہ اُسکی یادگار دیر تک قائم رہے
اور اس کو فراخ روزی ملے تو اسے چاہئیے کہ وہ تعلّقات صلہ رحمی کو قائم رکھے ۔ اور دوسری
جگہ جبکہ آپ سے پوچھا گیا کہ افضل الناس کون شخص ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جو زیادہ
پرہیزگار ہو اور صلہ رحم کو زیادہ ملحوظ رکھے اور لوگوں کو امر معروف اور نہی عن المنکر زیادہ
کیا کرے ۔ پھر دوسری جگہ فرمایا کہ رحم عرش کے ساتھ لٹکا یا گیا ہے ۔ اور تعلّقات رحم کا
قائم رکھنے والا پورے طور پر تلافی مافات نہیں کرتا ۔ ہاں وہ شخص ایسا کرسکتا ہے ۔کہ
اگر تعلّقات رحم منقطع ہو گئے ہوں تو اُنہیں پھر قائم کرے ۔ اور نیز فرمایا کہ جس عبادت کا
سب سے جلدی ثواب ملتا ہے وہ صلہ رحم ہے ۔چنانچہ کسی خاندان کا صلہ رحم سے مال و
دولت بڑھتا ہے اور انکے شمار میں ترقی ہوتی ہے ۔ اسماء بنت ابو بکر فرماتی ہیں کہ میری
مشرکہ ماں میرے پاس آئی ۔ مینے حضور سے دریافت کیا کہ میں اسکے ساتھ صلہ رحم کروں
فرمایا ہاں ۔ اور ایک حدیث میں یوں وارد ہُوا ہے کہ مساکین کو صدقہ دینا ایک صدقہ ہے
اور اپنے رشتہ دار کو صدقہ دینا دو صدقہ کا حکم رکھتا ہے ۔جب ابو طلحہ رضؓ نے اپنے ایک
باغ کو صدقہ کرنا چاہا جو انہیں بہت ہی مرغوب خاطر تھا تو آپ نے حضور علیہ السّلام سے
دریافت کیا کہ میں فقرا اور مساکین پر اسے صدقہ کر دوں حضور نے ارشاد فرمایا کہ بہترین صدقہ
وہ ہے جو اپنے قریبی رشتہ دار پر جو دشمنی رکھتا ہو صرف کیا جائے ۔ اور یہ درحقیقت ایک
دوسری حدیث کا مضمون ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ بہترین فضیلت انسان
کے لئے یہ ہے کہ وہ اس شخص سے ملے جو اس سے قطع تعلق کر چکا ہو اور اس شخص کو

دے جس نے اسے محروم رکھا ہو اور جس نے ظلم کیا ہو اس سے درگذر کر جائے حضرت عمرؓ نے اپنے عمال کو تاکیداً لکھا کہ رشتہ داروں کو باہم ملنے کا حکم دو اور یہ کہو کہ ایک دوسرے کے پڑوسی ہو کر نہ رہیں کیونکہ پڑوسی ہو کر رہنے سے حقوق کی پوری نگہداشت نہیں ہو سکتی اور قطع رحم کا موجب ہوتا ہے ؁

حقوق والدین

حقوق والدین کی نسبت اس سے زیادہ اور کیا لکھا جا سکتا ہے کہ تمام کتب سماویہ میں ان حقوق کی نگہداشت کی سخت تاکید آئی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں اللہ تعالےٰ نے اپنے حق کا ذکر کیا ہے۔ اسکے ساتھ ہی بلا فاصلہ والدین کے حقوق کا ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا و قضیٰ ربک الا تعبدوا الا ایاہ و بالوالدین احسانا ؁

گذشتہ تمام حقوق سے بڑھکر جس حق کا ادا کرنا ہر ایک انسان کا فرض ہے وہ حق والدین ہے۔ والدین سے بڑھکر دنیا میں کوئی شخص محسن نہیں ہو سکتا جو تربیت اولاد کے لئے اپنے مال و جان سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اور اگر ان کے بس میں ہو تو اپنی عمر بھی اولاد کو دیدیں۔ پس ایسے محسن کا شکریہ تمام بنی نوع انسان کے حقوق سے کہیں بہت زیادہ سمجھا گیا ہے۔ خالق حقیقی تو حقیقی محسن ہے اور مخلوق میں سے والدین کے احسانات کا مقابلہ کوئی اور محسن نہیں کر سکتا۔ پس بحکم ھل جزاء الاحسان الا للاحسان اولاد کا فطری اور شرعی فرض ہے کہ والدین کے حق میں جسقدر بھی اولاد کو استطاعت ہو کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں۔ یعنی دل میں انکی عزت اور محبت اور زبان سے ادب و تعظیم کے کلمات اور اعضا سے انکی جسمانی خدمات اور زر و مال سے انکی امداد میں مطلقہ دریغ جائز نہ رکھیں۔ البتہ اگر والدین حکم خداوندی کی مخالفت پر آمادہ کریں تو انکار کر دیں چنانچہ حدیث میں وارد ہوا ہے لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق یعنی حکم خداوندی کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق

کی اطاعت نہیں کرنی چاہئے - ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے کہ والدین سے حسن سلوک اور نکوئی برتنا - نماز - صدقہ - روزہ اور حج اور عمرہ اور جہاد سے کہیں زیادہ فضیلت رکھتا ہے - اور ایک دوسری حدیث میں یوں وارد ہوا ہے کہ جو شخص ایسی حالت میں صبح کرے کہ وہ اپنے والدین کو مسرور رکھتے ہو تو اس کے لئے جنت کے دروازے کھولدئے جاتے ہیں - اسی طرح اگر وہ ایسی ہی حالت میں شام کرے تو یہی حکم ہے - اور اگر والدین میں سے کوئی ایک ہو تو ایک ہی دروازہ اس پر کھولا جاتا ہے - اگرچہ اس کے والدین اس پر ظلم کریں ظلم کریں ظلم کریں - اور جو شخص ایسی حالت میں صبح کرے کہ وہ اپنے والدین کو ناراض کئے ہو تو اس پر دوزخ کے دو دروازے کھولے جاتے ہیں - اسی طرح اگر وہ ایسی حالت میں شام کرے اور اگر والدین میں کوئی ایک ناراض ہو - اگرچہ وہ ظلم کریں ظلم کریں ظلم کریں اور ایک دوسری حدیث میں یوں ارشاد ہوا ہے کہ جنت کی بوئے خوش پانچسو سال کے راستے سے آنے لگیگی مگر والدین کے نافرمانبردار اور تعلّقات صلہ رحمی کو قطع کرنیوالے اس بو کو نہیں پا سکینگے - اور دوسرے موقعہ پر یوں ارشاد ہوا کہ اپنی ماں اور باپ اور بہن اور بھائی سے احسان اور نکوئی کرو - پھر انکے بعد جو درجہ بدرجہ اہل قرابت ہوں - اور ایک روایت میں یوں وارد ہوا ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام کو یوں وحی کیگئی کہ اے موسیٰ والدین سے جو شخص نکوئی کرتا ہے اور میری نافرمانبرداری تو میں اسے نیکو کار ہی لکھونگا - اور جو شخص مجھ سے نکوئی کرتا ہے اور والدین کا نافرمانبردار ہے تو میں اسے نافرمانبردار ہی لکھونگا - بعض آثار میں وارد ہے کہ جب یعقوب علیہ السّلام نے اپنے فرزند یوسف علیہ السّلام سے ملاقات کی تو حکم ہوا کہ اپنے باپ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جا اور ایک حدیث میں وارد ہے کہ والدین کی وفات کے بعد انکے حق میں نکوئی برتنے کی صورت یہ ہے کہ انکی نماز جنازہ ادا کرے اور انکے حق میں دعائے مغفرت کو لازم

سمجھے۔ اور انکی وصیت کو نافذ کرے۔ اور انکے احباب اور دوستوں کی عزت ملحوظ رکھے اور حق صلہ رحمی کا حکم بغیر والدین کے ساتھ نکوئی برتنے کے بجا لایا نہیں جا سکتا۔ اور ایک روایت میں یوں وارد ہوا ہے کہ ماں کے ساتھ نکوئی برتنا باپ کے ساتھ نکوئی برتنے سے دوچند ہے اور ایک دوسرے موقعہ پر فرمایا کہ ماں کی دعا اولاد کے حق میں دیگر سب دعاؤں کی نسبت بہت جلد مقبول ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماں اپنے فرزند پر سب سے زیادہ مہربان ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ علمائے محققین نے لکھا ہے کہ طبعی محبت صرف وہ محبت ہے جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جو تکلیف ماں اپنی اولاد کی تربیت میں اٹھاتی ہے وہ باپ کی تکلیف سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اس امر کا اشارہ آیا ہے۔ حیث قال اللہ تعالیٰ حملتہ کرھًا ووضعتہ کرھا ؀

افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ ہمارے اسلامی بچے مذکورہ بالا حقوق کی نگہداشت سے کوسوں دور پڑے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انہیں احکام شریعت سے بالکل بے بہرہ رکھا جاتا ہے۔ اور موجودہ نصاب تعلیم میں مغربی تمدن اور معاشرت کی جو تعلیم دیجاتی ہے اس سے بچوں کی طبیعت میں ایک قسم کی خودپسندی اور خود غرضی او خودرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے وہ جوان ہو کر سوء ادب اور سرکشی کے سوا اور کچھ نہیں سیکھتے بلکہ بسا اوقات اسلامی احکام شریعت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اکثر جہال احکام شریعت کو استہزا او مخول میں اڑا دیتے ہیں ؀

تربیت اولاد والدین کا ایک اہم فرض ہے۔ جو لوگ شروع ہی سے احکام شریعت کی پابندی سے اپنی اولاد کو ناواقف رکھتے ہیں انکی اولاد میں دنیا اور آخرت میں ان کے لئے کچھ مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔ مگر سچ یہ ہے کہ جو لوگ خود احکام شریعت کے پابند نہیں ہوتے وہ اولاد کو کیسے پابند کر سکتے ہیں ۵

میپرور درختے کہ خار آورد
بپرور درختے کہ بار آورد

حقوق معلم

منجملہ ان ضروری حقوق کے جنکا اوپر ذکر آچکا ہے حق معلم بھی ہے جنکی ضرورت پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ہر ایک شخص جانتا ہے کہ اگر والدین بچہ کی تربیت جسمانی کے متکفل ہیں تو معلم اس کی تربیت روحانی کا متکفل ہوتا ہے۔ اسی خیال پر بعض علما رنے لکھا ہے کہ جو فضیلت روح کو جسم پر حاصل ہے وہی اُستاد کو والدین پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے ابوك ثلثة من وَّلدك ومن ذوجك ومن علمك وخيرالا باء من علمك یعنی انسان کے تین باپ ہوتے ہیں۔ اوّل جس کے نطفے سے تو پیدا ہوا دوسرا جس نے اپنی بیٹی تجھے اپنی نکاح میں دی۔ تیسرا جس نے تجھے تعلیم دی۔ اور سب سے بہتر وہی ہے جس نے تجھے تعلیم دی۔ اور اس کی وجہ وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ حقوق معلم کے نگہداشت کی صورت یوں ہوسکتی ہے کہ دل میں اسکی عزت و تعظیم اور زبان سے حسن ادب اور دست و پا سے انکی خدمت کے لوازم کو بخوشی خاطر بجا لا یا جائے۔ اور ہدیہ وغیرہ سے دریغ جائز نہ رکھا جائے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔ هل جزاء الاحسان الّا الاحسان یعنی احسان کا مقابلہ احسان ہی ہوا کرتا ہے شاگرد کو لازم ہے کہ کبھی اپنے اساتذہ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرے بشرطیکہ خلاف شریعت نہ ہو۔ حضرت امیرالمؤمنین علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ من علّمنی حرفاً فقد صیّرنی عبداً۔ یعنی جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھلایا اُس نے مجھے اپنا غلام بنالیا۔ دیکھو قرآن شریف میں جہاں موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے تعلیم کی استدعا فرماتے ہیں۔ وہاں ساتھ ہی یہ بات بھی پیش کرتے ہیں لا اعصی لك امرا یعنی جب مجھے خدا تعالےٰ نے علم لدنّی سے کچھ بہرہ عطا فرمایے اور میرا فرض ہوگا کہ میں آپ کے کسی امر کی خلاف ورزی

نہ کروں ؂

حقیقت یہ ہے کہ ایسا معلم جو اپنے شاگرد کی تعلیم و تربیت اخلاق کا متعہد ہوتا ہے۔ اُس سے بڑھکر کوئی شخص قابلِ تعظیم نہیں ہو سکتا۔ اِسی بناء پر ہر ایک مسلمان جناب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اور دیگر آئمہ دین کی تعظیم و تکریم اور انکی محبّت کو اپنا جزو ایمان باور کرتے ہیں ورنہ دنیوی مفاد کے لحاظ سے کوئی جہت اس محبت و تعظیم کی علّت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ علم ہی ایک ایسی نعمتِ عظمٰے ہے جو انسان کے لئے دین و دنیا میں موجب صلاح و فلاح ہو سکتی ہے۔ اور یہ وہ نعمت ہے جسکا مقابلہ کوئی دوسری نعمت نہیں کر سکتی۔ اور جس کے نتائج حسنہ سے انسان بعداز مرگ بھی منقطع ہونے کی اُمید رکھتا ہے۔ علم سے ہماری مراد وہی ہے جو گزشتہ صفحات میں ہم لکھ آئے ہیں یعنی علم شریعت اور تربیت اخلاق حسنہ جس کے ضمن میں دیگر مبادی علوم بھی شامل ہیں۔ سلف صالحین کا قاعدہ تھا کہ وہ حضرات اساتذہ کی محبت و تعظیم قولاً و فعلاً بیش از بیش ملحوظ رکھا کرتے تھے۔ برخلاف ہمارے موجودہ زمانے کے جس میں عام طور پر شاگرد اپنے اُستاد کی کوئی عزت و وقعت نہیں سمجھتے اور جہاں شاگردی سے فراغت ہوئی ساتھ ہی علم سے بھی بکلی قطع تعلق ہو گیا۔ بلکہ سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتگان کو اکثر اپنے اساتذہ کی ہجو و مذمت کرتے سنا گیا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ سکولوں اور کالجوں کے اساتذہ بھی اس قابل نہیں ہوتے کہ اُن کے ساتھ ان کے حسن ادب کو ملحوظ رکھا جائے۔ کیونکہ وہ بھی شاگرد کے ساتھ شفقت اور حسن مراعات کا مطلقہ پاس نہیں رکھتے۔ شاگرد یہ سمجھتا ہے کہ یہ مزدور ہیں جو اُجرت پر کام کر رہے ہیں اور اساتذہ یہ خیال کرتے ہیں کہ مُردہ دوزخ جائے یا بہشت ملّاں کو حلوے مانڈے سے کام انشاءاللہ اور خیر صلّا۔ لیکن یہ سب کچھ اس مغربی تہذیب کا نتیجہ ہے۔ جس پر ہمارے تعلیم یافتہ لوگ دلدادہ اور مفتون ہو رہے ہیں۔ سلف صالحین کے

طریق تعلیم کا یہ دستور تھا کہ شاگرد کہیں وطن سے دور کسی قابل استاد کی شاگردی کا موقع پا لیتا تو ہمیشہ کے لئے اس کی شاگردی کو اپنا مایۂ فخر و ناز خیال کرتا اور حضرات اساتذہ بھی محض خالصاً لوجہ اللہ اسے تعلیم دیتے کوئی کسی قسم کا معاوضہ یا اجرت نہ لیا کرتے بلکہ وہ اس کو ایک دینی خدمت سمجھا کرتے اور شاگرد کی ہر ایک طرح نگرانی اپنا فرض سمجھتے بلکہ غیر منطیع شاگردوں کے ضروریات کی اپنی گرہ سے کفالت کرتے یہی وجہ ہے کہ معلم اور شاگرد کے درمیان ایک ایسا تعلق قائم ہو جاتا جو عمر بھر کبھی منقطع نہ ہوتا۔ والتوفیق من اللہ تعالےٰ ؛

حقوق زوجیت

صرف مذہب اسلام ہی میں یہ حکمت ملحوظ رکھی گئی ہے کہ جب مرد اور عورت کا تعلق انسان کی تمدنی اور معاشرتی اصلاح کے لئے ایک امر فطری خیال کیا گیا ہے۔ تو عقل انسانی ایک آن کے لئے بھی اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتی۔ کہ مرد اور عورت کے حقوق متبادل نہیں۔ یعنی جس طرح مرد عورت کی ذات پر تعلق نکاح کی صورت میں اپنے حقوق کی ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ اسی طرح عورت تعلق نکاح کی بنا پر مرد کے ذمہ اپنے حقوق عائد کرتی ہے جس شخص نے مختلف اقوام کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوگا۔ اسے معلوم ہوگا کہ قبل از اسلام کسی قوم میں عورت کی کبھی وہ عزت قائم نہیں ہوئی جو مذہب اسلام نے عملاً دنیائے اسلامی میں قائم کر دکھائی ؛

رومن امپائر کو قانون سے سخت مناسبت تھی۔ اور اس کا بنایا ہوا قانون آجتک یورپ کا سنگ بنیاد ہے۔ اسی قانون میں عورتوں کے یہ حقوق تھے ؛

عورت شادی کے بعد خاوند کی زر خرید جائداد ہو جاتی ہے ؛

اس کا تمام مال و متاع خواہ اس کا ہو خواہ کسی عطیہ یا اس کا کمایا ہوا ہو۔ وہ تمام شوہر کا ملک سمجھا جاتا ہے ؛

وہ کسی سے کوئی عہد نہیں کر سکتی تھی۔ اور نہ کسی کی ضامن ہو سکتی تھی ۔

وہ کسی وقت ادا ر شہادت کے قابل نہ تھی ۔

اس کو وصیّت کرنے کا بھی اختیار نہ تھا۔ ایک عرصہ تک تمام یورپ کا یہی قانون مگر جب رومن امپائر کا عیسائی مذہب ہوا تو قدرے اس کے اُصول بدلے۔ مگر چند ر کے بعد پھر وہی پُرانے اُصول قائم کر دئے گئے۔ ایک عرصہ تک ان مہذب عقل پتلوں کا یہ خیال تھا کہ عورت میں روح نہیں ہوتی۔ ۱۸۶۰ء کے بعد یورپ میں ای جلسہ ایسی بات کی تحقیق کے لئے قائم ہُوا کہ آیا عورتوں میں روح ہوتی ہے یا نہیں جس کی تحقیق سے یہ نتیجہ نکلا کہ عورت نیک نوع آدم میں داخل ہے اور اس کا پیدا کر مرد کی خدمت کے لئے ہے۔ ایک عرصہ تک ان میں یہی قانون رہا۔ اب جب سے ر ایکٹ بنا ہے پہلے قوانین میں کچھ ترمیم ہوگئی ہے۔ مگر اب تک بہت ہی غیر معقو باتیں اصلاح طلب باقی ہیں۔ رہے یہودی۔ انکے یہاں عورتوں کی مٹی ایسی ذلیل تھ کہ ادنیٰ سی بات پر عورتوں کا طلاق دیدینا کوئی بڑی بات نہ سمجھی جاتی تھی۔ مذہباً اگر کوئی پہلی عورت سے خوبصورت عورت ملجائے تو اپنی عورت کو طلاق دے کر اس سے شادی کر لینا جائز ہے۔ کھانے میں اگر خلاف معمول نمک بھی زیادہ ہو جا تو خاوند اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ نہ اس کا کوئی حصہ تھا اور نہ ترک سے کوئی تعلق۔ عیسائیوں کی طرح ان کے ہاں بھی عورت خاوند کی زرخرید لونڈ ہوا کرتی تھی۔ باپ بیٹی کی قیمت میں کچھ روپیہ لیکر داماد کے حوالہ کر دیا کرتا تھا ہندوؤں میں بھی اسی طرح بیوی۔ ماں۔ بیٹی کو ترکہ سے کچھ نہیں ملتا تھا۔ ا علاوہ اس کے ان کی کوئی عورت مالک جائداد اور حصہ دار ترکہ کسی صورت میں کسی رشتہ دار کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔ اگر ایک شخص فوت ہو جائے اور باوجود کے کہ اس کی لڑکیاں اور بیوی زندہ موجود ہوں اور کوئی لڑکا نہ ہو تو بھتیجے بیت

وارث جائداد ہونگے۔ اور ترکہ ماں۔ بیٹی۔ بیوی کو نہ پہنچے گا۔ صرف میت کی بیوی کا نان نفقہ اس کے بھتیجوں کے ذمہ ہوگا جو میت کے وارث جائداد ہونگے (دیکھو اصول دھرم شاستر مصنفہ میگناٹن صاحب) رہے عرب جاہلیت۔ انکے یہاں تو ایسا اندھیر تھا کہ عورت ایک ذلیل مملوکہ لونڈی سے بھی بدتر تھی۔ اوّل یہ کہ باپ کی بیوی یعنی سوتیلی ماں اُسکے لڑکے اور رشتہ داروں کا ایک ترکہ سمجھی جاتی تھی۔ سب سے پہلے اس کا بڑا لڑکا اس سے نکاح کرتا تھا۔ اگر وہ منظور نہ کرتا تو کوئی دوسرا لڑکا اس سے نکاح کر لیتا۔ یہاںتک کہ وہ بصورت اس کے انکار کے کسی رشتہ دار سے فوراً نکاح کردیتے تھے۔ اور کسی حالت میں نکاح اور عدم نکاح میں اس کی رائے کا اعتبار نہ ہوتا تھا بلکہ بیچاری محض مجبور ہوتی تھی۔ تاریخ کی کتابیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کی بی بی سے اس کے چار چار پانچ پانچ بیٹوں نے بتدریج نکاح کیا ہے۔

دختر کشی کو فخر سمجھتے تھے۔

ہندوؤں کی طرح ترکہ میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوتا تھا۔

ایک شخص جتنے چاہے نکاح کرسکتا تھا۔

حیض کے عرصہ میں یہ وحشی عورتوں سے لواطت کیا کرتے تھے۔ اور عورت محض مجبور ہوتی تھی ؛

باندی کے بطن سے جو اولاد ہوتی تھی وہ غلام سمجھی جاتی تھی۔ اور اُن کو میراث کا حصہ نہ ملتا تھا ؛

عورتوں کو جانوروں کا دودھ دینا بالکل ممنوع تھا

عورتیں لڑائی میں مردوں کے ساتھ ہوتی تھیں اور ان کو لڑائی میں لڑنے پر اُبھارتی تھیں۔

عورتوں کو طلاق دینے کے انکے یہاں تین طریقے تھے۔ اوّل ایک طلاق اور

اس کے دینے کا یہ طریق تھا کہ عدت کے وقت کے ختم ہوتے ہوتے پھر رجوع کر لیتے اور پھر طلاق دیدیتے تھے۔ جس سے عورت کو ستانا اور تنگ کرنا مقصود ہوتا تھا عورتوں سے زنا کرا کر خرچی لیتے تھے۔

دوسرا طریقہ طلاق کا یہ تھا کہ ایک سال اور دو سال عورت کے پاس جانے کی قسم کھا لیا کرتے تھے اور جب مدت پوری ہو جاتی تو وہ عورت مطلقہ سمجھی جاتی تھی۔ مگر اس عرصہ میں بھی عورت کو تکلیف پہونچاتے تھے۔

تیسرا طریقہ ان کے ہاں یہ مروّج تھا کہ کچھ روپیہ عورت سے لیکر خاوند چھوڑ دیتا تھا۔ باری باری سے لوگ عورتوں کے پاس جاتے تھے اور عورت جب حاملہ ہو جاتی اور اُس کی اولاد پیدا ہوتی تو جس کا وہ بچہ بتلاتی وہ لے لیا کرتا تھا۔

عورت کی عدت توڑنے کا طریقہ یہ تھا کہ کسی جانور کو پکڑ کر اپنے شرمگاہ پر ملتی تھی۔ اور جب وہ مرجاتا تو اس کی عدت ٹوٹ جاتی تھی اور عورت گھر سے باہر نکل آتی تھی۔ یا اونٹوں کی چند مینگنیاں ہاتھ میں لیکر نکل آتی تھی اور اپنی پیٹھ پر مارتی تھی۔ اور اس سے اُس کی عدت ٹوٹ جاتی تھی۔

جاہلیت کے زمانہ میں عورتوں کا شراب پینا ممنوع تھا۔ عورتوں کے لئے خوبصورتی کے واسطے اپنا بدن گودنا ضروری تھا اور اسی طرح بھوؤں کا باریک کرنا اور بال نوچنا اور دانتوں کا چھیدنا وغیرہ جس کے لئے اسلام نے منع کیا ہے۔

لڑائیوں میں عورتوں کو گرفتار کر لیتے تھے اور بڑی بے عزتی سے پیش آتے تھے اور قیمت لیکر واپس کر دیتے تھے۔

جب عورتیں لڑائی کی صفوں میں جا کر پیشاب کر دیتی تھیں تو فریقین لڑائی کو ختم کر دیتے تھے۔

ان کا یہ بھی خیال تھا کہ جب گھوڑے کو سوار کے نیچے پسینہ آجائے تو گویا اس کی

رت کا غیر سے ناجائز تعلق ہو گیا۔
بہادروں کے پاس عورتوں کو بھیجتے تھے تاکہ دلاور اولاد پیدا ہو غرض ایسے
اوہام باطلہ اور جہالت سے آئے دن ایسے گروہ بنی آدم کی انکے ہاتھوں مٹی پلید
ہوا کرتی تھی۔ اسلام نے آکر ان سب باتوں کو چھڑا دیا حقیقی اور اصلی تلقین فرمائی۔ اسلام
نے اوّل تو یہ تعلیم دی کہ عورت اور مرد انسانیت میں برابر ہیں ہاں مردوں کو ان پر ترجیح ہے للرجال
علیھن درجۃ دوسرے یہ فرمایا کہ رشتہ داروں کو میت کے ترکہ کا حسب رشتہ حق حاصل ہے
عورت اور مرد کی کوئی خصوصیت نہیں۔ اور فرمایا ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف
اور قتل اولاد سے اس حکم واجب الاذعان سے روکا واذا المؤدۃ سئلت بای ذنب
قتلت اور کہا کہ حسب فطرت مرد اور عورت برابر ہیں۔ لڑکوں کا پالنا اور لڑکیوں کا
مارنا درست نہیں اور بیویوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ اور مستحق سمجھنے کی اس طرح تعلیم دی
قال اللہ تعالیٰ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ
پھر واضح طور پر بتا دیا کہ ان کا ہر طرح سے تم پر حق ہے۔ ہر حیثیت سے تمہاری رفیق ہیں
قال اللہ تعالیٰ ھن لباس لکم وانتم لباس لھن وقال اللہ تعالیٰ لھن مثل الذی
علیھن بالمعروف۔ قرابت کے تعلقات کی تصریح فرما کر والدین کے حقوق
کو یوں بیان کیا۔ قال اللہ تعالیٰ وبالوالدین احسانا
اما یبلغن عندک الکبر احدھما او کلاھما فلا تقل لھما اف ولا تنھرھما وقل لھما قولا
کریما واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا
پھر ماں کے حق پر زور دیکر خداوند تعالیٰ فرماتا ہے حملتہ امہ کرھا ووضعتہ کرھا۔ پھر
اسلام نے یہ تعلیم دی کہ عورت کا مال عورت کا ہے اور مرد کا مرد کا اور مرد کو جبراً عورت
کا مال لینا درست نہیں قال اللہ تعالیٰ للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب
مما اکتسبن۔ قاعدہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کہ مہر جو جاہلیت میں لڑکی کا ہوتا وہ لڑکی کے باپ کو ملتا۔ اسلام نے آکر حکم دیا کہ مہر لڑکی کا حق ہے۔ لڑکی کو ہی ملنا چاہیئے قال اللہ تعالےٰ واٰتوا النساء صدقاتھن نحلۃ اور فرمایا کہ جو لوگ عورتوں سے بُرا سلوک کرتے ہیں خدا انسے ناراض ہوتا ہے۔ اور وہ اُصول حکمت اور قاعدہ ہمدردی کے خلاف کرتے ہیں اور حکم دیا کہ اپنی عورتوں سے عمدہ سلوک کیا کرو کما قال اللہ تعالیٰ وعاشروھن بالمعروف اور پھر اسلام نے یہ تعلیم دی کہ عورتیں شہوت نفس کے لئے نہیں ہیں بلکہ اسلئے ہیں کہ وہ گھر کا انتظام کریں اور خاوند کی معاش اور معاد کے حاصل کرنے میں معاون ہوں۔ اور خاوند پر فرض ہے کہ وہ بھی عورت کے ساتھ اخلاق سے پیش آئے اور ایسا برتاؤ کرے کہ باہم رابطہ اتحاد ٹوٹنے نہ پائے۔ اور فرمایا کہ اگر عورت ناراض ہو جائے تو اس سے بالکل انحراف نہ کرو بلکہ مصالحت برتو یا صبر کرو کیونکہ عورت کی اذیت پر صبر کرنا بھی موجب ثواب ہے وقال اللہ تعالےٰ فان کرھتموھن فعسیٰ ان تکرھوا شیئاً ویجعل اللہ فیہ خیراً کثیراً اور عورت کو بھی نصیحت کی کہ اگر خاوند ناراض ہو جائے تو اس سے صلح کرلے اور صلح ان کے لئے بہت بہتر ہے کما قال اللہ تعالیٰ وان امرأۃ خافت من بعلھا نشوزاً او اعراضاً فلا جناح علیھما ان یصلحا بینھما صلحاً والصلح خیر[1] - عرب میں یہ قاعدہ تھا کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کی بیوہ کو کسی دوسرے سے نکاح کرنے کی اجازت دیتے وقت کچھ روپیہ لے لیتا تھا اور عموماً جاہلیت کے عربوں کا یہ دستور تھا کہ عورت سے طلاق دینے کے بعد مجبور کرکے کچھ لیا کرتے تھے۔ ان باتوں کے متعلق اسلام نے یہ تعلیم دی لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھاً ولا تعضلوھن لتذھبوا ببعض ما اٰتیتموھن[2] پھر عورت کی بدخوئی منع کرنے کی یہ تجویز بتائی والتی تخافون نشوزھن

[1] اور اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے لڑنے سے یا پھر جانے سے ڈرے تو ان پر گناہ نہیں کہ آپس میں صلح کرلیں اور صلح ہی اچھی چیز ہے [2] اور تمہارے واسطے حلال نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن جاؤ۔ اور انہیں منع نہ کرو تاکہ تم اُس چیز کا کچھ حصہ لے لو جو تم نے انکو دیا ہے ۱۲ منہ

نشوزهن فعظوهن واهجروهن فی المضاجع واضربوهن فان اطعنکم فلا تبغوا علیهن سبیلا [۱]۔ اور پھر فرمایا اگر بدخوئی سے ناچاقی بڑھ جائیگی نوبت پہنچے تو انصاف کے لئے ایک پنچایت دونو طرف کے لوگوں کی مقرر کرو کما قال اللہ تعالیٰ وان خفتم شقاق بینهما فابعثوا حکما من اهله وحکما من اهلها [۲]۔ پھر یہ تعلیم دی کہ اگر اس پر بھی نہ بنے تو طلاق دیدو۔ اور ہدایت کی کہ تین ماہ میں بتدریج طلاق دو کہ شاید تم میں پھر صلح ہو جائے اور اپنے کیے پر نادم ہو اور طلاق کے بعد ان کو تکلیف نہ دو۔ بلکہ عمدہ سلوک سے پیش آؤ۔ قال اللہ تعالیٰ وبعولتهن احق بردهن فی ذلک ان ارادوا اصلاحا [۳]۔ اور یہی مصلحت تھی کہ اگر یکبارگی طلاق دینے کا حکم ہوتا تو طلاق دینا سہل ہو جاتا۔ لیکن پھر باہم دونو کو نادم ہونا پڑتا۔ اور طلاق پوری ہو جانے کے بعد بھی اس صورت میں کہ وہ غیر سے نکاح کرے اور وہ غیر اپنی خوشی سے اسے طلاق دیدے تو پہلا خاوند اس سے نکاح کر سکتا ہے اور اس سے بھی یہی مطلب ہے کہ ایسی عار انسان ذرا مشکل سے گوارا کر سکتا ہے۔ اس لئے اس ڈر کے مارے ابتدا سے کبھی انسان کو جرأت نہ ہوگی کما قال اللہ تعالیٰ فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره [۴]۔ اس کے بعد یہ تعلیم دی کہ یہ طلاق کوئی خانگی معاملہ نہیں بلکہ اسپر قوم کی شہادت لو اور عدت کے زمانے تک یعنی تین ماہ دس یوم تک اس کے نان نفقہ کے کفیل ہو۔ اگر عورت حاملہ ہو اور بچہ جنے اور تمہاری اولاد کی تربیت اپنے ذمے لے تو دو سال تک اس کی اجرت اس کو دو اور ہر طرح اس کے گھر میں رہنے اور رخصت کے وقت اس کے ساتھ عمدہ سلوک کرو۔ اور ہمدردی سے پیش آؤ اور باربار یہی

---

[۱] اور وہ عورتیں جنکی بدخوئی سے تم ڈرتے ہو انہیں نصیحت کرو اور انہیں خوابگاہ میں چھوڑ دو اور ان کو مارو پس اگر تمہارا کہنا مانیں تو انکے اوپر (الزام کی) راہ نہ ڈھونڈو [۲] اور اگر انکی خفا ہونے سے ڈرو تو ایک منصف اسکے خاندان سے اور ایک اسکے خاندان سے مقرر کرو اگر وہ درمیان صلح کرنا چاہیں [۳] اور انکے خاوند انکو پھیر لینے کے حقدار ہیں اگر وہ اپنے درمیان صلح کرنا چاہیں [۴] پس اگر اسکو طلاق دی تو اسکے لئے حلال نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اس خاوند کے سوا کسی اور سے نکاح نہ کرے [۵] پس جب وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو ان کو دستور کے موافق رکھو یا اچھی طرح یا ان کو چھوڑ دو اور دو صاحب عدل گواہ کو مقرر کرو اور گواہی کو درست کرو واسطے خدا کے ؁

ہدایت کی کہ طلاق دینے سے پہلے صلح کرانے کی کوشش کرو اور ہر حالت میں اس رحم کو مد
چاہیے۔ چونکہ حسب مصلحت یہ ایک امر ممنوع تھا اس لیئے اس کے واقع کرنے
بھی حکم ہے اور ان کا حق واجب دینے کی تاکید فرمائی قال اللہ تعالے واذا بلغن
اجلھن فامسکوھن بمعروف واشھدوا ذوی عدل منکم واقیموا الشھادۃ للہ
قال اللہ تعالے وللمطلقت متاعا بالمعروف حقا علی المتقین وقال اللہ تعالے
ولا تمسکوھن ضرارا لتعتدوا ومن یفعل ذلک فقد ظلم نفسہ وقال
اللہ تعالیٰ والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم
الرضاعۃ و علی المولود لہ رزقھن وکسوتھن بالمعروف ٭

اکثر لوگوں کا قاعدہ تھا کہ نکاح کے وقت تو بہت سا مہر مقرر کر لیتے تھے مگر طلاق
کے وقت اُس کے گھٹانے کے لیے سخت کوششیں کرتے اور عورت کو تکلیف دیتے تھے
اسلیئے اِس سے باز رکھنے کے لیے اسلام نے یہ تعلیم دی قال اللہ تعالی وان اردتم
استبدال زوج مکان زوج واتیتم احداھن قنطارا فلا تاخذوا منہ شیئا
اتاخذونہ بھتانا واثما مبینا وکیف تاخذونہ وقد افضی بعضکم الی بعض
ان اُصولوں کو دیکھکر کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو کسی طرح کے حقوق
نہیں دیئے۔ ہر کام کی ہدایت جس طرح اسلام نے عورتوں کو کی ہے مردوں کو بھی کی ہے
اور جس طرح مردوں کو کی ہے عورتوں کو بھی کی ہے۔ مگر حسب فطرت ہر ایک کے وقت
احتیاج کا لحاظ رکھا ہے۔ عبادات میں دونو برابر خانہ داری کے انتظام میں حسب
قانون اسلام دونو بادشاہ و وزیر نظر آتے ہیں۔ تمام حقوق عورتوں کے جس طرح
اسلام میں قائم تھے آجتک اسی طرح قائم ہیں ٭

خاوند کے حقوق

مرد کا عورت کے ذمہ پہلا حق یہ ہے کہ وہ ہر ایک امر میں بشرطیکہ
خلاف شریعت نہ ہو اُس کی اطاعت کرے آیہ الرجال

الرجال قوامون علی النساء کے مفہوم میں اس طاعت کو بالوضاحت بیان کیا گیا ہے چنانچہ
بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ ایک شخص نے سفر کو جاتے وقت اپنی بیوی کو وصیت کی کہ
اوپر کی منزل سے نچلی منزل میں نہ آنا۔ عورت کا باپ نچلی منزل میں رہتا تھا۔ اتفاقاً وہ
بیمار ہو گیا۔ عورت نے جناب پیغمبرؐ سے کہلا بھیجا کہ میں باپ کی عیادت کے لئے نچلی منزل
میں آؤں یا نہ۔ فرمایا کہ اپنے خاوند کی وصیت پر قائم رہ۔ پھر جب اس کا باپ مرگیا تو
عورت نے دریافت کر بھیجا کہ میں اب بھی نیچے اتروں یا نہیں۔ فرمایا کہ اپنے خاوند کی
وصیت پر قائم رہ۔ جب اس کے باپ کو دفن کر چکے تو حضور علیہ السلام نے عورت کو
کہلا بھیجا کہ تیرے اپنے خاوند کی اطاعت کرنے پر خداوند تعالیٰ نے تیرے باپ کی مغفرت
کر دی ہے۔ اور ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جب عورت پانچ نمازیں ادا کرے
اور روزہ رمضان کو پورا کرے اور اپنے عفت کی نگہداشت کرے اور اپنے خاوند
کے فرمان کو بجالائے تو وہ داخل جنت ہوتی ہے۔ غور کرو کہ خاوند کی اطاعت کو دیگر
ارکان اسلام کے پہلو بہ پہلو بیان کیا گیا ہے جس سے اس اطاعت کی اہمیت کا
پتہ چلتا ہے۔ عورت کو جائز نہیں کہ وہ اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر اس کے مال
سے کوئی چیز کسی کو دے ورنہ وہ گنہگار ٹھہرائی جاتی ہے اور اس کا ثواب مرد کو پہنچیگا
عورت کو مرد کی اجازت کے بغیر عبادات نافلہ کو بجالانیکا حکم نہیں۔ ورنہ وہ عبادات
مقبول نہیں ہوتیں۔ عورت کو بلا اذن شوہر گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ورنہ اس کے
واپس آنے تک ملائکہ اسپر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔ عورتوں کو آزادی دینے والے
اصحاب اس وعید میں غور کریں اور ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اگر میں کسی مخلوق
کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کیا کرے۔ اور ایک
حدیث میں یوں وارد ہوا ہے کہ عورت کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ سے اس وقت
زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ وہ اپنے گھر میں مستور رہے اور گھر کے صحن میں اسکا

نماز ادا کرنا مسجد میں نماز ادا کرنے سے اور گھر میں کوٹھڑی کے اندر نماز ادا کرنا تمام میں نماز ادا کرنے سے کہیں زیادہ فضیلت رکھتا ہے اور پھر فرمایا کہ عورت کا تمام بدن شرمگاہ اور واجب الستر ہے۔ جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اُس کی طرف جھانکتا ہے۔ الغرض مرد کے حقوق عورت کی ذات پر بہت ہیں مگر نہایت ضروری دو ہیں۔ اوّل عفت و عصمت جو صرف پردہ سے متصور ہو سکتی ہے۔ پردہ اٹھا دینے کی صورت میں اسکی عفت و عصمت بالکل زائل ہو جاتی ہے۔ دوم یہ کہ وہ اپنے خاوند سے کسی غیر ضروری امر کا مطالبہ نہ کرے اور مرد کے مال حرام سے منتفع نہ ہو۔ یہ ہر دو وصف سلف صالحین کے زمانے کی عورتوں میں پائے جاتے تھے۔ ہمارے ناہنجار زمانہ میں یہ ہر دو مفقود ہیں۔ عورت کو نہیں چاہئیے کہ وہ اپنے حسن اور مال کی وجہ سے اپنے خاوند کے ساتھ کبر و غرور کے ساتھ پیش آئے اور خاوند کے بدشکل ہونے کی وجہ سے اسے حقیر جانے۔ الغرض عورت کا فرض ہے کہ خاوند کی غیبت وحضور کی حالت میں وفادارانہ سلوک کرے اور کسی امر کا جو موجب اذیت ہو ارتکاب نہ کرے اور دل اور زبان سے اسکی عزت اور تعظیم کو ملحوظ رکھے۔

عورت کے حقوق

آیہ عاشروھن بالمعروف جو اوپر مذکور ہو چکی ہے۔ نہایت جامع اور وسیع مفہوم پر مشتمل ہے جس میں تمام اخلاق حسنہ جو مرد کو عورت کے ساتھ ملحوظ رکھنے چاہئیں داخل ہیں مرد چونکہ عورت کی ہر ایک حالت کا شرعاً نگران اور متکفل ہوتا ہے۔ اِس لئے اس کا فرض ہے کہ عورت کو اس کے جائز حقوق سے ہرگز محروم نہ رہنے دے۔ اسے لازم ہے کہ اپنی حیثیت کے موافق نان ونفقہ اور دیگر ضروریات خانہ داری میں اسے شکایت کا موقعہ نہ دے۔ اور چھوٹی چھوٹی بات پر اس سے سختی نہ برتے اور احکام شرعی کے بجا لانے کی اسے ہدایت کرے اور گھر کے مصارف میں اسے اسراف اور بخل کا عادی نہ ہونے دے اور دل آزا ایذا

...اظت سے اسے خطاب نہ کرے اور سب و شتم اور زد و کوب فرمایا یہ لوگوں کا کام
...شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی - اور عفت و عصمت کی نگہداشت کی طرف
...ے خاص طور پر متوجہ کرے اور یوں سمجھے کہ امور خانہ داری میں عورت مرد کے
...اتھ وہی نسبت رکھتی ہے جو بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ سے نسبت رکھتا ہے - اور اگر
...سے کسی غلطی پر آگاہ کرنا ہو تو ملاطفت اور مدارات سے کام لے اور اگر اس کی
...بدخوئی اور بدخلقی کو برداشت کرے تو اس کے لئے موجب ثواب ہے اور ضرورت
...وقت اسے اپنے رشتہ داروں سے ملنے کی اجازت دے - مگر بجز اپنے محارم
...کسی غیر کے ساتھ عورت سفر نہیں کر سکتی - الغرض عورت کی عزت اور محبت مرد
...کے دل میں ہمیشہ ملحوظ رہنی چاہئے ؛

باب دوازدہم [۱۲]

حرمتِ سود

یہ مسئلہ اگرچہ اصول شریعت کی بنا پر بالکل صاف ہے اور حرمتِ سود کے
...ہ میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں مگر باایں ہمہ ایک عرصہ سے یہ
مسئلہ معرکۃ الآرا ہو رہا ہے اور گاہ و بیگاہ ملک کے مختلف افراد نے
...ث کی ہے جن میں اکثر اصحاب وہ لوگ ہیں جو اصول شریعت سے بالکل
...خبر اور فقہیات سے مطلق بے بہرہ ہوتے ہیں اور محض حالاتِ حاضرہ کی ضرورت کو
...کھکر مسلمانوں میں جواز سود کا رواج دینا چاہتے ہیں - ان لوگوں کے دلائل کا

...ایک فاضل مولوی صاحب نے اس مسئلہ کو صفحہ ۳ تک اصول فقہ پر لکھوایا ہے جو غالباً ان لوگوں کے لئے زیادہ
...یب نہ ہو جو علم فقہ سے واقفیت نہیں رکھتے مگر اس طور پر اس کا لکھوانا ضروری تھا صفحہ ۳ سے
...ت حاضرہ کے رو سے اس پر بحث کی گئی ہے ۱۲ منہ

مدار صرف موجودہ اقتصادیات مغربی کے اصول پر ہے مگر سود من کل الوجوہ حرام مطلق ہے اور اس میں کسی قسم کے جواز کی گنجائش نہیں جیسا کہ آئندہ عبارات سے واضح ہوگا۔ حق یہ ہے کہ کتاب وسنت سے دست بردار ہونے والے ہی اس قسم کی خرافات باتیں بذریعۂ اخبارات و رسالہ جات شائع کرکے اہل اسلام کو ایک فعل حرام کا مرتکب قرار دینا چاہتے ہیں۔ قرآن مجید میں صاف طور پر وارد ہے لا تقولوا لما تصف السنتکم[1] الکذب ھذا حلال وھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب ۔۔۔۔ الخ مگر مجوزین سود کی بے باکی کا کیا ٹھکانا ہے کہ ایک صریح حکم کو محض اپنی ہوائے نفس کی بنا پر توڑنا چاہتے ہیں۔ میں نے جس قدر مجوزین سود کے دلائل کا تتبع کیا ہے معلوم ہوا ہے کہ ان میں کسی صاحب نے بھی صحیح استدلال سے کام نہیں لیا۔ آئندہ عبارات میں اس مسئلہ کو زیر بحث لایا جاتا ہے اور مجوزین کے دلائل کا تارو پود کھول کر دکھلایا جاتا ہے ؎

فان کنت لا تدری فتلک[2] مصیبۃ
وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

مجھے اس وقت یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ سود حرام ہے یا حلال؟ کیونکہ اس ارشاد باری تعالیٰ کے بعد کہ احل اللہ البیع وحرم الربٰو اس بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اور ہم میں سے کسی شخص کے دل میں یہ خیال جاگزین نہیں ہو سکتا کہ وہ نص آیت کی مخالفت کرے بلکہ ہماری بحث صرف ان دو سوالوں کے متعلق ہے جو مدت سے زیر بحث چلے آتے ہیں اور برابر سلف مجتہدین کے درمیان محل بحث رہے ہیں

(۱) اس ربٰوا کی تعریف کیا ہے جس کی تحریم آیات قرآنی سے ثابت ہوتی ہے
(۲) کن چیزوں کے تبادل میں ربٰوا ہوتا ہے؟

---

[1] یعنی اپنی زبانوں سے جھوٹ بیان کرکے یہ مت کہو کہ یہ چیز حلال ہے اور یہ حرام کیونکہ اس سے خدا کی ذات پر افترا لازم آتا ہے ۱۲ منہ
[2] اگر تو حقیقت امر کو نہیں جانتا تو یہ مصیبت ہے اور اگر جانتا ہے تو یہ دوہری مصیبت ہے ۱۲ منہ

اِن دونوں سوالوں کا جواب پا لینے پر ہم اپنے بعض مروجہ جزئی معاملات کو بھی قیاس کر سکینگے۔ یہ بات محتاج دلیل نہیں کہ اصل اور قیاس کی بنا منصوصہ احکام شرعی پر قائم ہوتی ہے۔ پس ربا ہمارے سامنے کتاب و سنت ہی ہے اور اگر اس میں سے ہمارا مطلب نکل آئے تو کسی دوسری جگہ دست دراز کرنے کی ضرورت نہیں ورنہ اجماع مسلمین کی طرف ہم کو جھکنا پڑیگا۔ پس اگر مجتہدین اور جماعت صحابہ نے کسی مسئلہ کی تنقیح نہیں کی تو ہم سلف صالحین کے طریقہ پر قرآن کریم میں غور کریں گے ۔

قرآن مجید میں ربٰوا کا ذکر ان چار مواضع پر آیا ہے :۔

(۱) سورۂ روم میں۔ اِس کو پہلے نمبر پر ہم نے اس لئے رکھا ہے کہ یہ اس موضوع میں سب سے پہلی آیت ہے کیونکہ یہ مکیہ ہے باقی مدنیات ہیں۔ فرمایا :۔

وما اتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ وما اتیتم من زکوٰة تریدون وجہ اللہ فاولٰئک ھم المضعفون (ترجمہ) اور جو تم بیاج دیتے ہو تاکہ لوگوں کے مالوں میں بڑھے پس وہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک نہیں بڑھتا اور جو صدقہ دیتے ہو جس سے تمہاری مراد خاص اللہ کی رضا ہوتی ہے۔ سو یہ صدقہ دینے والے لوگ اس کو کئی گنا بڑھاتے ہیں ۔

(۲) سورہ نساء کی آیت میں جو یہودیوں کے معائب اور ان کے ارتکاب منہیات کے اثنائے ذکر میں آئی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

واخذھم الربٰوا وقد نھوا عنہ واکلھم اموال الناس بالباطل (ترجمہ) اور وجہ ان کی رباخواری کے جس سے ان کو ممانعت کیگئی تھی اور بہ سبب انکے لوگوں کا مال کھا جانے کے ناجائز طور پر ۔

(۳) سورۂ آل عمران کی آیت میں فرمایا :۔

یا ایہا الذین امنوا لا تاکلوا الربوا اضعافا مضاعفۃ واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔ (ترجمہ) اے مومنو! تم ربا نہ کھاؤ کئی گنا جو پھر کئی گنا ہو جاتا ہے اور اللہ سے ڈرو شاید کہ تم فلاح پاؤ +

(۴) سورہ بقر کی آیت ہیں - اور مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس موضوع میں سب سے آخری آیات یہی ہیں - فرمایا :-

الذین یاکلون الربوا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطن من المس ذلک بانہم قالوا انما البیع مثل الربوا واحل اللہ البیع وحرم الربوا فمن جاءہ موعظۃ من ربہ فانتہی فلہ ما سلف وامرہ الی اللہ ومن عاد فاولئک اصحب النار ھم فیہا خالدون ہ یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات واللہ لا یحب کل کفار اثیم ہ یا ایہا الذین امنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مومنین فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ وان تبتم فلکم رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون۔ (ترجمہ) جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن نہیں کھڑے ہونگے - مگر اس شخص کا سا کھڑا ہونا جس کو شیطان نے مخبوط الحواس کر دیا ہے چھو کر - یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے کہا کہ معاملہ بیع کا مثل سود کے ہے حالانکہ بیع کو تو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام - پس جس کے پاس اس کے پروردگار سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آگیا تو جو پہلے لے چکا ہے سو اس کا معاملہ خدا کے حوالے ہے اور جو پھر بھی ربا کی طرف لوٹے تو یہی لوگ دوزخی ہیں وہ دوزخ میں ہمیشہ رہینگے - اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے اور جتنے منکر بدکار ہیں خدا ان سے راضی نہیں - اے مسلمانو! خدا سے ڈرو اور جو سود باقی ہے اس کو چھوڑ دو - اگر تم ایمان رکھتے ہو - اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ - اور اگر تم توبہ کرتے ہو تو تمہاری اصل رقم تم کو پہنچ جاتی ہے

نہ تم کسی کا نقصان کرو اور نہ کوئی تمہارا نقصان کرے ؛

معتبر اور مقبول مفسرین نے پہلی آیت (سورہ روم) کی تاویل ایسے معانی سے کی ہے جن کے رو سے وہ ہماری بحث میں داخل نہیں ہو سکتی۔ اُنہوں نے اس کی تاویل اس عطیہ سے کی ہے جو لوگ آپس میں ایک دوسرے کو دیتے ہیں اور خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ معاوضہ ملے۔ اور وہ ہدیہ کہلاتا ہے۔ آیت کی یہ تفسیر ابن عباس۔ سعید ابن جبیر۔ مجاہد۔ طاؤس۔ قتادہ اور ضحاک نے کی ہے اور شیخ المفسرین طبری نے ان سے نقل کی ہے۔ اس کے ہم معنی وہ آیت ہے جس میں خداوند تعالےٰ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرماتا ہے ولا تمنن تستکثر یعنی کسی کو اس لالچ سے کوئی شئے ہبہ نہ کر کہ تجھکو اس سے زیادہ عوض دیا جائے ؛

اس بات کی دو دلیلیں ہیں کہ مذکورہ آیت کے معنی مرادی ہماری بحث سے خارج ہیں (۱) یہ کہ اس آیت میں اتیتم کا لفظ آیا ہے۔ بخلاف اس کے اس سُود کے ذکر میں جو ہمارا موضوع بحث ہے لا تاکلوا الربٰوا اور الذین یاکلون الربٰو کا لفظ فرمایا ہے اور پھر اس کا مقابلہ وما اتیتم من زکوۃ تریدون بوجہ اللّٰہ سے کیا ہے۔ پس پہلی چیز تو وہ عطیہ ہے جس سے زیادہ طلبی کی غرض سے بندوں کو خوش رکھنا مدعا ہو اور دوسری چیز وہ عطیہ ہے جس سے رضائے الٰہی مطلوب ہو پہلی چیز مذموم و مکروہ اور دوسری محمود و مبارک ہے (۲) یہ آیت مکیہ ہے اور قرآن کا جو حصہ مکہ شریف میں نازل ہوا ہے اس میں جزئی احکام نازل نہیں ہوتے تھے۔ اس میں صرف توحید و آخرت کا ذکر اور بڑے بڑے مکارم اخلاق عدل و احسان وغیرہ کا بیان آیا ہے تشریح جزئیات مدنیکی آیات میں ہے جیسا کہ امام شاطبی نے موافقات میں ظاہر کیا ہے۔ اور جیسا کہ ایک لائق و ماہر قرآن بخوبی جانتا ہے ؛

سورہ نسا والی آیت تاریخی آیت ہے جس میں اللہ تعہ نے اس قوم کا ذکر کیا ہے

جس پر سود حرام کیا گیا تھا۔ مگر وہ سود لینے سے باز نہ آئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالٰے نے اس کو عذاب میں مبتلا کر دیا اور اس پر کئی حلال چیزیں حرام کر دیں۔

اب سورۂ آل عمران اور سورۂ بقر کی دو آیتوں کے متعلق بیان کرنا باقی ہے۔ ان دونوں آیتوں میں رلٰو کے لفظ پر الف لام داخل ہے۔ اور الف لام تین معنوں میں آتا ہے (۱) استغراق (۲) جنس (۳) عہد۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ الربٰو کے لفظ پر جو الف لام داخل ہے لام کے ہر سہ مذکورہ بالا اقسام میں سے کس قسم میں داخل ہے۔ ذیل میں اس لام کی حقیقت کا معین کرنا ضروری ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اصول عربیت کے ماہرین کے لئے تو اس کے سمجھنے کے لئے کوئی دقت پیش نہیں آسکتی۔ لیکن اس کتاب کے ناظرین میں سے اکثر اصحاب ایسے بھی ہونگے جو اصول عربیت سے بالکلیت ناآشنا ہیں اس لئے ہم ہرسہ اقسام کی حقیقت کو واضح کرکے لفظ الربٰو کے حرف لام کی تعیین کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ لام استغراق کا مفہوم یہ ہے کہ جس لفظ پر وہ داخل ہوتا ہے اس میں کسی چیز کے تمام افراد داخل ہوا کرتے ہیں۔ جیسے آیہ تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض میں لفظ الرسل پر جو لام داخل ہے وہ اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ الرسل کے لفظ میں رسول کے تمام افراد داخل ہیں۔

بدیں طور کہ کوئی رسول خارج نہیں رہ سکتا۔ سو اس تعریف کے مطابق لفظ الربوٰ میں لام استغراق نہیں لیا جاسکتا کیونکہ ربوا کے معنی زیادتی کے ہیں۔ اگر ہم اس لام کو لام استغراق سمجھیں تو ہر ایک قسم کی زیادتی کا لینا جائز نہیں ہوگا۔ حالانکہ بیع کی صورت میں بعض اوقات بائع مشتری سے حسب دستور اصل قیمت پر زیادہ بھی کچھ لیا کرتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کوئی چیز بیس روپیہ پر خرید کرے اور پچیس روپیہ پر فروخت کردے تو اس قسم کی زیادتی ممنوع نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ الربوٰ پر لام استغراق کے معنی چسپاں نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح لفظ الربوٰ پر لام جنس بھی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ لام جنس کے معنی یہ ہوا کرتے ہیں کہ جس لفظ پر وہ داخل ہو اس سے کسی چیز کی ماہیت مراد لیا کرتے ہیں اور ماہیت ایک امر ذہنی ہوا کرتا ہے جس کا خارج میں افراد سے علیحدہ کوئی وجود نہیں ہوتا اور اوامر و نواہی کا حکم ماہیت ذہنیہ پر عائد نہیں کیا جاتا۔ جیسے لفظ الحمد پر جو لام داخل ہے بموجب تحقیق علامہ زمخشری لام جنس ہے۔ اگر ہم لفظ الربوٰ میں لام جنس مراد لیں تو معنی یہ ہونگے کہ ماہیت ربوا جو ایک امر ذہنی ہے حرام ہے مگر ہر ایک عاقل سمجھ سکتا ہے کہ ایک مفہوم ذہنی کو حرام کہنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ جب الربوا کا لام نہ تو لام استغراق ہو سکتا ہے نہ لام جنس تو لامحالہ ہم اسے لام عہد قرار دینگے جو سب محققین کے نزدیک مسلم ہے اس لئے

لفظ الربوٰ سے وہ ربوا مراد لیا جائے گا جو مخاطبین کے نزدیک معہود ہے۔ یعنی جس کو مخاطبین جانتے ہیں کہ وہ ربوا جو عام طور پر لوگوں میں متداول ہے حرام ہے کیونکہ اگر مخاطبین کو پہلے سے یہ معلوم نہ ہو کہ ربوا سے کونسا ربوا متکلم نے مراد لیا ہے۔ تو متکلم کا انہیں اس ربوا سے منع کرنے کا کیا مطلب ہو گا۔ پس اس تحقیق سے معلوم ہُوا کہ لفظ الربوا سے وہ ربوا مراد ہے جو اہل عرب کے ہاں متداول تھا اور جس کو ہر ایک شخص اپنے روزمرہ معاملات میں بخوبی جانتا تھا۔ مگر ان کی غلطی یہ تھی کہ وہ بیع اور ربوا میں کچھ فرق نہیں کرتے تھے اور اسی وجہ پر وہ دونوں کی ایک ہی نوعیت خیال کیا کرتے تھے جس پر اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ بیع تو حلال ہے اور ربوا حرام ۔

واضح ہو کہ اہل عرب کے ہاں جس ربوا کا لین دین متداول تھا اس کی صورت یہ تھی کہ ایک شخص دوسرے شخص کو کسی مدت معینہ پر کچھ قرض دیتا اور جب وہ مدت ختم ہو چکتی تو قرض دہندہ قرضدار کو یُوں کہتا کہ یا تو قرض ادا کردو یا اس کی مقدار میں کچھ زیادتی کرو جس کی صورت یوں تھی کہ یا تو ایک ناقہ کے عوض وہ دو ناقہ کا لینا قرار دیتا یا چار سالہ اونٹ کے بچّہ کے مقابل وہ جوان اونٹ لینا قرار دیتا۔ سو یہ ہر دو قسم کی زیادتی ربوا خیال کی گئی ہے جس کی نسبت قرآن مجید میں نہی وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ حدیث انما الربوا فی النسیئۃ نے اس ربوا کی وضاحت کردی۔ کیونکہ نسیۂ یعنی ادھار کے ساتھ جو زیادتی لی جاتی ہے وہ ربوا کہلاتی ہے ۔

اس سے ناظرین کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ قرضہ میں وہ زیادتی جو مہلت قرضہ کے مقابلہ میں لی جاتی ہے حرام ہے۔ یا یوں کہو کہ ربوا قرضہ کے ساتھ وہ زیادتی ہے جو بلا کسی قسم کے معاوضہ کے قرضدار سے وصول کی جاتی ہے۔ شریعت نے مہلت قرضہ کے مقابلہ میں کسی قسم کی زیادتی کو جائز نہیں رکھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت اسلام نے ربوا کی دو صورتیں قرار دی ہیں۔ اوّل ربوا النسیہ یعنی اُدھار دے کر کسی مدت کے بعد اصل کے ساتھ کچھ زیادتی وصول کی جائے۔ دُوم ربوا الفضل یعنی دست بدست ادل بدل کرنے میں اصل مقدار کے ساتھ کچھ زیادتی وصول کی جائے۔ ربوا النسیہ مثلاً سو روپیہ کے ساتھ کچھ مدت کے بعد سو سے زیادہ کسی شرح مقرّرہ پر وصول کیا جائے۔ اور ربوا الفضل مثلاً سونا یا چاندی یا کوئی اور دو ہم جنس چیزوں کا دست بدست ادل بدل جس میں ایک طرف کچھ اور زیادتی کا لینا ٹھہرایا جائے۔ شریعت نے ہر دو صورت کو حرام قرار دیا ہے۔ اس لیئے آجکل جو معاملات بنکوں میں مروّج ہیں مثلاً ایک سو روپیہ ایک خاص مدت کے لیئے بعوض ایک سو دس روپیہ کے بطور قرض دیا جاتا ہے وہ ربا نسیہ ہے جو کتاب و سنت اور اجماع کے رُو سے حرام ہے۔ کیونکہ اصل پر ایک ایسی زیادتی ہے جو مدت کے مقابلہ میں ہے۔ اضعافاً مضاعفۃ کا جو

لفظ صراحتاً سورہ آل عمران کی آیت میں آیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ قرض بسا اوقات مرور ایام سے کئی گنا ہو جاتا ہے ملک شام کے مشہور پروفیسر شیخ عبدالعزیز جاولیش اپنی ایک طویل تقریر میں جس کا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے بیان کرتے ہیں:-

اہل عرب میں رواج تھا کہ وہ لوگ مدت بڑھا دیتے تھے اور جانور کی عمر میں زیادتی کر دیتے تھے۔ پس ایک سال کے بچہ شتر کی بجائے دو سال کا بچہ لیتے تھے۔ اب جبکہ ان دونوں میں ایک ہی سال کا فرق ہے تو بے شک اضعاف کی صورت نہیں پائی جاتی۔ مگر جب مدت قرض بتدریج بڑھتی جاتی تو ایک سال کے بچے سے ایک ایک سال کے دو یا تین بچے بن جائینگے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہر دعی کی بات کا فیصلہ کر دیتا ہے کہ ان تبتم فلکم رؤس اموالکم۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے بشرطیکہ وہ توبہ کریں رؤس اموال پر قناعت کرنے کی ہدایت کی ہے اور اس پر کسی قسم کی قلیل وکثیر زیادتی عائد نہیں کی۔ اکثر لوگوں کو یاد ہوگا کہ کچھ مدت ہوئی کہ ملک شام کے بعض عیسائی و یہودی سود خواروں نے دیہاتی کاشتکاروں کو قرض دینا شروع کیا تھا جس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ کچھ عرصہ گذرتے پر سود اصل سے کئی گنا بڑھ جاتا حتیٰ کہ مقروض کے پاس کچھ نہ رہتا۔ اس بیان سے ظاہر ہو گیا کہ جو سود اصل قرضہ سے کئی گنا بڑھ جائے حرام سود کی افراد میں سے ایک وہ بھی ہے۔ یہ نہیں کہ صرف وہی حرام ہے:

اب یہ بیان کر دینا باقی رہا کہ شریعت نے اس زیادتی بمقابلہ مدت کو کیوں حرام قرار دیا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ آجکل اس مسئلہ میں معمول سے زیادہ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اگر اس موضوع پر کچھ بیان کیا جاتا ہے تو خوب کان لگا کر سنتے ہیں اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اس مسئلہ مشکل سے نجات پائے۔ مگر ساتھ ہی ہماری شریعت کی مخالفت بھی لازم نہ آئے:

ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ سود کسی صورت میں بھی مفید و نافع نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم بہت سی ایسی صورتیں دیکھ رہے ہیں جن میں سود کی طفیل انسان کی بہت سی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور بہت سی مشکلات حل ہوتی ہیں۔ لیکن شارع علیہ السلام نے جب دیکھا کہ قوم کو اس سے ضرر پہنچیگا اور وہ اسکے نفع سے بڑھکر ہوگا اور وہ تمول و دولتمندی کو اغنیائے اُمت کا ورثہ بنا دے گا اور شارع کا مقصود یہ ہوتا ہے۔ کہ دولت تمام طبقات اُمت کے درمیان قطع نظر اس سے کہ وہ غریب ہوں یا فقیر متبادل ہوتی رہے اِس لئے سُود کا دروازہ ہی بند کر دیا۔ اور اس کو قطعاً خواہ قلیل ہو خواہ کثیر حرام کر دیا۔ کچھ زیادہ مدت نہیں گذری کہ بنکوں کی کثرت ہونے سے پیشتر ہمارے ملک کا یہ حال تھا کہ جو زراعت پیشہ اور زمیندار لوگ تھے وہ اپنی کھیتی باڑی سے کافی غلہ پیدا کرکے گذران کرتے تھے اور جو ملازمت پیشہ تھے وہ اپنے فرائض منصبی کے پابند رہ کر بقدر ضرورت روزی سے متمتع ہو کر مزے سے گذارا کرتے تھے۔ پس ملک کی تھوڑی سی ثروت اہل ملک کے گذارہ کے لئے کافی ووافی تھی۔ انپر کوئی قرضہ کا بار نہ پڑتا تھا اور نہ کوئی قرضخواہ اپنے حق اور اقتدار کے دعویٰ پر انکے ساتھ ایسا برتاؤ کر سکتا تھا جو آقا نوکر کے ساتھ اور مالک غلام کے ساتھ کر سکتا ہے ؂

یورپ کے ماہرین تجارت نے ہمارے لئے عطائے قرض کے دروازے کھول دئے ہیں اور اس غریب ملک میں اپنے یورپین اصول کی ایسی نہریں چلانی شروع کی ہیں جو اس کی رہی سہی ثروت کو بھی بہائے جا رہی ہیں۔ کیونکہ اس تند و تیز سیلاب کے بہا لیجانے کے لئے دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ سفید پوش لوگ جو اپنی شان و تمکنت قائم رکھنے کے لئے اپنی موجودہ جائداد کو ناکافی سمجھ کر قرض لینا ضروری خیال کرتے ہیں۔ دوسرے وہ تاجر لوگ جو اپنے سرمایۂ تجارت کو تھوڑا جانکر زیادہ سرمایہ سے نفع کی حرص کرتے ہیں اور یہ غرض قرض پر روپیہ لیکر پوری کرنا چاہتے ہیں۔ ان

دو قسم کے لوگوں سے کم تعداد میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تنگدستی سے تنگ آ کر
اپنی حاجات پوری کرنے کے لئے قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اب اس کے ساتھ
ساتھ یہ حالت ہے کہ اہل ملک کے ہاں اس وقت بہت سی دولت موجود ہے۔
جس کا بڑا حصہ انہیں بذریعہ قرض حاصل ہوا ہے اور طبعاً اس کا نتیجہ یہ ہے اور
ہونا چاہئے کہ اراضی کی قیمت بہت چڑھ گئی ہے۔ مختلف سامان کی قیمت اور اشیائے
خوردنی کا نرخ گراں ہو گیا ہے اور سمجھ لینا چاہئے کہ یہ تمام مشکلات اسی جھوٹی دولت
کی بدولت پیدا ہو رہی ہیں جو چشمہ کی طرح بنکوں سے پھوٹ رہی ہے۔ حساب دان
معلوم کر سکتا ہے کہ ہمارے ملک شام کے سر پر غیر ممالک کے قرضہ کا بہت بڑا بوجھ
پڑا ہوا ہے۔ جس کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے اور جس کے ذمہ دار قوم اور حکومت
ہیں۔ تمدن کے نکتہ شناس بخوبی جانتے ہیں کہ ثروت اس چیز کا نام ہے کہ آمدنی اور
خرچ کے بعد کچھ بچ رہے۔ جس شخص کی آمدنی دس اور خرچ آٹھ ہے وہ صاحب ثروت
ہے اور جسکی آمدنی ہزار اور خرچ گیارہ سو ہے وہ بے ثروت ہے۔ جب ہم اپنے ملک
پر نظر کرتے ہیں تو ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ بنکوں کے قائم ہونے کے بعد آجکل وہ
دوسری صنف میں داخل ہو گیا ہے۔ لوگوں کی آمدنیاں بڑھ گئی ہیں اور عوام الناس
کے ہاتھ میں بہت مال آ گیا ہے لیکن بنکوں کے جو قرض انکے ذمہ ہیں وہ انکی آمدنی سے
بڑھ کر ہیں۔ کیونکہ سالانہ سود کے رقوم کا ادا کرنا واجبات سے ہے اور ان رقوم
کا مجموعہ کروڑوں تک ہے جو ہر سال ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور اس سے
کچھ فائدہ ہمارے پلے نہیں پڑتا۔ اس برباد کن حالت کا منظر دیکھنا ہو تو خاص افراد
پر نظر کرنا چاہئے۔ چنانچہ مجھے ایک ایسے ثقہ آدمی سے جسکی رائے ان معاملات
میں خاص وقعت رکھتی ہے معلوم ہوا ہے کہ مالکان اراضی میں شاید ہی کوئی ایسا
نظر پڑے جس کی کمر اس قسم کے قرضہ کے بوجھ سے جھکی ہوئی نہ ہو۔ یہ لوگ کوئی

بشا ضرورت کے لئے قرض نہیں لیتے بلکہ صرف ترقی و ثروت کی اُمید پر قرض لیتے ہیں مگر اپنی مراد سے محروم رہتے ہیں۔ کئی شاندار محلات اس تباہی نے کھنڈر بنا کر چھوڑے ہیں جنکی عبرتناک داستان محبان وطن کو آٹھ آٹھ آنسو رلاتی ہے ؎

ایک نامی متمول اور رئیس کا ذکر ہے کہ اُس نے پچھلے سال ایک ہزار پونڈ تیس فیصدی سود پر صرف اس غرض سے لیا تھا کہ ایام گرما شہر پیرس میں گزارنے کے لئے رہائش کے لائق کوئی مکان مہیا کرے ؎

ہمارے بے ثروت ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ جب سے بنکوں نے ادھار مال دینے سے انکار کر دیا ہے اُس وقت سے لوگ دل شکستہ نظر آ رہے ہیں۔ اور کاروبار ٹھنڈے پڑ گئے ہیں کیونکہ کارخانہ دار لوگ اب تک ترقی ثروت کی موہوم اُمید پر غیروں کے روپیہ سے کام چلا رہے تھے۔ آہ۔ وہم تیرا برا ہو۔ تو ان لوگوں کو دولتمندی کے خیال خام میں مست رکھتا ہے۔ جو درحقیقت تباہی کی غار کی طرف جا رہے ہیں۔ مال جو لوگوں کے درمیان گردش کرتا رہتا ہے اگر وہ قوم و ملک کا مال ہوتا تو بھی بہت کم مصیبت سمجھی جاتی۔ کیونکہ ہم اس وقت کہہ سکتے تھے کہ قوم کا مال قوم ہی کے افراد میں دورہ کر رہا ہے۔ ایک کی جیب سے کچھ مال نکل جاتا ہے۔ تو دوسرے کی جیب میں داخل ہو جاتا ہے۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ جو مال ہمارے پاس ہے وہ غیروں کا ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ٹھہر نہیں سکتا۔ بلکہ ہماری قومی ثروت کو بھی کھینچتا اور سلب کرتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دن دُور نہیں جبکہ ہماری جائدادیں مستعار اور غیروں کا حق ہونگی۔ یا ہم اپنے آپ کو انیٹوں کے بھٹے پر کام میں مشغول پائینگے ؎

افسوس کہ فی الواقع ہم لحہ بلحہ اس تباہ کن حالت کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا بڑا موجب ایک تو وہ کوتاہ نظری ہے جو انسان کو اکثر غیر محسوس حالت

تک پہنچادیا کرتی ہے۔ دوسرے بڑی آرزوئیں ہیں جنکی آڑ میں زمانہ کسی لد[illegible]
بھیانک حالت کو قریب لا رہا ہوتا ہے اور انسان کو اس کچھ علم نہیں ہو[illegible]
اس میں کسی کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ لوگوں نے اپنے آپ کو سخت
مشکلات کے بھنور میں ڈال لیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی حالت اس درجہ کو پہنچ
گئی ہے کہ وہ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ مگر دیکھ لینا کہ ایک نہ ایک دن زمانہ ا[illegible]
آنکھیں کھول دیگا۔ فضلائے قوم اور مدبران ملک کا فرض ہے کہ اس اندیشناک معاملہ میں
ہر طرح عقل دوڑائیں اور لوگوں کی ٹیڑھی رفتار کو سیدھی بناکر اسراف اور فضول خرچی سے
باز رکھیں تاکہ وہ چادر سے باہر پاؤں نہ پھیلائیں :

میرے خیال میں اگر مال ہمارا ہوتا تو تھوڑی مصیبت تھی۔ کیونکہ ہماری موجودہ حالت
دو مصیبتوں پر مشتمل ہے۔ اگر ہمارا تصرف اپنے ہی مال میں ہوتا تو ایک مصیبت ہی تھی
اور زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ مال کا بڑا حصہ اغنیار کے ہاتھوں میں چلا جاتا جو نادار لوگو[illegible]
سے مال کھینچنا حلال جانتے۔ اور خود آرام کے مسند پر جلوہ افروز ہوتے +

اس امر کو ملحوظ رکھ کر شارع علیہ السلام نے سود کو حرام قرار دیا۔ اور یہ حالت بعی[illegible]
ان اقوام میں پائی جاتی ہے جنکی اقتداء اور تقلید پر ہم مرتے جاتے ہیں اور چاہتے ہیں
انکے برابر ہو جائیں تاکہ ہم بھی کسی امر کی تیاری کریں کیونکہ ان اقوام کے اغنیا بڑی تیاری
اور مستعدی رکھتے ہیں۔ ثروت عامہ کی کنجیاں انکے قبضہ میں ہیں۔ اجناس کی ارزانی وگرا[illegible]
انکے اختیار میں ہے۔ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ ایک سواد اعظم انکی طفیل فقر و ناداری کے
گڑھے میں گرا ہوا ہے :

نتیجہ یہ نکلا کہ ربا نسیہ تھوڑا ہو یا زیادہ باجماع مسلمین حرام ہے اور تمدنی و معاشر[illegible]
زندگی میں اسکا نقصان بہت شدید ہے اور وہ خدا اور رسول سے نبرد آزمائی کرنے کا دع[illegible]
چنانچہ فرمایا فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ اور جو لوگ حقائق کی بنیاد اد[illegible]

پر رکھ لیتے ہیں ان کو اپنے ادبار کا جلد ہی احساس ہو جائیگا۔ شارع ہمیشہ جہت غالب کا لحاظ کیا کرتا ہے۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ اس میں عموماً شر غالب ہے تو حرام قرار دیتا ہے۔ اور اگر دیکھتا ہے کہ خیر غالب ہے تو حلال بنا دیتا ہے۔ لیکن خاص ان جزئیات کو بھی غیر ملحوظ نہیں چھوڑتا جن میں سخت ضرورتیں پیش آجاتی ہیں۔ ایسی صورتوں میں اگر ممنوع چیز کی ضرورت پیش آجاوے تو شارع ایک منفرد و مخصوص حالت میں حد ضرورت تک اس کو مباح بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ شریعت نے شراب اور قمار کو حرام قرار دیا ہے اور فرمایا ہے یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیہما اثم کبیر و منافع للناس واثمہما اکبر من نفعہما پس گناہ کی جانب کو ترجیح دیگئی ہے اور قلیل مقدار تک کو بھی حرام کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ کثیر کا ذریعہ ہے۔ اور اس عام حکم میں ان بعض افراد کا کوئی لحاظ نہیں کیا جو شراب نوشی میں بالکل حد اعتدال پر چلتے ہیں حتی کہ انپر مستی کبھی غالب نہیں ہوتی۔ کیونکہ شریعت میں جہت غالب کا لحاظ کیا جاتا ہے مگر ساتھ ہی فقہا رنے اس خاص مدت میں کہ کوئی بڑی سخت مرض میں مبتلا ہو اور کوئی عادل و حاذق طبیب کہہ دے کہ اس کو صرف شراب سے شفا ہوگی اجازت دیدی ہے کہ صرف ضرورت کے موافق شراب استعمال کر لینا چاہئے جس سے بیماری دُور ہو جانے کی اُمید ہو۔ بقول الضرورات تبیح المحظورات ؎

چوں ضرورت بود روا باشد (انتہیٰ)

ذیل میں چندان وجوہات یا دلائل کو جو مجوزین کی طرف سے اکثر پیش کیجاتی ہیں رد کیا جاتا ہے۔ منجملہ انکے (۱) بعض اصحاب یہ کہا کرتے ہیں کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور دارالحرب میں سود کا لین دین ممنوع نہیں جیسا کہ صاحب ہدایہ نے حدیث لا ربوٰ بین المسلم والحربی فی دار الحرب پیش کی ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نہیں تسلیم کرتے کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ کیونکہ دارالحرب ہونے کے لئے حضرت امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک تین شرطوں کا ایک ملک میں مجموعاً پایا جانا ضروری ہے اول یہ

کہ کوئی ملک جو دارالاسلام ہو اس وقت دارالحرب ہو سکتا ہے جبکہ اس میں تمام احکام اسلامی کا اجرا موقوف ہو کر احکام کفر کا اجرا حکماً قرار پائے۔ دوم یہ کہ وہ ملک چاروں طرف سے دارالحرب سے متصل ہو۔ سوم یہ کہ اس ملک میں جان و مال کے متعلق وہ امان اوّل قائم نہ رہے جو دارالاسلام کے وقت لوگوں کو حاصل تھی۔ امام ممدوح کے نزدیک تو ان تینوں شرطوں کا ایک وقت میں پایا جانا دارالحرب ہونے کے لئے ضروری ہے مگر صاحبین کے نزدیک صرف پہلی شرط کا پایا جانا ہی دارالحرب کے وجود کے لئے کافی ہے چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ اور نیز دیگر کتب فقہ میں اس امر کی پوری تفصیل مذکور ہے۔ مگر چونکہ فتویٰ امام ممدوح کے قول پر صادر کیا جاتا ہے اسلئے صاف ظاہر ہے کہ پہلی شرط ہندوستان میں قطعاً مفقود ہے کیونکہ حدود و قصاص کے سوا باقی تمام احکام شرعیہ بدستور نافذ ہیں کسی کو کسی قسم کی روک ٹوک نہیں۔ طحاوی میں مذکور ہے کہ جس ملک میں احکام شریعت اور احکام شرک دونوں نافذ ہوں وہ ملک دارالاسلام ہی سمجھا جائیگا۔ اور نیز فصول عمادی میں مذکور ہے کہ اگر کسی ملک میں کچھ احکام شرعی جاری ہیں تو وہ ملک دارالحرب نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اہل اسلام کا غلبہ باقی نہ رہا ہو۔ ہندوستان موجودہ حالت میں ہرگز دارالحرب قرار نہیں پا سکتا۔ کیونکہ احکام شرعیہ از قسم عبادات و تقسیم ترکات بدستور دارالاسلام بلا ممانعت حکومت نافذ ہیں علےٰ ہذا القیاس دوسری شرط بھی مفقود ہے۔ کیونکہ ہندوستان بعض اسلامی ریاستوں پر مشتمل ہے اور اس کے بعض اطراف اسلامی ممالک کے حدود سے متصل ہیں جہاں سے اعانت لشکر اسلام ہو سکتی ہے یہی حال تیسری شرط کا ہے۔ کیونکہ امان اوّل سے مراد یہ ہے کہ اہل اسلام بہ حیثیت اسلام اور کفار اہل ذمہ بہ حیثیت عقد ذمہ اپنے جان و مال کو اس طرح محفوظ نہ رکھ سکیں۔ جس طرح دارالاسلام میں وہ محفوظ رکھ سکتے تھے۔ مگر ہندوستان میں ہر شخص جانتا ہے کہ عیسائی حکومت اہل اسلام اور کفار کے جان و مال کو بہ حیثیت اسلام و عقد ذمہ تلف

نہیں کورہی اور غیر ممالک کے لوگ بلا روک ٹوک ہندوستان میں آمدورفت کرسکتے ہیں۔ لہذا ہندوستان تصریحات مذکورہ بالا کے رو سے کسی طرح بھی دارالحرب قرار نہیں پاسکتا۔

(۳) بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ سود در اصل تو ناجائز ہے مگر ہم لوگ انگریزی عملداری کے رہنے والے حکم ممانعت سود کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ کیونکہ اپنی خاص حالت کی وجہ سے مضطر ہیں۔ اور مضطر کو جس طرح میتہ وخنزیر جائز ہے اسی طرح ہمارے لئے سود کا معاملہ بھی جائز ہے۔ بہت سے احکام شرعی کی ہم انگریزی عملداری میں تعمیل کر نہیں سکتے جیسا کہ رجم زانی۔ قطع ید سارق مسلمانوں کے مقابلہ میں نامسلم کی شہادت ومیعاد سماعت وحدود۔ اسی طرح ہم حکم ممانعت سود کی تعمیل نہیں کرسکتے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے معاملہ کا سود میں حد اضطرار کو پہنچنا غیر مسلّم ہے۔ کیونکہ دولت کمانے کے پہلے سے بہت زیادہ دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ مثلاً نوکری۔ تجارت۔ زراعت وغیرہ۔ ایک سود کا لین دین ختم نشد۔ غرض سود کا معاملہ نہ کرنے سے کوئی وجہ خوف ہلاکت کی پائی نہیں جاتی۔ اور اگر بفرض محال اضطرار تسلیم کرلیا جائے تو سود کے دینے میں ہوسکتا ہے۔ کیونکہ سود کے لینے میں کوئی وجہ اضطرار کی محقق نہیں ہے۔ اس لئے دعویٰ عام ہے اور دلیل خاص۔ لہذا دلیل مستلزم ثبوت دعویٰ نہیں۔ اور پھر اضطرار کی حالت میں بھی اُن ہی اشیاء کا استعمال جائز ہے۔ جنکا ثبوت دلیل شرعی سے ہے اور سود کا جواز حالت اضطرار میں کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ اور قیاس کرنا سود کا رجم زانی وقطع ید سارق ونامسلم کی شہادت بمقابلہ مسلمانوں کے ومیعاد سماعت وحدود پر ایک قیاس مع الفارق ہے کیونکہ یہ سب امور حکومت سے متعلق ہیں اور حکومت اہل اسلام کی ہندوستان میں نہیں ہے۔ اس لئے ہم ان پر قدرت نہیں رکھتے بخلاف معاملہ سود کے کہ اسکو حکومت سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ہمیں اختیار ہے چاہے سود کا معاملہ کریں یا نہ کریں۔ حکام کی جانب سے اس میں کوئی تعرض نہیں ہے۔ مع ہذا اس دلیل سے تو نقود بر سازی اور اس کی بیع وشرا

اور آلات موسیقی کا بنانا اور اس کی بیع و شرا او قمار بازی اور دیگر بیوع اور اجارات فاسد اور نیلام فاسد اور پیشہ مغنیہ اور بیع و شرا خنزیر سب جائز ہو جاتے ہیں ⁕

(۳) بعض کا یہ خیال ہے کہ قرآن مجید میں ایک جگہ تو اضعافاً مضاعفۃ یعنی سود در سود کی مناہی ہے اور دوسری جگہ مطلق سود کی تفسیر امام رازی سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے لوگوں میں صرف سود در سود کا رواج تھا۔ اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں سود کی مناہی ہے وہاں یہی سود در سود مراد ہے اور چونکہ مطلق سود الربوٰ معرّف فرمایا ہے۔ اس سے نحو کے قاعدہ سے وہی ربوٰ سمجھا جائیگا معہود فی الذھن جو عرب میں مروّج تھا ⁕

سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قول کہ عرب کے لوگوں میں صرف سود در سود کا رواج تھا غلط ہے بلکہ عرب میں علاوہ سود در سود کے سود مروجہ حال بھی مروّج تھا۔ کیونکہ اگر آیہ احل اللّٰہ البیع وحرم الربٰو کے الف لام سے اگر بخیال مستدل صرف سود در سود مراد لیا جائے اور سود مفرد اس میں داخل نہ سمجھا جائے تو الفاظ اضعافاً مضاعفۃ عائد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور الفاظ فلکم رؤس اموالکم سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب کے ہاں ہر دو قسم کے سود یعنی مفرد و مرکب کا رواج تھا اور ہر دو کی علیحدہ علیحدہ ممانعت قرآن مجید میں وارد ہوئی۔ کیونکہ نصوص جو حرمت ربوٰ کے بارہ میں وارد ہوئے ہیں وہ مطلق ہیں جن میں مفرد و مرکب سود ہر دو شامل ہو سکتے ہیں اضعافاً مضاعفۃ سے اکثر اہل ہوا کو یہ دھوکا لگا ہے کہ شریعت میں صرف سود مرکب کی ممانعت ہے نہ سود مفرد کی۔ مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ ان الفاظ سے محض ایک حکم کا شدت کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو یوں کہے کہ مسجد میں چوری کرنا گناہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مسجد کے باہر چوری کرنا جائز ہے سخت جہالت ہے یا یوں سمجھو کہ کوئی شخص یوں کہے کہ زید میرے پاس گھوڑے پر

سوار ہو کر نہیں آیا۔ اس سے زید کا ضروری طور پر آنا کہاں ثابت ہوتا ہے ؟
اس لئے اضعافاً مضاعفة کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر آیہ حرم الربوٰ سے بحکم لا تظلمون ولا تظلمون مفرد سود کا ظلم ہونا مفہوم ہوتا ہے تو اضعافاً مضاعفة سے ظلم در ظلم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ جیسے چوری کرنا اگر حرام ہے تو مسجد میں چوری کرنا حرام در حرام ہے کیونکہ اس میں دو گناہ کا ارتکاب لازم آتا ہے۔ اوّل۔ غیر کے مال میں بلا اجازت تصرف کرنا دوم حرمت مسجد کا پاس نہ کرنا ؛
(۴) بعض لوگ یوں بیان کرتے ہیں کہ سب سے آسان تدبیر جو سوجھ پڑتی ہے۔ وہ یہی ہے کہ ہم اپنی خاص حالت کی وجہ سے اپنے آپ کو حکم ممانعت سود کا مامور بہ اور مخاطب قرار نہ دیں یہ اس سے بدرجہا بہتر ہوگا کہ مامور بہ اور مخاطب بن کر بے باکی اور شوخ چشمی کے ساتھ خلاف حکم کریں ؛
سو اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو حکم ممانعت سود کا مخاطب نہ قرار دیگا وہ حرام چیز کے حلال ہونے کا معتقد ہوگا۔ جو اعتقاد حد کفر تک پہنچتا ہے اور جو شخص حکم ممانعت سود کا معتقد اور مخاطب بن کر بے باکی سے خلاف حکم کریگا وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوگا۔ اب اگر یہ نسبت کبیرہ گناہ کے کفر کا اختیار کرنا مستدل کے نزدیک بہتر ہے تو اور بات ہے ورنہ قواعد اسلام کے موافق تدبیر مذکورہ بدترین تدبیر ہے ؛
(۵) بعض یہ کہتے ہیں کہ مسئلہ سود میں آئمہ ایک دوسرے کے مخالف اور حدیثیں ایک دوسرے کی متعارض ہیں ؛
مگر اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قول بالکل غلط ہے کیونکہ سود کے حرام ہونے میں آئمہ ایک دوسرے کے ہرگز مخالف نہیں ہیں۔ چنانچہ میزان شعرانی میں ہے اجمعوا علٰی ان الاعیان المنصوصة علٰی تحریم الربوٰ فیھا الذھب والفضة والبرّ والشعیر والتمر والملح۔ ہاں ان چیزوں میں سود کے حرام ہونے کا سبب آئمہ نے اپنے اپنے

اجتہاد کے مطابق بیان کیا ہے۔ سود کے حلال ہونے کا کوئی سبب کسی نے بیان نہیں کیا۔ غرض حرمت میں اتفاق اور سبب حرمت میں اختلاف یہ اور بات ہے اور نفس حرمت میں اختلاف اور بات ہے۔ ان دونوں کا ایک سمجھنا کسی صاحب فہم کا کام نہیں کوئی ہم مرتبہ دو حدیثیں بھی اس باب میں متعارض نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو مدعی کا ذمہ ہے کہ وہ پیش کرے۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس کا جو یہ قول ہے کہ وہ چیزوں کے دست بدست معاملہ میں ربٰو کو جائز کہتے تھے۔ رازی نے کتاب الاعتبار میں لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سنیں تو اپنے اس قول کو انہوں نے چھوڑ دیا۔ اور اس سے توبہ کی۔ اسی طرح عبداللہ بن عمرو نے اپنے قول سے رجوع کیا ہے۔ جس کا ذکر صحیح مسلم میں ہے۔ ابن ماجہ وغیرہ میں معاویہ اور عبادۃ بن الصامت کا جو قصہ ہے اس میں معاویہ کی جانب سے کوئی حدیث پیش نہیں ہوئی۔ صحیح مسلم میں اسامہ کی جو حدیث ہے کہ سود قرض کی صورت میں ہے نقد کی صورت میں نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ امام بخاری نے صحیح بخاری میں کر دیا ہے کہ یہ حدیث بیع صرف کی صورت میں ہے۔ چاندی کے عوض سونا لیا جائے یا سونے کے عوض چاندی لی جائے تو اس کو بیع صرف کہتے ہیں یہ دست بدست ہو تو اس میں کمی بیشی جائز ہے۔ لیکن یہ بیع قرض کے طور پر جائز نہیں ✦

(۶) بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وصف جودت کا اعتبار بیع میں ضروری ہے کیونکہ جو حدیث شریف عدم اعتبار پر دلالت کرتی ہے اس میں ہنوز کلام ہے کہ آیا صحیح ہے یا نہیں جیسا کہ ہدایہ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے ✦

اس کا جواب یوں ہے کہ جس حدیث کا مطلب صاحب ہدایہ نے بیان کر کے یہ ایک شرطیہ بات کہی ہے کہ فان صح ھذا الحدیث فھو حجۃ۔ یہ ایک حدیث صحیح بخاری

وسلم میں ابی سعید خدری رضؓ کی روایت سے اور فقط صحیح بخاری میں ابو ہریرہ رضؓ کی روایت سے ہے۔ ایسی صحیح حدیث کی نسبت مدعی نے جو یہ کہا ہے کہ جو حدیث عدم اعتبار پر دلالت کرتی ہے اس میں ہنوز کلام ہے کہ آیا صحیح ہے یا نہیں اس کا یہ قول بالکل غلط ہے۔ اور اپنے اس غلط قول کی بنا پر اس نے مدت قرضہ کو سود کا معاوضہ جو ٹھہرایا ہے وہ غلط در غلط ہے۔ کیونکہ اس حدیث کے تحت میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے واجمعوا علی ان البرّ بالبرّ لا یجوز بیع بعضہ ببعض الا مثلا بمثل وسواء فیہ الطیّب والدون وانہ کلہ علی اختلاف انواعہ جنس واحد۔

(۷) بعض یہ کہتے ہیں کہ آیت قرآنی احل اللہ البیع وحرم الربٰو کو بھی مانند ان آیتوں کے محل کیا جائے۔ جنکے متعلق مفسرین تحریر فرماتے ہیں اللہ اعلم بمرادہ یعنی مانند آیات مقطعات ومتشابہات کے کہ جن کے معنی ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تفسیر کے باب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کے قول کا بڑا اعتبار ہے۔ کیونکہ صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کے حق میں یہ دعا کی تھی کہ خدایا ان کو قرآن شریف کا مطلب سکھا دے اور ان سے علم تفسیر کو دنیا میں پھیلا دے۔ اب حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے تفسیر کی باتوں کو بہت سے طریقوں سے روایت کیا جاتا ہے مگر ان طریقوں میں علی بن طلحہ ہاشمی کا وہ اعلے درجہ کا طریقہ ہے جس کو امام بخاری نے صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں معتمد علیہ قرار دیا ہے اور امام احمد بن حنبل رحؒ نے اس طریقہ کی نسبت یہ فرمایا ہے کہ مدینہ سے مصر تک اس طریقہ کی ایک روایت کے حاصل کرنے کے لئے اگر کوئی شخص سفر کرکے اس کو حاصل کرے تو اس شخص نے اس روایت کو گویا مفت پایا۔ تفسیر ابن ابی حاتم میں انہی علی بن طلحہ کے طریقہ سے حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کی روایت ہے کہ قرآن مجید میں جو آیتیں عمل کے لئے نازل ہوئی

ہیں جیسے نماز۔ روزہ۔ بیع و سود کی آیتیں وہ سب محکم ہیں اور جن آیتوں سے عمل متعلق نہیں ہے بلکہ ان آیتوں پر فقط بندوں کا ایمان لانا مقصودِ الٰہی ہے جیسے صفاتِ الٰہی کی یا حال قیامت کی آیات یا حروف مقطعات وہ سب متشابہ ہیں۔ اب یہ بات ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ مستدل نے حلال و حرام کے عمل کی آیت مذکورہ کو آیات متشابہات کی مانند جو قرار دے لیا ہے تو یہ اس کی فن تفسیر سے ناواقفی کا سبب ہے۔ علاوہ اس کے جب کسی مفسر نے اس آیت کو متشابہ نہیں لکھا اور مذہب کے آئمہ و علماء نے آیت کو مجمل اور احادیث صحیحہ کو رافع اجمال ٹھہرا کر حکم مذکورہ آیت کی فروعات فقہیہ پر ہر طرح بحث کی ہے تو تن تنہا مستدل کو یہ اختیار کونسے حکم شرعی سے مل گیا کہ وہ تمام شرعی دنیا کی مخالفت پر کمر باندھے؟

(۸) بعض اصحاب یوں کہتے ہیں کہ حضرت عمر رض جیسے جلیل القدر صحابی جو سایہ کی طرح پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ رہتے تھے فرماتے ہیں کہ حرمت ربوا پیغمبر علیہ السلام کی حیات کے ایسے آخری زمانہ میں نازل ہوئی کہ ہم سے کسی کو ربوا کے بارہ میں پیغمبر سے دریافت کرنے کی نوبت نہیں پہنچی یہ بات حضرت عمر رض نے ضرور کسی ایسے موقعہ پر فرمائی ہوگی جبکہ کسی نے ربوا کے بارہ میں کچھ اشتباہ کیا ہوگا۔ اس کے جواب میں حضرت عمر رض نے ایسا فرمایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ صحابہ کو ربوا کے بارہ میں اشتباہات تھے۔

جواب اس کا یوں ہے کہ جن اشتباہات کی تصریح مستدل نے اوپر بیان کی ہے وہ اس مطلب کی تائید میں ہے کہ نقد سود حرام نہیں ہے۔ اگر حرام ہے تو فقط سود در سود ہے۔ اگر مستدل اس طرح کا اشتباہ ایک صحابی سے نقل کرنا چاہے تو ہرگز نہیں کرسکتا کیونکہ نقد سود کے حرام ہونے پر صحابہ کا اجماع ہے۔ چنانچہ میزان شعرانی میں ہے اجمعوا علیٰ ان الاعیان المنصوصة علی تحریم الربوٰ فیها الذهب والفضة والبر والشعیر والتمر والملح اذا علمت ذٰلك فقد اجمع المسلمون کلهم علی

انہ لا یجوز بیع الذھب بالذھب منفرداً والورق بالورق منفرداً الا مثلا بمثل وزنا بوزن یدا بید ویحرم النسیئۃ۔ غرض مستدل کا یہ خیال تو بالکل غلط ہے کہ نقد سود کے حرام ہونے میں یا نقد سود کی حرمت کی چیزوں میں حضرت عمرؓ یا کسی اور صحابی کو کچھ اشتباہ تھا۔ یا نقد سود کے حرام ہونے یا حرمت کی اشیاء کو حضرت عمرؓ اسی سبب سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت نہ کر سکے کہ ربٰو کی آیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں نازل ہوئی۔ مستدل کا یہ خیال ہے کہ احادیث حرمت ربٰو سے تو یہ ثابت ہوا کہ سونے۔ چاندی۔ گیہوں۔ جو۔ کھجور اور نمک میں سے ہر ایک کو اسی کی جنس سے ادھار اور کمی بیشی کے ساتھ بیچنا یا بدلنا ناجائز اور حرام ہے۔ اب یہ ایک ظاہر بات ہے کہ صحابہؓ کے ایک انبوہ کی روایتوں سے نتیجہ متذکرہ کا نکالنا اور پھر یہ خیال کرنا کہ صحابہ کو نقد سود کے حرام ہونے میں اشتباہ تھا یا یہ خیال کرنا کہ سود کی آیت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانۂ عمر میں نازل ہوئی۔ اس لئے اصل سود کی حرمت صحابہؓ میں نہیں پھیلی ایک غلط خیال ہے۔ ہاں سود کی بعض بعض جزئیات میں بعض صحابہ کو اشتباہ تھا لیکن جب انہوں نے دوسرے صحابہؓ سے اس اشتباہی مسئلہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سن لیں تو انکا وہ اشتباہ جاتا رہا۔ مثلاً عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ کا قصہ اوپر گذر چکا ہے اس قصہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ اور معاویہؓ کی نسبت حضرت عمرؓ کو سود کے مسئلہ میں جزئیات کا زیادہ علم تھا۔ اسی واسطے انہوں نے عبادہ ابن الصامت کی حدیث کی تائید کی ہے اور معاویہ کی رائے کو غلط ٹھہرایا ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ یہ مجوزین سود حضرت عمرؓ کے متذکرہ بالا قول کو اس غرض سے جو اپنی کتابوں میں نقل کرتے ہیں کہ اس سے سود کی حرمت میں اشتباہ نکالیں۔ اور یہ کہیں کہ حضرت عمرؓ کو بھی سود کی حرمت میں اشتباہ تھا وہ لوگ بڑی غلطی پر ہیں۔ کیونکہ حضرت عمرؓ تو سود کے مسئلہ میں اشتباہ سے اتنے دور تھے کہ جن لین دین

میں سود کا اشتباہ بھی ہو اسے بھی چھوڑ دینے کا حکم دیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا قول
صحیح حدیث کے موافق ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری و مسلمؒ میں نعمان بن بشیر کی روایت
سے ہے جس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ حلال و حرام یہ دونوں چیزیں
تو ایسی ہیں کہ جنکے احکام صاف صاف ہیں مگر مشتبہ چیزوں سے انسان کو بچنا چاہیئے۔
کیونکہ مشتبہ چیزوں کے عمل میں لانے سے حرام کی حد کے اندر رفتہ رفتہ پہنچ جانے کا خوف
ہے۔ مشتبہ وہ چیز ہے جس کے حلال یا حرام ہونے کی شریعت میں تصریح حاصل مطلب
یہ ہے کہ جو آدمی مکروہ سے نہ بچے اُس کا قدم آہستہ آہستہ حرام کی حد تک پہنچ جاتا
ہے اور جو شخص مشتبہ چیز کو عمل میں لاتا ہے وہ آخر مکروہ کی حد میں گھس جاتا ہے۔
مجوزین اور مصرین سود کے فی مابین سود کے حلال و حرام ہونے کی جو بحث تھی
وہ گویا اسی طرح طے ہوئی کہ مجوزین نے تو نقد سود کی حرمت کو تسلیم کر کے فرقہ سود خوار
کو سود کھانے پر اس طرح بے بس اور مجبور ٹھہرایا جس طرح قریب المرگ بھوکے شخص کو
مجبوری کی حالت میں بقدر سدّ رمق حرام چیزوں کے کھانے کی شریعت میں اجازت ہے
لیکن ان لوگوں کا یہ عذر ایسا ہے جیسے کوئی مالدار شخص ہر طرح کی حلال چیزوں کے کھانے
پر قادر ہو اور پھر مردار جانور کا گوشت کھانے کی عادت ڈال لے اور کوئی آدمی اس
سے مردار جانور کا گوشت کھانے کا سبب پوچھے تو وہ کہے کہ حلال چیزوں کے خریدنے
اور پکوانے کی تکلیف کون اُٹھائے۔ اسلئے مردار جانور کا گوشت اس بے بسی کی حالت
میں مجھ کو جائز ہے۔ یہ سود خوار فرقہ کے لوگ ہزارہا روپیہ کے مالک ہوتے ہیں جن روپوں
سے ہر طرح کی حلال تجارت کا موقع ان کو حاصل ہے مگر اس مردار خوار شخص کی طرح کاروبار
تجارت کی تکالیف سے بچکر سود خوار بن گئے ہیں اور اس مردار خوار شخص کی طرح زبردستی
سُود خواری کے لئے اپنے آپ کو بے بس قرار دیتے ہیں جو قرار داد بالکل خلاف عقل و نقل
ہے۔ اس لئے بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کے حق میں سُود کی حرمت ثابت اور ان کا عذر

لنگ بالکل غیر ثابت ہے ؞

(۹) بعض لوگوں نے نقد سود کی حرمت کو تسلیم کرکے کہا ہے کہ اس سے تخصیص کرنا قرآن کا ساتھ خبر واحد کے لازم ہوگا۔ ان لوگوں میں سب سے بڑے سرسید احمد خاں علی گڑھی ہیں "

سو اس کے رد میں مستدل کا اپنا بیان ہی کافی ہے کیونکہ اسکے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جو حدیثیں اجمال آیت کو رفع کرتی ہیں ان کو آئمۂ اربعہ نے خبر واحد نہیں ٹھہرایا بلکہ ان احادیث کو مان کر انہیں آیت کا بیان اور آیت کی تفسیر قرار دیا ہے۔ اور اِن حدیثوں میں جن اشیاء کا ذکر تھا ان اشیاء کی حالت پر غور کرکے سود کے اسباب حرمت پر طرح طرح سے بحث کی ہے۔ ان لوگوں کی طرح اگر آئمۂ اربعہ بھی ان احادیث کو خبر احاد سمجھتے تو پھر مذکورہ بالا بحث کیونکر پیدا ہوتی۔ کتب فقہ میں بیع کی تعریف مبادلۃ المال بالمال لکھی ہے اور ربٰوا کی تعریف الفضل الخالی عن العوض۔ ان دونوں تعریفوں سے بیع اور ربٰوا میں جو فرق ہے وہ ہر ایک شخص کی سمجھ میں اچھی طرح آسکتا ہے۔ کیونکہ سودخوار شخص جو روپیہ قرض لینے والے شخص کو قرض دیتا ہے وہ تو مدت قرض پر کوڑی کوڑی واپس آجاتا ہے آخر کو زر سود خالی عن العوض رہ جاتا ہے۔ بخلاف بیع کے کہ اس میں بیع شدہ چیز بائع کی ملک سے نکل کر ہمیشہ کے لئے مشتری کی ملک میں چلی جاتی ہے بعض جہال نے بیع اور سود کے مابہ الامتیاز سے جو انکار کیا ہے سو یہ انکی نافہمی کا نتیجہ ہے اسی طرح بعض نے مدت قرضہ کو سود کا معاوضہ جو ٹھہرایا ہے تو وہ جمہور فقہاء کے برخلاف ہونے کے علاوہ انکی کوتاہ نظری اور کج فہمی کا نتیجہ ہے کیونکہ نہ مدت قرضہ مالیت کی چیز ہے اور نہ ہی اسپر مبادلۃ المال بالمال کی تعریف صادق آتی ہے۔ علاوہ اس کے مدت تو سود در سود میں بھی موجود ہے پھر وہاں مدت کو سود کا معاوضہ کیوں نہیں ٹھہرایا جاتا ؞

مذکورہ بالا عبارات سے واضح ہو سکتا ہے کہ مجوزین سود نہایت بے سروپا اور خلاف اصول شریعت جواز کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ کوئی قابل اطمینان حجت ان کے ہاتھ میں نہیں۔ بعض مغربی اصول اقتصادیات اور ہوائے زرپرستی کی دھن میں نصوص شریعت میں بے جا دست اندازی کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ لوگ حرمت سود کی حکمت اور مصلحت میں غور کرتے تو اس قسم کی بے اعتدالیاں ان سے صادر نہ ہوتیں۔ کسی چیز کی حلت و حرمت شریعت کا ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں قطعی حجت کی ضرورت ہے۔ جس امر کی حلت و حرمت کے متعلق نصوص موجود ہوں اسکے متعلق کسی قسم کا اجتہاد کام نہیں دے سکتا۔ حرمت سود کے بارہ میں ایسے آیات و احادیث موجود ہیں جو قطعی فیصلہ کے لئے کافی ہیں مگر وہ لوگ جو موجودہ اقتصادیات کے زیر اثر آچکے ہیں وہ ان نصوص کو حجت تسلیم کرنے میں ہچکچاتے ہیں۔ یہ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ سود ہر حالت میں حرام مطلق ہے اور اس کی حرمت اس مصلحت شرعی پر مبنی ہے کہ اسلامی اخوت اور ہمدردی کا سلسلہ مسلمانوں میں منقطع نہ ہونے پائے۔ جس کو مسلمانوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے عام طور پر متروک العمل بنا دیا ہے۔ ہمیں تجربہ و مشاہدہ سے معلوم ہے کہ عموماً اہل اسلام حکم شریعت کے برخلاف معاملات میں لین دین کرتے ہیں۔ مگر شریعت کی اس بڑی مصلحت کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس کو نظر انداز کرنے سے کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسلام نے بروجہ حلال زرطلبی کی اجازت تو دی ہے مگر کفار کی طرح زرپرستی روا نہیں رکھا۔ سودخواری تو زرپرستی ہے نہ زرطلبی۔ سودخوار لوگ عموماً مفصلہ ذیل مفاسد کا موجب بنتے ہیں۔ اوّل خود غرضی جس میں وہ بسا اوقات مدیون پر ایسا ظلم و ستم کرتے ہیں جسکی اجازت انسانی ہمدردی نہیں دیتی۔ دوم توکل کو (جسکے معنی یہ ہیں کہ کوشش کے ساتھ اپنے خالق حقیقی کے ارادہ کے تابع ہو کر تمام امور کو اسکی مشیئت پر موقوف کیا جائے) بالکلیت ترک کر دیتے ہیں۔ کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ہمیں یا منفعت

یا سالانہ معین رقم وصول ہو جایا کرے گی اور اس یقین پر وہ مشیت خداوندی کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ سوم اصول تمدن و معاشرت کے رو سے یہ لوگ مفت خوار بلکہ انسانی ہیئت اجتماعی یا سوسائٹی کے لئے کچھ مفید نہیں ہو سکتے۔ چہارم یہ لوگ پرلے درجے کے ڈرپوک۔ بزدل حریص اور بخیل ہو کر نہ تو خود اپنی کمائی ہوئی دولت سے مستفید ہوتے ہیں نہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ بلکہ جوں جوں انکی دولت میں زیادتی ہوتی جاتی ہے یہ اخلاق ذمیمہ ان میں اور بھی ترقی کرتے جاتے ہیں۔ پنجم انسانی جماعت میں نہایت ذلت اور حقارت اور [illegible] کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ کیونکہ سود خواری بے مروتی کی جڑ ہے اور بے مروت شخص کبھی دنیا میں عزت نہیں پا سکتا۔ ان مفاسد کے علاوہ اور بھی بہت سی اخلاقی برائیاں سود خواری میں پائی جاتی ہیں۔ جو اکثر اوقات سود خوار کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہیں؂

یہ خیال کہ حالات حاضرہ میں مسلمان بجز سود خواری کے دولت نہیں کما سکتے۔ جیسا کہ بعض ناواقفوں کا خیال ہے۔ سخت ناہنجارانہ خیال ہے۔ جس کو ایک آن کے لئے بھی قابل التفات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ موجودہ حالات میں سود خواری سے بچ کر معاملات تجارتی کے سرانجام دینے میں کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ وہ مشکلات بھی صرف شریعت حقہ کے احکام کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہیں۔ عام طور پر مسلمان لوگ خلاف شرع امور میں بڑے بڑے قرضہ کے زیر بار ہوتے ہیں۔ جس سے وہ بالکل مفلوک الحال ہو جاتے ہیں۔ سو اس سے شریعت حقہ پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا بلکہ یہ انکی اپنی بے اعتدالی کا نتیجہ ہے؂

بینک سود چونکہ صریح سود ہے اس لئے قطعاً حرام ہے۔ علمائے شریعت نے اس کے جواز کا فتوے نہیں دیا۔ ہاں بعض اصحاب نے جائز رکھا ہے۔

کہ اگر روپے کی حفاظت بینک کے سوا نہ ہو سکے تو وصول شدہ سود مسکینوں اور محتاجوں کو دیدیا جائے اور خود ذاتی مصارف میں صرف کرنے سے پرہیز کی جائے۔ بینکوں کے عام ہو جانے سے دنیا میں کوئی ایسی سلطنت نہیں جو کروڑوں پونڈ کی مقروض نہ ہو *

بیمۂ زندگی کی حرمت

بیمۂ زندگی میں بھی چونکہ صحیح طور پر سود خواری کا مرتکب ہونا لازم آتا ہے اس لئے قطعاً حرام ہے۔ علاوہ ازیں اس معاملہ میں غرر لازم آتا ہے یعنی احد الجانبین کو ہرگز وثوق نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے مفاد کو حاصل کر سکیگا۔ مثلاً زید جو بیمۂ زندگی کی کمپنی میں شریک ہوتا ہے اگر تاریخ داخلہ سے دوسرے دن ہی مر جائے تو کمپنی اپنے قواعد کے مطابق پابند ہوگی کہ زید کے ورثا کو وہ رقم معینہ جو ڈاکٹر کے سارٹیفیکیٹ سے معین تعداد سالوں میں پوری ہونی چاہیئے تھی پوری کردے گویا کمپنی دھوکا میں رہی اور اس کو خسارہ اٹھانا پڑا۔ اور اگر کمپنی کا دیوالہ نکل جائے تو زید کو اپنے روپے سے ہاتھ دھونے پڑینگے۔ اس صورت میں زید کو دھوکا لگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ بیمہ کمپنی کی بنا ایک گونہ قمار بازی پر ہے اور قمار بازی کے حرام ہونے کی علت بھی غرر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیع کی بعض صورتیں جن میں انکل پچو محض ظن و گمان پر لین دین ہوتا ہے حرام قرار دی گئی ہیں *

یہاں یہ خیال صحیح نہیں ہوگا کہ بیمہ کمپنی کے قواعد ہی ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں کمپنی یا شریک کمپنی کو احتمال غرر کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اکثریہ حالت سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ اس لئے احتمال جانب مخالف بدستور قائم ہے۔ لہذا بیمہ زندگی وغیرہ کرانا از روئے شریعت حرام قطعی ہے۔ واالعلم عند اللہ تعالے *

لاٹری

لاٹری جس کا لوگوں میں بلالحاظ شریعت مغربی ممالک کی تقلید میں ایک عام رواج ہو گیا ہے ایک قسم کی قمار بازی ہے اور جس علت پر

یہ زندگی شرعاً ممنوع ہے۔ اسی علت پر لاٹری شرعاً ناجائز ہے۔ قرآن مجید میں میسر یعنی قمار بازی کو بنص صریح حرام قرار دیا گیا ہے۔ افسوس کہ مسلمان عام طور پر اس طریق قمار کی ممنوعیت سے غافل رہ کر زر و مال کے لالچ میں مبتلا ہو جاتے ہیں ہر ایک مسلمان کو حکم شریعت کو ملحوظ رکھے بغیر کسی قسم کا ناجائز مال حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔ مگر جو لوگ حکم شریعت کی پروا نہیں کرتے انہیں ہمارا لاٹری کو ممنوع قرار دینا ضرور ناگوار گذرے گا۔ مگر ہم انہیں کہتے ہیں کہ تمہاری حالت شعر ذیل کا مصداق ہے ؎

چوں سگِ درندہ گوشت یافت نپرسد
کایں شترِ صالح است یا خرِ دجّال

عورتوں کے لئے حکمِ پردہ

حکم پردہ کے متعلق اسلام پاک میں جو کچھ وارد ہے اس سے سب مسلمان واقف ہیں۔ پردہ کوئی ایسا حکم نہیں جس کے سمجھنے میں کچھ دقت ہو اور جس کی ضرورت پر بحث کرنے کیلئے ہمیں بہت سے دلائل و نظائر کا مجموعہ بہم پہنچانا پڑے ملک کے موافق و مخالف لوگوں نے گاہ و بیگاہ اس پر اپنا اپنا زورِ طبیعت دکھایا ہے اور ہر ایک نے جو کچھ لکھا ہے اپنے خیال میں درست و صحیح لکھا ہے ؎

وللناس فیما یعشقون مذاہبؑ

مجھے اس موضوع پر بحث کرنا چنداں ضروری نظر نہیں آتا تھا کیونکہ اس کے متعلق ایک مُلّا کا جو مذہب ہو سکتا ہے وہ پُرظاہر ہے مگر بعض اصحاب نے مجھے

ؑ لوگ اپنے مرغوبات کے پیچھے لگا کرتے ہیں ۱۲ منہ

بار بار استدعا کی ہے اور نیز بعض ان اصحاب کی غلط فہمی کا رفع کرنا ضروری نظر آیا تھا جو پردہ کی عدم ضرورت کو قرآن مجید اور احادیث سے ثابت کرنے کی جرأت کر بیٹھتے ہیں۔ اس لئے ذیل میں اس موضوع کے متعلق صرف آیات اللہ و احادیث نبویہ سے استدلال کر کے امر حق کو واضح کیا جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ اصل مسئلہ کو زیر بحث لایا جائے۔ مفصلہ ذیل چند امور میں غور کر لینا ضروری ہے:-

(۱) جو لوگ پردہ کی عدم ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ ان میں آج تک ایک بھی ایسا نہیں ملا جو قرآن و سنّت کا کافی علم رکھتا ہو بلکہ ان کا مبلغ علم مغربی اقوام کے تمدنی نظارت سے آگے تجاوز نہیں کر سکتا اور اگر کسی نے آیات قرآنیہ سے کبھی استدلال بھی کیا ہے تو غلط ‎:

(۲) ان لوگوں نے اصطلاح حکم پردہ کی بجائے رسم پردہ کا لفظ اپنی تحریروں میں برتنا شروع کر دیا جس سے ان کی ایک بڑی چالاکی کا ثبوت ملتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عوام الناس کو یہ دھوکا دیا گیا ہے کہ پردہ حکم شرعی نہیں بلکہ محض ایک ملکی رسم ہے اور ملکی رسوم بضرورت زمانہ بدلتی رہتی ہیں۔ چنانچہ علیگڈھ کانفرنس کے ایک نیچری صدر مجلس نے ایک دفعہ نہایت بے باکانہ اور گستاخانہ تقریر میں بعض اکابر دین کی ہتک اس لغو خیال سے کی تھی کہ انہوں نے محض سلاطین کی خوشامد سے بعض امور پر مذہبی رنگ چڑھا کر عوام الناس میں رائج کیا۔ چنانچہ بعض مغربی مؤرخین کے اقوال سے اس نے اپنے اس دعوی کو ہم مشربوں میں پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا تھا اور بالآخر حکم پردہ بھی اس نے ایسا ہی ثابت کیا ‎:

---

[1] اسی طرح ایک دفعہ ایک نیچری صدر مجلس نے جوش میں آکر یہ کہا تھا کہ اسلامی شریعت کا تمام ذخیرہ کتب بجز قرآن مجید کے دریا میں ڈبو دینے کے قابل ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ نیچری اور قرآن شریف کی اس قدر عزت۔ بارے الحمد للہ کہ قرآن مجید کو تو مستثنے لیا۔ ما را ازیں گیاہ ضعیف این گمان نبود مگر سوال یہ ہے کہ اس ذریعہ دین کی رائے پر اگر عمل کیا بھی جائے تو پھر بھی قرآن شریف سمجھانے کے لئے علماء ہی کی ضرورت پڑیگی نہ نیچری کی اور پھر وہی بات پیش آئیگی جو پہلے تھی ۱۲ منہ

(۳) نیچریہ کا یہ دستور ہے کہ اوّل تو وہ احکام شریعت کی ضرورت کو تسلیم ہی نہیں کرتے اور اگر بعض میں انہیں اتفاق ہو بھی تو ان کو اسی حد تک مسلم رکھتے ہیں کہ ان کے اُصول تمدن و معاشرت میں وہ احکام مفید ہوں ورنہ بمقابلہ ضرورت زمانہ انہیں اللہ اور اللہ کے رسوؐل کی شریعت کا اصلا پاس نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت یہ نہیں چاہتے کہ اپنی ضروریات کو بمقتضائے شریعت پورا کریں بلکہ شریعت کو اپنی ضروریات کا تابع بنانا چاہتے ہیں ؛

(۴) واضح ہو کہ جن نیچریوں نے دربارہ حکم پردہ قرآن مجید کی مخالفت کی ہے ان کے دلائل کا ماخذ صرف مغربی اقوام کا تمدن اور قوانین سیاست ہے جو بالکلیت منافی شریعت اور مخالف تعلیم قرآن ہیں اور جہاں تک میں نے ان لوگوں کے دلائل کا تتبع کیا ہے بجز نفس پرستی کے کچھ نظر نہیں آیا۔ ان کے بڑے بڑے دلائل حسب ذیل ہیں :-

(ا) مرد اور عورت کو فطرت نے بلا امتیاز یکساں حقوق عطا کئے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ مرد تو بلا روک ٹوک باغ و بوستاں کی سیر کریں اور عورتیں جیل (گھر) میں محبوس رکھی جائیں ؛

(ب) مستورات کو اس طرح مقید رکھنا اُصول صحت کے برخلاف ہے ؛

(ج) انسان کو خدا نے چند قوےٰ دئے ہیں جن میں قدرتی طور پر ترقی کرنے کی قابلیت ہے۔ پردہ سے مستورات کے قوےٰ جسمانی ترقی نہیں کر سکتے گویا قدرت کے جائز حقوق سے انہیں محروم رکھا جاتا ہے ؛

(د) مستورات اولاد کی معلم ہوا کرتی ہیں جب ان کی اپنی ذاتی حالت ناقص ہوگی تو اولاد کی تربیت کما ینبغی نہیں ہو سکے گی ؛

مذکورہ بالا دلائل خلاصہ ہیں ان مبسوط تقریروں کا جو ان لوگوں کی طرف سے آج تک شائع ہو چکی ہیں اور ممکن ہے کہ کچھ اور بھی دلائل ہوں مگر غالباً وہ انہیں میں سے کسی

ایک کی فرع ہونگے اور قریبًا یہی دلائل ہیں جنہیں مجوزہ تعلیم نسواں کے بارہ میں پیش کیا کرتے ہیں ٭

یہ دلائل ممکن ہے کہ کسی قدر ان اشخاص کو خوش کرسکیں جو اسلامی احکام کے مصالح سے بلکل ناآشنا ہیں اور جنہوں نے تہذیب کا مفہوم محض ظاہری وضعداری تک محدود سمجھ رکھا ہے۔ مگر ایک ایسا شخص جس نے احکام شریعت کے باریک مسائل تک اپنی نگاہ دوڑائی ہو اور کورانہ تقلید کے پھندوں سے بچ نکلا ہو ہرگز ایک آن کے لئے بھی ان دلائل کو سننا گوارا نہیں کریگا۔ کیونکہ یہ محض سطحی باتیں ہیں جن کی تہ میں کوئی معتدبہ نتیجہ مضمر نہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلامی شریعت کے احکام کا یہ ذاتی خاصہ ہے کہ اس میں تمام احکام کی بنا دینی اور دنیوی مصلحتوں پر قائم کیگئی ہے۔ جن احکام کی ضرورت ایسی مضبوط تھی کہ بدون تعلیم وحی ان میں راستی کا تجویز کرنا ناممکن تھا انکا خود تعلیم وحی اور سنت رسولؐ نے فیصلہ کردیا اور جن احکام جزئیہ کا باقتضائے ضرورت زمانہ بذریعہ اجتہاد نافذ ہونا متصور تھا ان کو علمائے رَاسِخُونَ فِی الْعِلْمِ کے اجتہاد پر موقوف رکھا گیا۔ پس اس اصل کو ہمیشہ بطور قاعدہ کلیہ کے ہر دو اقسام احکام کے لئے معیار کلی سمجھنا چاہیئے۔ ایک خالص الاعتقاد و العمل مسلمان کا ہرگز یہ شیوہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ بمقابلہ نص کتاب اللہ یا نص حدیث کے کسی امر کو محض مصلحت وقتی کی بنا پر طے کرنے لگ جائے۔ مگر افسوس کہ ہمارے اس ناہنجار زمانہ میں یہ مرض عام طور پر پھیل چکا ہے۔ کئی ایک احکام ایسے ہیں جنکی نسبت شریعتِ اسلامی قطعی فیصلہ دے چکی ہے۔ مگر ہمارے اکثر بے لگام نوخیزوں نے عمدًا انکی مخالفت کا ذمہ لے رکھا ہے۔ جب وجہ دریافت کی جائے تو جواب ملتا ہے کہ موجودہ تہذیب کی ضرورتوں کا حلقہ بہت وسیع ہوگیا ہے۔ اور سوسائٹی کی وضع ہی ایسے حالات کی متقضی ہے کیونکہ بدون اسکے قوم کسی قسم کی ترقی نہیں کرسکتی۔ الغرض ان لوگوں نے دین

کی صورت کو ایسا مسخ کرڈالا ہے کہ پناہ بخدا۔ اور چونکہ وہ علمائے اُمت کو اپنے گندہ اور ناپاک خیالات کا سراسر مخالف دیکھتے ہیں اسلئے انواع و اقسام کے بُرے الفاظ سے ان کی ہتک کرنا اپنی عزت اور فخر سمجھتے ہیں اور جس قدر برائیاں انکے اپنے افعال قبیحہ سے قوم میں پھیل رہی ہیں انکا الزام علمائے کرام کے سر تھوپ دیتے ہیں ؀

مذکورہ بالا دلائل کا رَدّ

(۱) یہ خیال کہ مرد اور عورت کی فطرت یکساں ہے اس لئے انہیں پورے وہی حقوق حاصل ہیں جو مرد کو نہ از اصول فطرۃ استدلال سے صحیح ہے اور نہ تعلیم قرآن کے رُو سے۔ ہم نے اس موضوع پر اسی کتاب میں ایک مضمون بعنوان حقوق الرّجال و النّسا ، ایک مستقل باب کی صورت میں لکھا ہے۔ ناظرین وہاں اس کا مفصلاً مطالعہ کریں۔ مع ہٰذا اسلام پاک نے کہیں حکم نہیں دیا کہ عورتیں باغ کی سیر نہ کریں۔ اگر عورتیں کسی اجنبی مرد کی نظر سے محفوظ رہیں تو کوئی ممانعت نہیں ؀

(ب) اگر اصول صحت کا مفہوم یہی ہے کہ عورتیں آزادانہ طور پر تھیٹروں میں جائیں اور بلا اجازت شوہر جہاں چاہیں سفر کریں اور گارڈن پارٹیوں اور دیگر جلسوں میں دوش بدوش اور زانو بزانو مردوں کے ساتھ بیٹھیں اور دفاتر میں کلارکی کا کام کریں اور مسز اینی بیسنٹ کی طرح ملک بہ ملک لکچر بازی کرتی پھریں تو اس کی بجائے زیادہ موزوں و مناسب ہوگا کہ شہر بشہر رنڈیوں کے چکلوں کی تعداد زیادہ کر دیجائے کیونکہ تجربہ و مشاہدہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ایسی مہذب عورتوں اور رنڈیوں میں صرف اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ رنڈیاں ہر ایک سے جو ان کے ہاں جائے ہم بستر ہو لیتی ہیں اور یہ مہذب عورتیں اپنی حسب مرضی کسی مہذب جنٹلمین سے مُنہ کالا کرتی ہیں۔ ہم نے آج تک نہیں سُنا کہ ہندوستان کی مستورات بوجہ پردہ نشینی کے بیمار ہو گئیں۔ کیا معترضین کو یہ معلوم نہیں کہ مرد اور عورت کے قویٰ اور اعضاء میں ایک نمایاں تفاوت نظر آتا ہے اور اس لئے حکمت الٰہی نے

عورتوں کے طبائع اور امزجہ کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے روزمرہ کا دو
بلی کے رُو سے اپنا وہ اندازہ صحت قائم رکھ سکتی ہیں جسکی ان کو ضرورت ہے۔ لیکن
ہے کہ عورتوں کے مزاج اور لوازم مزاج کو مردوں کے مزاج اور لوازم مزاج پر قیاس
انہیں بھی مردوں کی روش پر چلایا جائے۔ محض احتمال پیدا کرنا تو مثبت دعویٰ نہیں
جب تک کوئی یقینی دلیل پیش نہ کی جائے۔ اور ہم صاف کہتے ہیں اور نہایت وثوق سے
کہ پردہ نشین مستورات پردہ نشینی سے کبھی بھی بیمار نہیں ہوئیں کیونکہ جب پردہ نشینی کا نتیجہ
کوئی بیماری ہو سکتی ہے تو وہ اسلام پاک نے تعلیم نہیں دی۔ یہ لوگ خواہ مخواہ اس کو
مہیب شکل میں ظاہر کر رہے ہیں جس سے صرف لفظ پروری مدنظر ہے نہ تحقیق حق
افسوس کہ معترضین ایک جسمانی بیماری کے محض احتمال کو جس کی کوئی قوی اصل نہیں
بمقابلہ کئی ایک روحانی بیماریوں کے کس قدر زیادہ قابل لحاظ خیال کرتے ہیں۔ او
بالفرض اگر ہم مان بھی لیں کہ پردہ مضر صحت جسمانی ہے تو اس کے مقابل میں ہم کہہ
سکتے ہیں کہ بے پردگی مضر صحت رُوحانی ہے جو صحت جسمانی کی نسبت زیادہ قا
وقعت ہے۔ اب چونکہ (بصورت تسلیم قول مخالف) ہر دو صورت میں ضرر متصو
ہے۔ اس لئے ان میں سے جو آسان اور کم مضر صورت ہوگی ہم اسے اختیار کر
بحکم اِذَا بُلِيتُمْ بِبَلِيَّتَيْنِ فَاخْتَارُوا اَهْوَنَهُمَا (جب دو بلاؤں میں گرفتا
ہو جاؤ تو آسان کو اختیار کر لو) ہر عقلمند آدمی خود اندازہ لگا سکتا ہے کہ ہر دو
قسم کی خرابی میں سے کونسی صورت آسان اور قابل عمل ہے۔ پردہ کی اس نہا
ہی خفیف اور ناقابل اعتبار تکلیف کو بمقابلہ دیگر بیشمار اخلاقی اور تمدنی خرابیو
ملحوظ رکھنے کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ بارش کا ہونا
امر ہے کیونکہ زید چلتے چلتے بازار میں پھسل پڑا یا فلاں شخص کا مکان گر گیا
عاقل سمجھ سکتا ہے کہ یہ بیوقوف معترض ایک صورت میں دُنیا کی تباہی کی

...ے مگر ہم تو سرے سے اس خفیف تکلیف کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے کہا
...ذات بہ المشاهدۃ ؛
اس اعتراض کی کیفیت کا ہم یوں بھی امتحان کر سکتے ہیں کہ کس قدر مرد ایسے
...جنہیں باغ و بوستان کی سیر نصیب ہوتی ہے اور پھر فیصدی کس قدر ایسے ہیں۔
...غ و بوستان کی سیر نہ کرنے سے انواع و اقسام کی جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے
...نکہ ہم اپنے ذاتی تجربہ سے جانتے ہیں کہ عوام الناس کی صحت امرا کی نسبت
...ا زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ افسوس کہ معترضین اتنا بھی نہیں سمجھے کہ صحت جسمانی
...روحانی کا مدار حسن تربیت پر ہے۔ چنانچہ جن خاندانوں میں حسن تربیت کو ملحوظ
...ا جاتا ہے۔ ان کے عام حالات جسمانی اور روحانی پہلو میں زیادہ قابل قدر...
...اول تو ایسے خاندان ہی کم ہوتے ہیں اور جو ہیں وہ بپابندی احکام شریعت
...ب جائز نعمت سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ یہ کیا ضرور ہے کہ مستورات شرم و
...ا برقع چہرہ سے اُتار کر فٹن میں سوار بازاروں اور باغوں کی سیر کرتی پھریں؟
...رج م یہ خیال کہ علم پردہ کی پابندی سے مستورات کے قوٰے کو ترقی کا موقع
...ں ملتا اس لئے وہ اپنے جائز حقوق سے محروم رکھی جاتی ہیں۔ معترضین کی
...فیت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ یہ بات بالخصوص اسلام پاک ہی سے مخصوص ہے
...س نے بلا امتیاز مرد و زن ہر ایک کو تدبر و تفکر کی تعلیم دی ہے۔ قوٰے کو
...لے مقتضائے طبعی پر لگانا اسلام کا منشاء ہے مگر ہاں جس صورت میں چند
...یاں قباحتیں نظر آتی ہوں اسلام ان کی کبھی بھی اجازت نہیں دے گا
...طری سے صحیح طور پر کام لینا حُسنِ تربیت اور تعلیم کا نتیجہ ہے مگر وہی تربیت
...یم جس میں کسی حکم شرعی کا نقض لازم نہیں آتا۔ افسوس یہ ہے کہ معترض اگر
...مل تربیت و تعلیم کی ضرورت پر زور دیتا اور ان کے عملی نتائج پر آگاہ ہوتا تو حکم

پردہ کی مخالفت پر کبھی آمادہ نہ ہوتا۔ کون کہتا ہے کہ حکم پردہ کی پابندی کے ساتھ تعلیم و تربیت کے اصول پر کاربند ہونا ناممکن ہے؟ ملک کا مجوزہ طریق تعلیم و تربیت جس میں عورت و مرد کے لئے کسی ضروری حد فاصل کو ہرگز ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ اور جس کی نسبت مجوزین بار بار زور دے رہے ہیں کہ عام طور پر اس کو مسلمانوں میں رواج دیا جائے صرف انہیں اقوام کی عورتوں کے لئے مفید ہو تو ہو جو شریعت اسلامی کی پابند نہیں ورنہ اہلِ اسلام کے لئے تو زہر قاتل سے کم نہیں۔ مع ہذا ہم آئے دن اس بد طریق کے ضروری نتائج قبیحہ کو سنتے سنتے یقین کر چکے ہیں کہ باوجود ان نتائج سے آگاہ ہونے کے حضرات مجوزین کو بالعموم یہ مد نظر ہے کہ مطلقاً مذہبی قیود کو اٹھا دیا جائے۔ چنانچہ اس امر کی پیش رفت کے لئے مختلف حیلہ سازیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ بعض حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ اب قیود مذہب میں جکڑا رہنے کا زمانہ نہیں رہا اور بعض دبی زبان سے محض نفس احکام کا اقرار تو کرتے ہیں مگر نہایت فرومائیگی اور جہالت سے آیات و احادیث کے الفاظ میں ایسے طور پر تصرف کرتے ہیں کہ ان سے اپنا مطلب پورا کر لیتے ہیں مگر حق وہی ہے جس کو اہل ایمان و خیر قہ پیش کرتے ہیں ؛

(د) اس میں کچھ شک نہیں کہ مستورات شریف خاندانوں میں بچہ کی تربیت ابتدا دس بارہ برس تک مکمل کر دیتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ کی طبیعت میں کسی قسم کے فرومایانہ خیالات جمنے نہیں پاتے۔ وہ اس اثنا میں علمی تعلیم کو نہایت ہی آسانی سے قبول کر سکتا ہے اور قریباً آداب گفتگو اور نشست و برخاست اور اکل و شرب کے متعلق لوازم سلیقہ شعاری کا پورا پورا عادی ہو جاتا ہے۔ مگر ناظرین یہ یاد رکھیں کہ اس قسم کی تربیت بجز ذی وجاہت خاندانوں کے ممکن نہیں۔ کیونکہ عوام الناس پہلے ہی سے خود تعلیم و تربیت سے محروم ہوتے ہیں اسلئے ان کی اولاد میں امراء کی اولاد کا ہرگز مقابلہ

نہیں کرسکتیں۔ مگر ہمارے ملک میں تو اسرار کی اولاد بھی شاذ و نادر ہی تربیت یافتہ ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ والدین کی ابتدائی تربیت بچے کے قوٰی دماغی کی باضابطہ ترقی کی عالیشان عمارت کے لئے بنیادی پتھر ہوتا ہے۔ مگر اس کا التزام بہت کم لوگ کرسکتے ہیں اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ مائیں خود تربیت یافتہ نہیں ہوتیں۔ پس معترض کا اعتراض تو بالکل درست اور صحیح ہے مگر اعتراض کا منشا محض غلط۔ کیونکہ معترض کا اعتراض صرف حسن تربیت کی ضرورت پر مبنی ہے جس کو حکم پردہ کی عدم ضرورت سے ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ یہ مسلم ہے کہ جو مائیں قواعد شریعت کے مطابق خود تربیت یافتہ ہونگی وہ اولاد کی تربیت کا نہایت عمدہ انتظام کرسکینگی اور اولاد ذکور کو عامہ معلومات حاصل کرنے کے لئے ان کے باپ بھی بہت کچھ اعانت کرسکتے ہیں اور اناث کی تربیت ابتدائی کے لئے صرف مائیں کافی ہیں اور فن تعلیم کے لئے وہی استانیاں جو قدیم زمانہ سے تعلیم دیتی چلی آتی ہیں۔ اگر اس طریق تعلیم و تربیت کو ملحوظ رکھا جائے تو کچھ شک نہیں کہ ہم حکم پردہ کی پابندی کے باوجود حسن تربیت و تعلیم کے نتائج حسنہ سے بخوبی فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ سید احمد خاں مرحوم جیسے نئی روشنی کے دلدادہ ریفارمر نے بھی اسی رائے کو پسند کیا اور بالآخر یہ کہا کہ اولاد اناث کے لئے اخلاقی۔ مذہبی تعلیم تو ضروری ہے مگر اسی طریق پر جس پر قدیم سے شرفا کاربند ہوتے چلے آتے ہیں۔ ہاں نوعیت تعلیم میں اگر کسی قسم کی ترمیم کردی جائے تو کچھ حرج نہیں۔ مگر اس طریق کی پابندی بعد ذکور کے لئے آجکل مروج ہے ہرگز شایاں نہیں۔ کیونکہ اس میں اگرچہ ایک فوائد ہیں بھی تو ان کے مقابلہ میں بہت سی دیگر نمایاں خرابیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے بجز ایک ناعاقبت اندیش آدمی کے کوئی سمجھدار آدمی اغماض نہیں کرسکتا*

حکم پردہ کی مخالفت کرنے والے اصحاب بعض اوقات اہل حق کے اعتراضات کا یوں رد کیا کرتے ہیں کہ پردہ کے استحکام بنے سے جن برے نتائج اخلاقی و تمدنی کے

پیدا ہونے کی توقع کی جاتی ہے وہ آہستہ آہستہ تہذیب و ترقی کی تکمیل پر خود بخود دفع ہو جائینگے۔ کیونکہ ایسی خرابیوں کا پیدا ہونا تب ہی متصور ہے جبکہ قوم پورے طور پر مہذب نہ ہو مگر مہذب ہونے کے بعد یہ نتائج ہرگز پیدا نہیں ہونگے۔

ممکن ہے کہ اس خیال کی کچھ وقعت ہو مگر ہم بر بنائے تجربہ و مشاہدہ اس کو ایک آن کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جس قسم کی تہذیب کے وجود پر ایسا ہونا باور کیا جاتا ہے اس کا منبع آجکل کا مغربی تمدن ہے جس میں اکثر امور اسلامی شریعت کے رو سے ہر ایک قسم کی ناپاکی اور گندگی کا عملی نمونہ سمجھے جاتے ہیں ایسی متمدن اقوام کی مذہبی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ کیونکہ بجز چند پادریوں کے جنہیں بیش بہا تنخواہیں ملتی ہیں کوئی شخص عیسائیت کا پابند نہیں اور اگر کوئی ہے تو محض بطور فیشن کے۔ اور پادری بھی خوب در روز شراب خواری اور زناکاری میں مصروف اور ہر ایک قسم کی عیش پرستی اور ناہنجاری میں مستغرق پائے جاتے ہیں۔ سائنس اور فلسفہ نے ان اقوام کو خدا کے وجود اور جوابدہی قیامت اور ضرورت نبوت کے بوجھ سے سبکدوش کر دیا ہے۔ فرانس۔ انگلینڈ اور امریکہ وغیرہ ممالک میں فیصدی پانچ آدمی بھی مذہب کے معتقد نہیں ملینگے بلکہ سب کے سب ملحد اور بیدین ہو کر جہنم کی بھرتی ہو چکے ہیں۔ اُن کے گرجا ایک قسم کے تھیٹر ہیں۔ جہاں نوجوان مرد اور عورتیں اپنے اپنے حظوظ نفسانی کی داد دیتے ہیں۔ ان کی اعلے سے اعلے تہذیب یہ ہے کہ ناچ گھر میں ایک شخص کسی اجنبی عورت سے بلا ممانعت لپٹ جاتا ہے اور شوہر دیوث کو اصلاً غیرت نہیں۔ ان میں حرامزادہ اولاد کا دستور روز بروز ترقی پر ہے اور قریباً تمام لوگ اولاد الحرام ہوتے ہیں۔ اگر اس بیان کی تصدیق مطلوب ہو تو ذیل کی عبارات بیں ملاحظہ کرو:۔

انگلستان کی ایک شریف خاتون اپنے ملک کی عورتوں کے متعلق ایک پرچہ میں لکھتی ہے جس کا ترجمہ مصر کے ایک مشہور رسالہ المنار نے شائع کیا تھا:۔

"انگلستان کی عورتیں اپنی تمام عفت و عصمت کھو چکی ہیں اور ان میں بہت سی کم ایسی ہونگی جنہوں نے اپنے دامن عصمت کو حرامکاری کے دھبّہ سے آلودہ نہ کیا ہو ان میں شرم و حیا نام کو بھی نہیں۔ وہ اپنے تمام حالات میں مردوں کے قدم بقدم چلتی ہیں اور ایسی آزادانہ زندگی بسر کرتی ہیں کہ مذہب۔ قانون ملکی۔ رسم و رواج انکی آزادی پر کسی قسم کا اثر نہیں ڈال سکتے۔ اس ناجائز آزادی نے ان کو اس قابل نہیں رہنے دیا کہ انہیں انسانوں کے زمرہ میں شمار کیا جائے۔ ہمیں سرزمین مشرق کی مسلمان خواتین پر رشک آتا ہے جو نہایت دیانت و تقویٰ کے ساتھ اپنے شوہروں کے زیر فرمان رہتی ہیں اور انکی عصمت کا لباس گناہ کے داغ سے ناپاک نہیں ہوتا۔ وہ جس قدر فخر کریں بجا ہے۔ اور اب وہ وقت آرہا ہے کہ اسلامی احکام شریعت کی ترویج سے انگلستانی عورتوں کی عفت کو محفوظ رکھا جائے"

ہندوستان کا ایک ہندو رئیس جس نے حال ہی میں مغربی دُنیا کی سیاحت کر کے اپنے سفرنامہ کے حالات بعض اخبارات میں شائع کئے تھے ملک امریکہ کے متعلق حسب ذیل لکھتا ہے:۔

"غیر ممالک کے ناواقف مسافر کو نہایت احتیاط کرنا چاہیے کہ وہ راستہ میں چلتے وقت کسی عورت سے خواہ وُہ خود استدعا کرتی ہو گفتگو نہ کرے۔ کیونکہ اس ملک میں ایک عام دستور یہ ہے کہ عورتیں نہایت مکلف لباس پہنکر باہر نکلتی ہیں اور کسی شریف اجنبی سے کچھ گفتگو شروع کر دیتی ہیں۔ ناواقف کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایک شریف عورت مجھ سے کچھ دریافت کرنا چاہتی ہے وہ ٹھہر جاتا ہے اتنے میں اس عورت کا خاوند یا کوئی اور شخص جو کسی موقع مناسب پر دیکھ رہا ہوتا ہے غضب آموجود ہوتا ہے اور اس مسافر کو قابو کر لیتا ہے کہ تو نے میری عورت سے کیوں گفتگو کی۔ وہ عورت بھی اُس کی ہمزبان ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس شخص نے مجھ سے امر ناجائز

کی انتہا کی تھی۔ بالآخر معاملہ بڑھ جاتا ہے اور بیچارہ مسافر بیوی اپنی ایک معقول رقم پیش کرنے کے نجات حاصل نہیں کر سکتا

اسی طرح علاقہ دکن کے ایک مشہور رئیس مسلمان نے گزشتہ سالوں میں مغربی ممالک کی سیاحت کے حالات کے متعلق سفرنامہ کی صورت میں کچھ نوٹ شائع کئے تھے۔ انکے ملاحظہ سے اقوام کی تہذیب کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ جس میں فرانس۔ انگلستان۔ امریکہ کے اپنے چشم دید حالات لکھے ہیں جن سے پورا پورا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ قومیں انسانی وضع سے بالکل منسلخ ہو چکی ہیں اور ایسے شرمناک افعال کی مرتکب ہوتی ہیں جنکو دیکھ کر بے حیائی بھی منہ پر پردہ ڈال لیتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جولائی ۱۹۲۸ء میں جب میں ایک موقعہ پر دہلی میں ایک دوست کے مکان پر بیٹھا تھا تو ولایت کا انگریزی اخبار جس کا نام میں بھول چکا ہوں اس دوست کو موصول ہوا۔ اخبار کے مطالعہ پر اس دوست نے مجھے ذیل کا ایک واقعہ پڑھکر سنایا۔ جس کا خلاصہ مجھے اب تک صحیح معنی میں یاد ہے :-

ایڈیٹر اخبار نے لکھا تھا کہ لنڈن کے ہائڈ پارک میں ایک معزز انگریز جو سر کا خطاب بھی پا چکا تھا ایک مہوش نازنین کو کسی درخت کے سایہ تلے لئے پڑا تہذیب مغربی کی داد دے رہا تھا۔ پولیس نے اس تہذیب کے پتلے کی اس بیہودانہ حرکت کو دیکھکر اسے گرفتار کر لیا اور جب مقدمہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا تو مجسٹریٹ نے جو زائد از ضرورت عقل کا کامل نمونہ تھا فیصلہ دیا کہ پولیس اس واقعہ میں قابل سزا ہے کیونکہ اس نے ایک مہذب اور شریف آدمی کی جائز آزادی میں بیجا دست اندازی کی ہے۔ چنانچہ پولیس والوں پر جرمانہ کی سزا عائد کی گئی اور سر مذکور کو بری کر دیا گیا۔ واہ رے تہذیب تیرا کیا کہنا! یہ بعینہ وہی فیصلہ ہے جو کسی پرانے زمانے ایک حاکم کے متعلق میں نے کسی تاریخ کی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک درویش مرد اپنی بیوی کو گھوڑے پر سوار کر کے سفر کر رہا تھا۔ ایک پل پر سے گذرنے کا اسے اتفاق

[...]دیا کا محاصل وصول کرنے والوں نے محصول کا مطالبہ کیا۔ مگر درویش کے پاس [...]نہیں تھا۔ انھوں نے عورت کو زبردستی سے گھوڑے پر سے نیچے گرا دیا جس سے [...]ں کا حمل ساقط ہو گیا۔ درویش مذکور حاکم شہر کے پاس دادرسی کے لئے نالاں ہوا [...]ے فیصلہ دیا کہ عورت سرکاری ملازموں کے حوالہ کی جائے تاکہ وہ حاملہ کرکے درویش [...]اپس کر دیں۔ کیا اس فیصلہ اور مجسٹریٹ مذکور کے فیصلہ میں کچھ فرق ہے۔ ہاں یہ فرق تو [...]ور ہے کہ وہ ایک غیر ترقی یافتہ زمانہ کا واقعہ ہے اور یہ ترقی یافتہ زمانہ کا ؎

لیبک علی التھذیب من کان باکیا

[...]ں اس تہذیب پر آٹھ آٹھ آنسو رونا چاہیے ٭ پھر کیا وہ لوگ جو حکم پردہ کی مخالفت [...]ور دے رہے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ شریف مسلمانوں کی بہو بیٹیاں بھی اسی رنگ میں رنگی [...]ں تعجب ہے کہ ان ناعاقبت اندیشوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کے محض فرضی منصوبوں [...]ودے جو بالکل شیطانی خیالات کی سرزمین میں بوئے جاتے ہیں کبھی بھی نیک پھل نہیں لائینگے [...]ک صرف ظاہری آرائش اور زیب و زینت سے آراستہ پیراستہ ہونے کو تہذیب کے نام سے [...]سوم کر رہے ہیں۔ اور پھر نہایت جہالت سے اس گستاخی کو قومی ترقی کے نام سے نامزد [...]تے ہیں گویا ان کے ہاں اسلامی دنیا کی ترقی کا معیار پردہ کے اٹھا دینے پر موقوف ہے۔ بعض [...]تبر اصحاب کی زبانی خاکسار نے سنا کہ بعض مغربی ممالک میں لب سڑک لوگوں کو زنا کرتے دیکھنا [...] عام نظارہ ہے۔ عورت و مرد بالکل بہائم کی طرح جمع ہو جاتے ہیں اور مطلقاً حجاب نہیں [...]۔ تعجب ہے کہ اس نئی تہذیب کے دلدادہ اصحاب کیونکر اسلامی شرفاء کی مستورات کو [...] ناشائستہ حالت میں دیکھنا گوارا کرتے ہیں۔ حالانکہ اسلام پاک کی بنیاد محض غیرت و حمیت [...]ی ہے لا ایمان لمن لا غیرۃ لہ ٭

[...]مذکورہ بالا سطور سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مغربی ممالک میں پردہ کی عدم پابندی سے [...] بالعموم اپنی عصمت قائم نہیں رکھ سکتیں۔ اب ہم بروئے دلیل عقلی ضرورت پردہ کا

موازنہ کر کے دکھاتے ہیں کہ حکم پردہ کس قدر خوبیوں کا جامع ہے۔ یہ مسلم ہے کہ انسان میں توالد و تناسل کا خاصہ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ چند حیوانی قواسے فطرۃً اس امر کے لئے مخصوص ہیں۔ مرد میں بصورت فعل اور عورت میں بصورت انفعال۔ قویٰ مذکورہ کو ان کے طبعی میلان سے کوئی طاقت مانع نہیں ہو سکتی اسلئے مرد اور عورت کا بلا حجاب ایک دوسرے سے میل جول کرنا موجب ہے قویٰ مذکورہ بالا کے اظہار عمل کا۔ اور چونکہ نفس ہمیشہ اپنے حظوظ کا خواہاں رہتا ہے اسلئے نوجوان مرد اور عورتیں جن میں مذکورہ بالا قویٰ کی زبردست عملی طاقت موجود ہوتی ہے جذبات حیوانیہ کے اثر سے لزوماً متاثر ہونگے اور اگر کوئی شخص اس لزوم کا انکار کر دے تو وہ محض ہیکڑی باز آدمی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض لوگ (جو نہایت ہی قلیل ہو سکتے ہیں) مرتکب زنا نہ ہوں۔ مگر کیا مرد و عورت ایکدوسرے کے لوازم حسن و شباب سے بھی متاثر نہ ہونگے؟ یہی وجہ ہے کہ جناب پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ آنکھیں۔ کان۔ زبان۔ ہاتھ۔ پاؤں سب زنا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ اعضا ارتکاب زنا سے پہلے زنا کے تمام ابتدائی لوازم کو پورا کرتے ہیں۔ اس لئے مرد اور عورت کا ایک دوسرے کو دیکھکر متاثر ہونا ایک ایسا امر ہے جس کا کبھی انکار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یوں سمجھو کہ مذکورہ بالا اعضا زنا کے تمام مراتب کو بجز آخری مرتبہ کے پورا کر دیتے ہیں۔ کاش! پردہ کے مخالفین مخالفت کرنے سے پہلے کوئی ایسی تدبیر سوچ لیتے جس سے نوجوان مرد اور عورت کے خیالات پر کوئی ناجائز اثر نہ پڑتا۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہونا ممکن ہوتا تو شریعت پردہ کا حکم نہ سناتی۔ پس پردہ کے اٹھا دینے کی صورت میں کوئی ایسی تجویز ممکن نہیں جس سے مرد اور عورت کے خیالات کو محفوظ رکھا جا سکے۔ خواہ وہ مرد اور عورت اعلےٰ تعلیم یافتہ ہوں یا متوسط یا جاہل۔ مع ہذا جس تعلیم کے بھروسہ پر یہ لوگ برے نتائج کا انسداد تصور کرتے ہیں وہ تعلیم سراسر زہر قاتل ہے۔ انگریزی سلسلۂ تصنیف میں بالخصوص علم ادب کی کوئی کتاب ایسی نہیں ملیگی جس کے صفحات فحش تصاویر سے آراستہ نہ ہوں۔ علاوہ ازیں

ناولوں کے مضامین غلیظہ سے جو اثر طبائع پر پیدا ہوتا ہے وہ کسی صورت میں بھی زنا سے کم نہیں ہوتا۔ اور آجکل انگریزی اخبارات و رسائل ملک میں زنا کو رواج دینے کا مضبوط آلہ ہیں۔ اگرچہ بعض اخبارات و رسائل ملکی اور علمی بھی ہوتے ہیں مگر انہیں صرف چند ہی لوگ دیکھتے ہیں ورنہ عوام الناس کو غزلیات عشقیہ اور فحش تصاویر سے جو دلچسپی ہے وہ کسی علمی یا مذہبی تحریر سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اور یہ خیال کہ عورتوں سے ایسی تحریریں ہٹا رکھی جائیں نہایت ہی بیوقوفانہ خیال ہے کیونکہ یہ نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ ناچ گھروں میں جہاں مرد اور عورت بلا محابا بوس و کنار سے متمتع ہوتے ہیں بعض اس قسم کی فحش تصاویر دیکھی گئی ہیں کہ انہیں اگر ایک نوجوان مرد اور عورت (جب وہ دونو تنہا ہوں) دیکھ پائیں تو اس کا نتیجہ بجز زنا کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ الغرض پردہ کے اٹھا دینے میں اگر مان بھی لیا جائے کہ ایک ہی قباحت لازم ہے تو بھی کوئی عقلمند آدمی پردہ کی عدم ضرورت کا قائل نہیں ہوگا کیونکہ یہ ایک ہی قباحت تمام دیگر قباحتوں کا مصدر ہے اگر اس میں شریعت کچھ گنجائش دیکھتی تو اس حکم میں کسی قسم کا تشدد نہ برتتی۔ پس صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ حکم پردہ کی مخالفت کرتے ہیں انہیں درحقیقت مستورات کی اصلاح مدنظر نہیں بلکہ وہ اس بہانہ سے نفس پرستی کرنا چاہتے ہیں۔ اور خبیث و مردود اقوام کی نظیر پیش کر کے بھولے بھالے مسلمانوں کو دام تزویر میں پھانسنا چاہتے ہیں۔ مگر انہیں معلوم رہے کہ مسلمان ہرگز ایسا نہیں کرینگے اور اگر ملتے از سفلگان بے غیرت اپنی بہو بیٹیوں کو ایسا بے حیا بنانا مصلحت سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں۔ اہل ایمان کبھی بھی شریعت حقہ کا دامن نہیں چھوڑ سکتے اور اس قسم کی فرومایانہ تہذیب کی بجائے انہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کافی ہے ؎

واضح ہو کہ پردہ کی پابندی نہ کرنے کی صورت میں مفصلہ ذیل نتائج قبیحہ کا وجود[1]

---

[1] ان نتائج کے ذیل میں اور بہت سے ضمنی نتائج بھی ہیں جو غور کرنے سے معلوم ہو سکتے ہیں ۱۲ منہ

بالواسطہ یا بلاواسطہ لازم ہے جو اسلامی کلمۂ اتحاد کے سخت منافی ہیں (۱) بے غیرتی و بے حمیتی (۲) زنا جو نتیجہ ہے بے غیرتی کا (۳) اولاد حرام کا پھیلنا جس کا نتیجہ اضاعت نسب (۴) نزاع و خصومت جو فیما بین بدچلن لوگوں کے پیدا ہوتی ہے (۵) گستاخی و شوخیٔ مستورات جس سے وہ اپنے خاوندوں کی اطاعت ضروری بھی بجا نہ لائینگی (۶) جھوٹ اور فریب کا رواج پذیر ہونا (۷) عیش پرستی کا عادی ہونا کہ قوم کی ذلت کا پہلا زینہ ہے (۹) اسراف یعنی غیر ضروری اسباب پر تکلف کا پابند ہونا جو تمدنی اصول کے رو سے موجب نقصان عظیم ہے (۸) قوم میں نحش علم ودیکا رواج پکڑ جاتا جس سے ایک محقق مؤرخ کسی قوم کا تاریک پہلو دکھانے میں بہت کچھ کامیاب ہو سکتا ہے (۱۰) طبائع کا بتدریج قوائے جسمانی اور روحانی میں درجۂ انحطاط پہنچ جانا جس کا اثر بالعموم چار پشت کے بعد تھوڑا تھوڑا محسوس ہونے لگتا ہے (۱۱) روحانی کمالات کے خیر و برکات کا قوم سے بالکلیت منقطع ہو جانا جس کا نتیجہ بجز غرور و جہالت کے اور کچھ نہیں ہو سکتا ۔

مذکورہ بالا نتائج ایسے بیّن ہیں کہ بجز ایک جاہل متعصب کے کوئی انکا منکر نہیں ہو سکتا ۔ اور اگر کوئی شخص چند ایک جزئی فوائد پردہ اٹھا دینے میں تجویز کرے تو وہ اسی قسم کے فوائد ہونگے جو باوجود حرمت خمر کے خمر میں پائے جاتے ہیں اور جن کی طرف قرآن مجید نے مجملاً بالفاظ منافع للناس اشارہ کیا ہے ۔ اور تعجب یہ ہے کہ مخالفین کیونکر اس قدر بیّن نقصانات کے مقابلہ میں چند ایک غیر معتدبہ اور غیر محقق فوائد کو قابل وقعت قرار دیتے ہیں ۔ مگر سچ یہ ہے کہ جب ابلیس لعین کسی گناہ پر آمادہ کرتا ہے تو وہ اس گناہ کو مرتکب کے خیال میں بحکم زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ بہتر سے بہتر صورت میں ظاہر کیا کرتا ہے ۔ بہرحال یہ لوگ قرآن مجید کی وعید یعلم خائنۃ الاعین

ص۱ خدا تعالیٰ آنکھوں کی خیانت اور دلوں کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے ۱۲ منہ

وَمَا تَھْوَی الْاَنْفُسُ - کو عمداً نظر انداز کر کے اپنی خواہشات نفس کی پیروی کر رہے ہیں۔
کیا اس آیت سے اجنبی عورت کی طرف نگاہ کرنے کی حُرمت ثابت نہیں ہوتی +

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب تہذیب کا آفتاب اوج کمال پر پہنچ جائیگا تو پردہ کے اٹھا دینے سے جو قباحتیں سردست محسوس ہو رہی ہیں پیدا نہیں ہونگی چنانچہ اس خیال کی تائید انگلستان کی ایک معزز لیڈی کے الفاظ ذیل سے بھی ہوتی ہے جو اس نے ایک دفعہ انڈین نیشنل ایسوسی ایشن کے ایک جلسہ عام میں بمقام لنڈن کہے تھے ۔
"میں کسی طرح اس بات کو جائز نہیں سمجھتی کہ پردہ کا موجودہ طریقہ جو ہندوستانی عورتوں میں رائج ہے ترک کر دیا جائے۔ ہندوستان ابھی اس درجہ ترقی و تعلیم پر نہیں پہنچا کہ وہاں یورپ کی لیڈیوں کی طرح عورتوں کو بے پردہ کر دیا جائے بلکہ ابھی یہی مناسب ہے کہ عورتیں قدیم دستور کے مطابق رسم پردہ کی پابند رکھی جائیں +

بظاہر اس عورت کے الفاظ سے پردہ کی ضرورت کا مفہوم مترشح ہوتا ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں کیونکہ دراصل یہ بیوقوف عورت اپنی جبلی کمزوری سے جو فطرتاً عورتوں میں لازم ہے پردہ کی مخالفت کرتی ہے ۔ کیونکہ اس کے الفاظ میں صاف اشارہ موجود ہے کہ پردہ ایک جاہلانہ ضرورتوں کا نتیجہ ہے اور جب کوئی قوم اعلےٰ سے اعلےٰ درجہ تہذیب پر پہنچ جاتی ہے تو اس کو اس رسم کی پابندی ہرگز ضروری نہیں ہوتی مگر ہمیں یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس غلط خیال کی تائید کونسے دلائل پر کیجاتی ہے کیونکہ عقلاً تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ قوم کے جمیع افراد اس درجہ تہذیب پر پہنچ جائیں کہ اپنے قوائے فطریہ کے عمل سے متاثر نہ ہوں بلکہ جب تک مرد اور عورت کے طبعی جذبات کے متعلقہ قوٰی ان میں موجود ہیں اپنے اپنے مواقع پر اپنا اپنا عمل برابر بجا لائینگے ۔ اور دنیا کی کوئی طاقت بھی ان طبعی تاثرات کی مانع نہیں ہو سکتی ۔ علیٰ ہذا القیاس اس خیال کو تجربہ و مشاہدہ کے رُو سے بھی ہم صحیح تسلیم نہیں کر سکتے ۔ کیونکہ جو ممالک آج سب سے زیادہ مہذب مانے

گئے ہیں زنا میں اُنہیں کا نمبر اوّل ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو اُن لوگوں سے پوچھ لو
بن پھر آئے ہیں اور جن میں سے بعض کے حالات اوپر مذکور ہو چکے ہیں۔ یہاں
عورت کے مذکورہ بالا الفاظ کو ہرگز کچھ وقعت نہیں دیسکتے۔ بلکہ اُس کے برعکس
اُس کو یہ الزام دیتے ہیں کہ اسلامی حکم پردہ کی پابندی کئے بغیر یورپین عورت
کبھی بھی اپنی عزت نفسی اور عصمت ذاتی حاصل نہیں کر سکینگی۔ غور کرنے سے معلوم
ہوگا کہ اس اختلاف رائے کی وجہ یہ ہے کہ جو مفہوم تہذیب ان لوگوں کے ذہن میں
ہے وہ ہمارے ان مذہبی معیار کے رُو سے ہرگز درست نہیں اگر ہم ان کے مفہوم
کے بالکلیت کار بند ہوں تو ہمیں اپنے احکام شرعیہ سے دست بردار ہونا ضروری ہے
مگر ایسا ہونا محال ہے ہم انکے مفہوم تہذیب سے کبھی بھی متفق نہیں ہو سکتے اور
نہ ہی ہمیں ضرورت ہے۔

مَاوَرَدَفِي الْقُرْآن

(ا) قل للمؤمنين يغضوا من ابصارهم ويحفظوا فروجهم ذالك ازكى لهم ان الله خبير بما يصنعون وقل للمؤمنات يغضضن من ابصارهن ويحفظن فروجهن ولا يبدين زينتهن الا ما ظهر منها وليضربن بخمرهن على جيوبهن ۔۔۔۔ الآية

(ترجمہ) اے پیغمبر! ایماندار مردوں کو حکم دے کہ وہ اپنی نظروں کو کچھ پست
کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ امر انہیں زیادہ پاک بنانیوالا ہے
بے شک اللہ تعالےٰ ان کی کارروائیوں سے آگاہ ہے اور اے پیغمبر! ایماندار عورتوں
کو حکم دے کہ وہ اپنی نگاہوں کو کچھ پست رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کو محفوظ

لہ عرب جاہلیت میں زنا کے مختلف دستور تھے جنکا اس زمانہ میں پورا پورا رواج تھا۔ قریباً وہی سب
تمام مغربی ممالک میں مروج ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ عموماً جاہل زانی تھے جنکی معاشرت بڑی ادنےٰ تھی اور یہ
زانی ہیں مثلاً امیر کوئی ایک شخص بلا اطلاع کسی اجنبی عورت کے پاس چلا جاتا اور اب یہ لوگ پہلے سکرٹری کی معرفت
سرٹیفکیٹ یا ٹکٹ حاصل کرتے ہیں۔ یہی تہذیب ہے جسپر بار بار زور دیا جاتا ہے ۱۲ منہ

...اور یعنی زینت کو بجز اس حصہ کے جو ضرورتاً برہنہ رہتا ہے ظاہر نہ کیا
...و اپنی اوڑھنیوں کو اس طرح اوڑھیں کہ سر اور سینہ ڈھپ جائیں ۔

(۱) اس آیت میں غض ابصار (نگاہوں کے پست کرلینے) سے مراد یہ ہے
...کہ مرد اجنبی عورت کو اور کوئی عورت اجنبی مرد کو نہ دیکھے - یہ ایک عام حکم ہے
...جو تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کو شامل ہے - صرف ان بوڑھی عورتوں کو
...نہ کرنیکا اختیار ہے جو جننے سے رہ چکی ہوں - مگر ان کے لئے بھی جب ہی اختیار
...زیور یا بناؤ سنگار سے خالی ہوں - البتہ چند صورتیں مستثنیٰ ہیں جو ضرورتاً بحکم
...ت مستثنیٰ قرار دیگئی ہیں مثلاً (۱) طبیب کا بغرض معالجہ نظر کرنا (۲) کسی زانی کی
...ت زنا کے لئے مرد یا عورت کی شرمگاہ کو دیکھنا (۳) ڈوبتے وقت بغرض بچا
...کے کسی عورت کے بدن کا دیکھنا یا چھونا - علیٰ ہذا القیاس ۔

(۲) لفظ زینت کے مفہوم میں اعضاء کی فطری زینت اور نیز مصنوعی مثلاً کحل خضاب
وغیرہ شامل ہیں - بعض نے لباس کو بھی شامل زینت قرار دیا ہے - کیونکہ آیہ خذوا
زینتکم عند کل مسجد میں زینت بمعنی لباس مستعمل ہوا ہے - بعض مفسرین نے
...ت کی تقسیم ظاہری اور باطنی پر کی ہے سو زینت ظاہری سے مراد لباس وغیرہ
اور زینت باطنی سے زیور اور دیگر آرائشات - اور یہی قول ہے حضرت ابن
...د رضہ کا (تفسیر درمنثور) ۔

(۳) اس آیت میں الفاظ الا ما ظہر منہا قابل غور ہیں - حضرت ابن عباس رض
...کی روایت میں اس سے مراد خضاب و خاتم ہے - اور ایک دوسری روایت
...ہ اور ہاتھ اور خاتم مراد ہے (درمنثور) چونکہ لفظ زینت بعض مفسرین نے

...والقواعد من النساء التی لا یرجون نکاحا فلیس علیہن جناح ان یضعن ثیابہن غیر متبرجٰت
...۱۲ منہ ۲ اگر بلا قصد و ارادہ ناگہاں کسی اجنبی عورت کے چہرہ پر نظر پڑجائے تو وہ معاف ہے فی الفور
...ہٹا لے مگر جو دوبارہ نظر کرے تو گنہگار ہے ۱۲ منہ

نزدیک فطری اور مصنوعی زینت پر مشتمل ہے۔ اسلئے ما ظہر منہا سے وہی حصہ بدن اور آرائش کا مراد ہو سکتا ہے جو ضرورتاً برہنہ رہ سکتا ہے۔ سو وہ چہرہ اور ہاتھ ہیں اور ان کے ساتھ ان کی مصنوعی زینت بناؤ سنگار بھی داخل ہے (تفسیر کبیر)۔

(۴) ولیضربن بخمرھن علٰی جیوبھن . . . . زمانہ جاہلیت کی عورتیں پردہ نہیں کیا کرتی تھیں بلکہ سر اور سینہ ننگا چھوڑ کر باہر آیا جایا کرتی تھیں اور ان کے گریبان وسیع ہوتے تھے جن سے اندرونی حصہ برابر دیکھا جاتا تھا۔ اس پر شریعت اسلامی نے انہیں خمار اوڑھنے کا حکم دیا (جو دار یعنی چادر سے کم ہوتی ہے) چنانچہ حضرت ام المومنین عائشہ فرماتی ہیں کہ اس آیت کے نازل ہوتے ہی انصار مدینہ کی تمام عورتیں نماز کے لئے مسجد نبوی میں خمار اوڑھ کر حاضر ہوئیں (تفسیر کشاف و درمنثور)۔

(ب) یا ایھا النبیّ قل لازواجک وبناتک ونساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن ذلک ادنی ان یعرفن فلا یؤذین وکان اللہ غفورًا رحیمًا

(ترجمہ) اے پیغمبر! اپنے ازواج مطہرات اور اپنی بیٹیوں اور مومنین کی مستورات کو یہ حکم سنا دو کہ وہ تمام بدن کو ڈھانپ لیا کریں۔ اس طریق سے انکی شناخت ہو سکیگی۔ جس سے وہ ایذا نہ دی جایا کریگی اور اللہ تعالےٰ بڑا بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ مہاجرین وانصار کی عورتیں جب رات کے وقت قضائے حاجت کے واسطے باہر نکلا کرتی تھیں تو شہر کے بعض بدمعاش ادھر اُدھر نخلستانوں میں جا چھپتے اور جہاں کسی عورت کو دیکھتے اُس سے چھیڑ چھاڑ کرتے۔ جب ان بدمعاشوں کو روکا جاتا تو وہ اس عذر پر کہ وہ کسی عورت کو لونڈی سمجھ کر ایسا کرتے ہیں حرہ (آزاد شریف) سے انہیں کچھ سروکار نہیں چھوٹ جاتے۔ خداوند کریم نے آیت مسطورۂ

(۱) شروع اسلام میں کچھ مدت تک عورتیں بالکل زمانہ جاہلیت کی وضع کی پابند تھیں اور نیز ابھی مسلمانوں کی تمدنی حالت پورے کمال تک نہیں پہنچی تھی اور پاخانے گھروں میں تجویز نہیں کئے گئے تھے اسلئے عورتیں خواہ وہ حرہ (آزاد و شریف) ہوتیں یا لونڈیاں ایک ہی وضع میں نکلا کرتیں ۱۲ منہ

نازل کی جس میں عورتوں کو حکم ہوا کہ وہ اس طرح بدن پر چادر لپیٹ لیا کریں کہ کوئی حصہ بدن کا فارغ نہ رہے۔ گویا اس طرح چادر میں لپٹ کر نکلنا حرہ عورتوں کو لونڈیوں سے تمیز کرنیکا ذریعہ سمجھا گیا۔ تاکہ شہر کے بدمعاش اس وضع کو دیکھکر سمجھ لیں کہ یہ عورت لونڈی نہیں۔ بلکہ حرہ ہے اور ان سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ کیا کریں۔ یہ آیت بھی افادہ حکم میں عام ہے کیونکہ خاندان نبوت کی مستورات اور عامہ اہل ایمان کی مستورات بلا امتیاز اس حکم کے مفہوم میں داخل ہیں۔ البتہ الفاظ یدنین علیہن[1] من جلابیبھن قابل غور ہیں ؟

امام جعفر محمد بن جریر الطبری اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں اختلف اھل التاویل فی صفۃ الادناء الذی امرھن اللہ بہ فقال بعضھم ھو ان یغطین وجوھھن ورؤسھن فلا یبدین منھن الا عینا واحدۃ۔ یعنی اہل تفسیر نے کیفیت ادناء میں جس کا خداوند تعالیٰ نے حکم دیا ہے اختلاف کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسکا مطلب یہ ہے کہ عورتیں اپنے چہرہ اور سر کو ڈھانپ لیا کریں اور صرف ایک آنکھ فارغ چھوڑ دیں۔ یہ معنی ابن عباس کی طرف منسوب ہیں ؟

پھر بروایت ہشام عن ابن سیرین عن عبیدہ لکھتے ہیں کہ عبیدہ نے اپنی چادر سے اپنا سر اور منہ ڈھانپ کر ایک آنکھ فارغ رکھی اور کہا یہ مطلب ہے الفاظ یدنین علیہن ۔ ۔ ۔ ۔ الخ کا ؟

• پھر لکھتے ہیں کہ بعض دیگر مفسرین نے اس سے پیشانی پر چادر کے پلہ کو کس لینا مراد لیا ہے۔ علامہ جار اللہ زمخشری جو علم ادب عربی کے ماہر استاد ہیں کسائی امام النحو کا یہ قول نقل کرتے ہیں و عن الکسائی یتقنعن بملاحفھن منضمۃ علیھن اراد بالانضمام معنی الادناء (ترجمہ) کسائی کہتے ہیں کہ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں

[1] یدنین مصدر ادناء سے مشتق ہے جسکے معنی قریب کرنے کے ہیں اور جلابیب جمع ہے جلباب کی یعنی چادریں لفظی ترجمہ ہوا کہ قریب کر لیا کریں اپنے اوپر اپنی چادریں ۱۲ منہ

اپنے تمام بدن کو چادریں ڈھانپ لیا کریں یعنی ادنا ر کے معنی انہوں نے چادر میں لپٹ جانے کے لئے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ معنی زیادہ قرین قیاس ہیں کیونکہ علیہن کے مفہوم میں عورت کا سارا بدن داخل ہے نہ صرف پیشانی یا چہرہ یا چہرہ اور سینہ وغیرہ۔ اگر ایسا ہوتا تو علے وجوھھن یا علے صدورھن او نحو ذھن یا کوئی اور الفاظ ہوتے اور خود علامہ زمخشری آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں یرخینہا علیہن ویغطین بہا وجوھہن واعطافھن یعنی اپنے جسم پر چادر کو ڈھیلا کرکے اوڑھ لیا کریں اور اس سے اپنے چہروں اور پہلوؤں کو ڈھانپ لیا کریں اور لفظ جلباب کی حقیقت پر غور کرنے سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے کیونکہ علامۂ موصوف نے اس کی تشریح یوں کی ہے الجلباب ثوب واسع اوسع من الخمار دون الرداء تلویہ المرأۃ علی رأسہا وتبقی منہ ما ترسلہ علی صدرھا وعن ابن عباس رض الرداء الذی یستر من فوق الی سفل۔ یعنی جلباب ایک فراخ کپڑا ہے جو اوڑھنی سے بڑا اور چادر سے چھوٹا ہوتا ہے جس کو عورت اپنے سر پر لپیٹ لیتی ہے اور باقی حصۂ سینہ پر کھلا چھوڑتی ہے اور حضرت ابن عباس رض سے مروی ہے کہ جلباب وہ چادر ہے جو سر سے پاؤں تک تمام بدن کو ڈھانپ لے ؛

اور حافظ جلال الدین سیوطی تفسیر درمنثور میں بروایت ابن منذر و ابن ابی حاتم عن محمد بن سیرین لکھتے ہیں کہ ابن سیرین کہتے ہیں کہ میں نے عبیدہ سلمانی رض سے آیت مذکورہ بالا کے معنی دریافت کئے تو انہوں نے عملی طور پر مجھے جواب دیا یعنی چادر کو اوڑھ کر اپنا سر اور چہرہ ڈھانپ لیا اور ایک آنکھ ننگی چھوڑ دی ؛

قاضی بیضاوی نے نہایت وضاحت کے ساتھ ان الفاظ کے مفہوم کو قلمبند کیا ہے چنانچہ وہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں یغطین وجوھھن وابدانھن بملاحفھن اذا برزن لحاجۃ ومن للتبعیض فان المرأۃ ترخی بعض جلبابہا وتتلفع ببعض

(ترجمہ) یعنی عورتیں اپنے چہروں اور بدنوں کو فراخ چادروں میں کسی کام کے لئے باہر جاتے وقت لپیٹ لیا کریں اور لفظ من جو من جلابیبھن میں واقع ہوا ہے وہ بعضیت کا مفہوم پیدا کرتا ہے کیونکہ کچھ حصہ سے عورت اپنے چہرہ کو ڈھانپ لیتی ہے اور باقی سے باقی حصہ بدن کو ؃

الغرض جمہور مفسرین نے ان الفاظ کا مفہوم قریبًا قریبًا ایک ہی لکھا ہے یعنی کہ پردہ شرعی وہی ہے جو آجتک مروج ہے صرف کم و بیش طرز بیان میں اختلاف ہے ۔ ان مختلف حوالجات سے مجھے یہ مدنظر ہے کہ آیت مذکورہ بالا کو چونکہ اکثر نیچری توڑ مروڑ کر اپنے دعوے کے مطابق کر لیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ مسلمان عورتوں کو صرف اسیقدر پردہ کا حکم دیا گیا ہے کہ ذرا چادر کو نیچے لٹکا لیا کریں اور بالکل کشوف الوجہ ہو کر عام طور پر مردوں کی طرح بلا تکلف بازاروں میں آیا جایا کریں ۔ یہ بالکل دھوکا ہے جس کی کوئی اصل نہیں ۔ عمدۃ القاری شرح بخاری میں صاف لکھا ہے اشار البخاری فی ھذا الباب الی ان تبرز النساء الی البراز کان اولا لعدم الکنیف فی البیوت وکان رخصتلھن ثم لما اتخذت الکنف فی البیوت منعن عن الخروج منھا الا عند الضرورۃ ولن یخرجن باللیل دون النھار واذا تبرزن الی المناصع فلن یخرجن الی المساجد باللیل والغلس (ترجمہ) بخاری نے اس باب میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شروع اسلام میں بوجہ پائخانوں کے گھروں میں نہ ہونے کے عورتیں باہر جایا کرتی تھیں ۔ اور انہیں اجازت تھی پھر جب پائخانے گھروں میں تجویز کئے گئے تو بلا ضرورت باہر جانے سے روک دی گئیں اور پہلے بھی قضائے حاجت کے لئے رات کو نکلا کرتی تھیں نہ دن کو ۔ اور مسجدوں کی طرف بھی رات کو یا صبح سویرے جبکہ کچھ تاریکی باقی ہوتی تھی جایا کرتی تھیں ۔ چونکہ نیچریہ کو خوب معلوم ہے کہ الفاظ قرآن مجید سے انکی کسی طرح بھی تائید نہیں ہوتی اسلئے

وہ پردہ کی مخالفت میں انواع واقسام کی حیلہ بازیوں سے کام لیا کرتے ہیں مثلاً کبھی تو یہ کہتے ہیں کہ پردہ صرف ایسی تمدنی ضرورت کا بقیہ ہے جس کا زمانہ ہو لیا کوئی شرعی حکم نہیں۔ کبھی الفاظ الا ما ظھر منہا سے استدلال کر کے یوں کہا کرتے ہیں کہ منہ اور ہاتھ کے پردہ کا حکم نہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ زمانہ خلافت عباسیہ میں جب اہل عجم کے اصول تمدن کا رواج ہوا تو بعض شرفاء کی تقلید میں اس پر زور دیا گیا۔ کبھی یوں کہتے ہیں کہ عورتیں زمانہ نبوت میں میدان جنگ میں ہوا کرتی تھیں اور بلا حجاب مردوں میں آمد و رفت کیا کرتیں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ یہ سب دھوکا ہے۔ ان بیچاروں کو تاریخ اسلامی کی صرف اسیقدر خبر ہے جس قدر یورپین مؤرخین نے انہیں غلط سلط بتلایا ہے یہ انہیں خیالات کے معیار پر احکام قرآنیہ کا موازنہ کرنے پر بیٹھ جاتے ہیں اور علمائے سلف و خلف کو عرضۂ طعن بنا کر اپنے تئیں مدعیان اصلاح کے زمرہ میں داخل کرنا چاہتے ہیں ؏

ان توہمات باطلہ کا مجمل جواب تو یہ ہے کہ شریعت اسلامی کے تمام احکام حکم و مصالح پر مشتمل ہیں اور ان میں سے ہر ایک حکم اپنی ابتدائی نوعیت کے لحاظ سے نہایت ہی خفیف طور پہ پیش کیا گیا تھا۔ جوں جوں طبائع پابندئ شریعت کی عادی ہوتی چلی گئیں احکام میں بھی کسی قدر ساتھ ساتھ سختی بڑھتی چلی گئی۔ اور یہ طریق تبلیغ عین فطرت انسانی کے مطابق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بتدریج نجماً نجماً نازل ہوا۔ اگر تمام احکام شرعیہ زمانہ بعثت نبویؐ کے آغاز میں ایک دفعہ ہی پیش کر دئے جاتے تو لوگ انہیں تکلیف مالایطاق سمجھ کر کبھی بجا نہ لاتے۔ دیکھو کہ نماز پنجگانہ اور روزۂ رمضان اور فریضۂ زکوٰۃ وغیرہ اور دیگر اوامر ابتدا میں بلا تعیین وقت و مقدار ادا کئے جاتے تھے مگر وہ اپنے اپنے مواقع پر آہستہ آہستہ فرض مؤبداً قرار پائے اسی طرح نواہی کو دیکھ لو مثلاً شراب نوشی کو حرام قرار دینا شریعت اسلامی

فوری حکم نہ تھا بلکہ ایک خاص مدت میں چار دفعہ احکام نازل ہوئے جن میں سے آخری اور قطعی حکم انما الخمر والمیسر ..... الخ کا تھا۔ بعینہٖ یہی حالت حکم پردہ کی ہے کہ سب سے پہلے آیت قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم ..... الخ نازل ہوئی اور اس سے الفاظ الا ما ظھر منہا میں اسقدر گنجائش باقی رہ گئی تھی کہ عورتیں ہاتھ اور چہرہ کو برہنہ رکھا کریں کیونکہ یہ پہلا مرحلہ تھا اور زمانہ جاہلیت کی لغو آزادی کو دُور کرنا مقصود تھا۔ اس لئے بمقتضائے مصلحت یہی کافی سمجھا گیا۔ مگر ایک زمانہ گذرنے پر آیت یدنین علیھن من جلابیبھن نازل ہوئی۔ جس نے پردہ کی شرعی صورت قائم کردی جو اب تک اُن مسلمانوں میں جن کے دلوں میں شریعت الٰہی کی عظمت ہے بدستور زمانہ نبوت سے قابل عملدرآمد سمجھی گئی ہے۔ اسکے بعد جب آیہ والقواعد من النساء ..... الخ نازل ہوئی تو بوڑھی عورتوں کو جو جننے سے رہ چکی ہوں کسی قدر تخفیف پردہ کی اجازت دیدی گئی مگر دوسری عورتوں کے لئے جو محل فتنہ ہوسکتی ہیں کوئی کسی قسم کی استثنائی صورت بجز ان صورتوں کے جو شرعی ضرورتوں پر مبنی ہیں قائم نہیں کیگئی۔ چنانچہ تفسیر درمنثور جلد خامس میں امام سیوطی لکھتے ہیں واخرج ابوداؤد فی الناسخ عن ابن عباس قال فی سورۃ النور ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منہا ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن وقال یدنین علیھن من جلابیبھن ثم استثنیٰ فقال والقواعد من النساء التی لا یرجون نکاحا فلیس علیھن جناح ان یضعن ثیابھن الآیۃ یعنی سورہ نور میں آیہ لا یبدین زینتھن نازل ہوئی اور سورہ احزاب میں یدنین علیھن اور پھر سن رسیدہ عورتوں کے لئے آیہ والقواعد من النساء نازل ہوئی جنکی تشریح اوپر گذر چکی۔

پردہ شرعی کی حد

غالباً یہ امر ناظرین پر واضح ہو چکا ہوگا کہ شریعت نے پردہ کا حکم صرف انسداد فتنہ کی بنا پر عائد کیا ہے۔

ورنہ شریعت کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ مستورات کو اجنبی لوگوں کی نظروں سے
در پردہ رہنے کا حکم دیتی۔ مغربی تمدن کے دلدادہ حضرات نہ تو کھلے الفاظ میں
آیات قرآنیہ کے انکار کی جرأت رکھتے ہیں۔ اور نہ ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق
الغرض اُدھر کنواں اُدھر کھائی۔ دل میں پیچ و تاب تو بہت کھاتے ہیں مگر شریعت
کے سامنے کوئی تدبیر کارگر نظر نہیں آتی اسلئے بعض تو نہایت بے باکی سے شرعی حکم
کو بالائے طاق رکھکر عورتوں کو بے پردگی پر مجبور کرتے ہیں اور بعض خاندانی عزت و
ناموس اور ابنائے جنس کی طعن و تشنیع کو مدِنظر رکھ کر ایسی جرأت سے تو کام نہیں لیتے
مگر دل سے متمنی ہوتے ہیں کہ کسی طرح پردہ کی مشکلات سے نجات مل جائے۔ یہ لوگ
آیات قرآنیہ میں طرح طرح کی تاویلیں کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں اور چونکہ اصول
تفسیر سے بے خبر ہوتے ہیں اس لئے جو کچھ چاہتے ہیں مُنہ سے نکال پھینکتے ہیں۔ آیہ
قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم . . . . الخ اور آیۂ قل للمؤمنات یغضضن
من ابصارھن . . . . الخ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ کسی اجنبی مرد اور اجنبی عورت
کو حکم نہیں کہ کوئی ایک دوسرے کا چہرہ دیکھے۔ کیونکہ یہ امر باطن کو پاک رکھنے کے
لئے زیادہ قرین مصلحت ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ صرف چہرہ ہی ایک ایسا محل
فتنہ ہے جس پر بمجرد دیکھنے کے دل میں شیطانی وساوس پیدا ہونے لگجاتے ہیں
جن سے مرد اور عورت ہر دو کی نسبت عصمت و عفت کے زائل ہونیکا قوی احتمال
ہے اور یہ جو تفاسیر میں آیہ ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا کے ذیل میں لکھا
ہے کہ چہرہ اور دونوں ہاتھ مستثنیٰ ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ عام حالات میں ہر
جہاں جس وقت چاہے چہرہ اور ہاتھ کو برہنہ کئے پھرا کرے بلکہ یہ استثناء رفع
حرج پر مبنی ہے کیونکہ عورت کی تمدنی زندگی میں ایسی صورتوں کے پیش آنے کا
امکان ہے۔ جن میں چہرہ اور ہاتھ کو برہنہ رکھنا پڑتا ہے سو یہ استثناء داعیۂ ضرورت

ہمتی ہے نہ عام حالات ہیں۔ جہاں جو نظارہ حسن کے دلدادہ ہیں اور جو تہذیب اور
آزادی کی آڑ میں حظ نفس کو پورا کرنا چاہتے ہیں الا ما ظہر منہا کو پڑھکر سنبھالے
نہیں سنبھلتے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر یوں تقریریں کرتے ہیں کہ علماء خواہ مخواہ تنگ خیالی
سے کام لیتے ہیں۔ اور عورتوں کو اندر باہر آنے جانے سے روکتے ہیں۔ ان لوگوں کی
مثال بعینہ ان سود خواروں کی سی ہے جو یہ کہا کرتے ہیں کہ سود در سود جو ایک گونہ ظلم
ہے شرعاً منع ہے مگر معمولی سود جیسا کہ زمیندارہ بنکوں میں یا سیونگ بنکوں میں مروّج
ہے ممنوع نہیں کیونکہ یہ ایک قسم کا منافع ہے۔ مگر اصول فقیہہ کا ماہر بخوبی جانتا ہے
کہ یہ خالص سود ہے۔ یہی حال بیمۂ زندگی کے مجوزین کا ہے جو اپنے وارثوں کے لئے
حرام کا مال ترکہ میں چھوڑ مرتے ہیں اور وہ اس اصول سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں
کہ جس معاملہ میں احد المتعاقدین کو غرر (دھوکا) ہونے کا احتمال ہو وہ شریعت اسلام
میں قطعاً ناجائز ہے وہ بمقابلہ شریعت یورپین تمدنی زندگی کو اپنے لئے زیادہ ضروری
خیال کرتے ہیں ٭

الا ما ظہر منہا کی مذکورہ بالا توجیہ ترکیب الفاظ سے صاف طور پر عیاں ہے۔ کیونکہ
ما اسم موصول ہے جس کے مفہوم میں عموم کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور اسم موصول کے
لئے جملہ صلہ کا ہونا ضروری ہے اور وہ ظہر منہا ہے۔ ظہر کا ضمیر اسم موصول کی
طرف راجع ہے اور ظہر فعل لازم ہے نہ متعدی۔ مطلب یہ ہوا کہ عورتیں اپنی زینت
یا مواضع زینت کو غیروں پر ظاہر نہ کریں مگر وہی زینت یا مواضع زینت جو خود بخود مجبورانہ
حالت میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ فعل یبدین متعدی ہے اور ظہر لازم۔ اور متعدی اور
لازم کا تقابل خود اس امر پر دال ہے کہ ابداء (یبدین کا مصدر) عورتوں کا فعل ہے
اور ظہور (ظہر کا مصدر) ما اسم موصول کا جو عام ہے یعنی جس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ
اس سے کیا مراد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے ما ظہر منہا کی تفسیر میں اختلاف کیا

ہے کسی نے لکھا ہے کہ وجہ اور کف مراد ہیں اور کسی نے لباس اور زیور مراد لئے
کسی نے لکھا ہے کہ کحل و خضاب و غازہ وغیرہ لیکن اقرب الی الصواب یہی ہے کہ
وجہ اور کف ہی مراد ہیں کیونکہ لباس اور زیور و آرائش وغیرہ ایسے امور نہیں ہیں جن کا
ظہور تمدنی زندگی میں کسی خاص ضرورت پر مبنی ہو۔ برخلاف ظہور وجہ و کف کے جو تمدنی
زندگی میں بعض اوقات ضروری سمجھا جاتا ہے اور ایسی حالت کو شریعت نے مستثنیٰ قرار
دیا ہے۔ مگر کس قدر تعجب ہے کہ مخالفین حکم پردہ اسکو عام طور پر مستورات کے لئے
ہر ایک حالت میں جائز سمجھتے ہیں اور اس سے پردہ اٹھا دینے کا حکم مستنبط کرتے
ہیں۔ ان لوگوں کو یہ سمجھ بھی نہیں کہ اگر ایسی ہی عمومیت شریعت کو مدنظر ہوتی تو اسکو
استثنار کی صورت میں پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ استثنا رخود ہی دلالت کر رہا ہے
کہ حکم استثنائی خاص خاص حالات میں قابل عمل ہے نہ ہر ایک حالت میں۔ جس سے
یہ تہذیب کے پتلے اپنی نفسانی خواہشات کی کھلے بندوں داد دے سکیں ٭

اب اسی حکم کی تائید میں سورہ احزاب کی دوسری آیت لو یا ایہا النبی قل
لازواجك وبناتك ونساء المؤمنين يدنين عليهن من جلابيبهن ذلك
ادنى ان يعرفن فلا يؤذين - اس آیۂ شریفہ میں چند امور قابل غور ہیں اول یہ
کہ حکم اہلبیت نبوی اور دیگر مومنین کی مستورات کے لئے یکساں طور پر عاید کیا
گیا ہے جس سے بعض نئے مجتہدین کا یہ خیال بھی باطل ہو گیا کہ آیۂ یا نساء النبی
لستن کاحد من النساء سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا پردہ صرف حرم نبوی
کے لئے مخصوص تھا۔ عام مستورات اس حکم کے ذیل میں نہیں آتیں۔ بھلا ان جہاں
مجتہدین کو اس بات کے سمجھنے کی قابلیت کہاں کہ یہ آیت احتجاب کی علت نہیں بلکہ
حرم نبوی رض کی فضیلت کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ جس سے ان کا دیگر مستورات کی
نسبت باعصمت وعفت رہنا بدرجہ اولیٰ اہم ثابت ہوتا ہے اور اس سے آگے

واذا سألتموهن متاعاً فسئلوهن من وراء حجاب اگرچہ حرم نبویؐ کے متعلق ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ دیگر مستورات اس حکم میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ جو علت اس حکم کے صادر کرنے میں حرم نبویؐ کے لئے ملحوظ ہے وہی دیگر مستورات کے لئے ٭ دوم یدنین کا مفہوم یہ ہے کہ مستورات اپنا جمیع جسم مستور رکھا کریں کیونکہ اگلا لفظ علیہن کا مفہوم یہی ہے۔ اگر جمیع جسم مقصود نہ ہوتا تو بجائے علیہن کے کوئی دوسرا لفظ مثلاً علیٰ وجوھھن (اپنے چہروں پر) یا علیٰ صدورھن (اپنے سینوں پر) یا کچھ اور لفظ ہوتا۔ اگرچہ بعض مفسرین نے اس لفظ کی تفسیر میں چہرہ کا مفہوم اخذ کیا ہے مگر اصول تفسیر ہماری مذکورہ بالا تفسیر کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ حقیقت کو ترک کر کے مجاز کی طرف رجوع کرنا صرف اس صورت میں ہی جائز ہے جبکہ حقیقت کسی محال عقلی کی مستلزم ہو ٭

اگر کوئی صاحب یوں تقریر کرنے لگے کہ من جلابیبھن میں لفظ من تبعیضیہ ہے جس کے معنی یہ ہونگے کہ اپنی چادروں کا کچھ حصہ نیچے لٹکا لیا کریں اور چادر کے کچھ حصہ سے سارا جسم مستور نہیں ہوتا بلکہ چہرہ تک ہی محدود رہتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک یہ توجیہ غلط نہیں بلکہ یہ توجیہ تو ہمارے ہی مقصد کی مؤید ہے کیونکہ صرف چہرہ ہی محل فتنہ ہے۔ سو جب چہرہ مستور رہا تو حکم پردہ پر عمل پورا ہو گیا کیونکہ یہ کبھی نہیں ہوا اور نہ ہونا چاہئے کہ صرف چہرہ کو مستورات پردہ میں رکھیں اور باقی حصہ جسم کو برہنہ چھوڑ دیں۔ مطلب یہ ہے کہ جسم تو پہلے ہی مستور ہوتا ہے اور چہرہ کو بالخصوص پردہ میں رکھا کریں بعض اردو مترجمین نے یدنین علیہن سے گھونگٹ کا مفہوم اخذ کیا ہے۔ سو اس سے ہمارے مقصد میں کوئی فرق نہیں آتا ٭

آیت کا بقیہ حصہ علت حکم پر مشتمل ہے اور اس میں فلا یؤذین کا لفظ بالخصوص قابل غور ہے کیونکہ اس میں حرف فا اشارہ کرتا ہے کہ مابعد اپنے ماقبل کا نتیجہ ہے اور لفظ ایذاء میں اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ پردہ نہ کرنے کی صورت میں مستورات

کی عصمت و عفت قائم نہیں رہ سکتی۔ اگرچہ اس آیت کا مورد خاص ہے مگر حکم عام ہے اور یہ اصل عموماً ہر ایک حکم قرآنی میں مسلم ہے ؛

مذکورہ بالا تقریر سے پردۂ شرعی کی حد واضح طور پر معلوم ہوگئی یعنی عورت کو جائز نہیں کہ وہ اپنا بدن یا چہرہ کسی اجنبی کے سامنے برہنہ کرے۔ ہاں چہرہ کو کسی اضطراری حالت میں برہنہ کر سکتی ہے مگر وہ بھی صرف انہیں رشتہ داروں کے لئے جن کا ذکر قرآن مجید میں واضح طور پر بیان ہو چکا ہے۔ چنانچہ اسی آیت مذکورہ بالا کے اگلے حصہ کو پڑھو جہاں فرمایا ہے ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن او اٰبائھن او اٰباء بعولتھن او ابنائھن او ابناء بعولتھن او اخوانھن او بنی اخوانھن او نسائھن او ما ملکت ایمانھن او التابعین غیر اولی الاربۃ من الرجال او الطفل الذین لم یظھروا علیٰ عورات النساء الآیۃ جس سے صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ ما ظھر منھا سے خواہ کچھ ہی مراد لی جائے صرف انہیں رشتہ داروں کے لئے استثنا کا حکم عائد ہوگا جنکا ذکر اوپر آ چکا ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ ما ظھر منھا کو مستور رکھنا صرف انہیں رشتہ داروں تک محدود ہے نہ کہ ان کے علاوہ عام اجنبی مردوں کے لئے بھی۔ اسلئے پوری آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ عورتوں کو بجز ما ظھر منھا کے تمام لوگوں سے (خواہ وہ عام اجنبی ہوں اور خواہ وہ اُن رشتہ داروں سے ہوں) تمام بدن کو مستور رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہاں بصورت ضرورت مذکورہ بالا رشتہ داروں کے سامنے ما ظھر منھا کو مستور نہ رکھیں۔ کیونکہ ان رشتہ داروں کے لئے وہ محل فتنہ نہیں ہیں۔ اس کو مثال میں ہم یوں ظاہر کر سکتے ہیں کہ جس طرح کہا جائے کہ فلاں مکان کے اندر کوئی شخص داخل نہیں ہو سکتا بجز فلاں مخصوص حصہ کے۔ مگر اس مخصوص حصہ میں بھی صرف زید، عمرو، بکر، خالد داخل ہو سکتے ہیں۔ ان کے سوا کسی کو اجازت نہیں۔ اس سے ہر ایک شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ

فلاں مکان کے ایک مخصوص حصہ میں صرف ۔ زید ۔ عمرو ۔ بکر ۔ خالد کو داخل ہونے کی اجازت ہے نہ یہ کہ مخصوص حصہ میں جو چاہے داخل ہو سکے ۔ آیت کے پہلے حصہ میں زینت مخصوصہ کو مستثنیٰ کیا گیا ہے اور دوسرے حصہ میں ان رشتہ داروں کو جو اس زینت کو دیکھ سکتے ہیں اور محل خطر نہیں ۔ عوام الناس صرف ما ظہر منہا کو لے لیتے ہیں مگر الا لبعولتھن ... الخ کو نظر انداز کر جاتے ہیں ۔ اس آیت کے ہر دو حصہ کو ملا کر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ما ظہر منہا بھی صرف مذکورہ بالا رشتہ داروں کے لئے ہے جن سے گھروں میں مستورات حسب ضرورت پردہ نہیں کر سکتیں اور ما ظہر منہا کے علاوہ باقی حصہ جسم کو نہ یہ رشتہ دار دیکھ سکتے ہیں نہ کوئی عام اجنبی مرد ۔ پس ثابت ہوا کہ عام اجنبی مرد کسی حصہ کو بھی نہیں دیکھ سکتے اور مذکورہ بالا رشتہ دار صرف ما ظہر منہا کو ہی دیکھ سکتے ہیں اور بس ۔ اور عورت کو شریعت نے ضرورت کے وقت باہر آنے جانے سے منع نہیں کیا مگر پردہ میں ۔ نہ کہ کھلے منہ بن ٹھن کر بلا حجاب جہاں چاہے چلی جائے جیسا کہ مغربی عورتوں میں مروج ہے ۔ ہم نے سنا کہ ایک مسلمان معزز خاتون نے ایک موقعہ پہ کہا تھا کہ کیوں عورتوں کو بلا روک ٹوک باہر آمد و رفت کرنے کی اجازت نہ دی جائے گر مرد بلا روک ٹوک اپنی عصمت و عفت قائم رکھ سکتے ہیں تو کیا عورتیں ایسا نہیں کر سکتیں ؟ ذرا غور کرو کہ اس مغربی تہذیب کی دلدادہ خاتون کا یہ استدلال کس درجہ مضحکہ خیز ہے اور اس کی اسی دلیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت قوت استدلال میں مرد کی نسبت سخت ضعیف الفطرۃ واقع ہوئی ہے ۔ غالباً اس خدا کی بندی نے کسی پارک یا کسی لکچر ہال تک ہی اپنی نظر کو محدود رکھا ہے اور اس کو معلوم نہیں کہ ایک مرد جان جوکھوں کیسے خطرناک اور دشوار گذار پہاڑوں اور جنگلوں میں بلا خوف و خطر سفر کر سکتا ہے مگر کیا اس مہذب خاتون کو بھی بلا حفاظت

غیرت یہ حوصلہ ہے ؟

ہمیں یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک انگریزی خوان نیم ملاّ نے یہ کہا تھا کہ حکم پردہ عورتوں کے لئے فرض نہیں ہے ۔جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو پردہ نہ رکھنے کا بھی اختیار ہے ۔ مگر تعجب ہے کہ بصیغۂ نہی جس امر سے روکا جاتا ہے اس کو ایک اختیاری امر قرار دیا جاتا ہے ۔ حالانکہ ایسا امر اُصولاً فعل حرام یا مکروہ تحریمی ہوا کرتا ہے اور حرام یا مکروہ تحریمی سے بچنا ہر ایک ایماندار کا فرض ہے اسلئے عورت کے لئے پردہ کرنا فرض ہے بالخصوص جبکہ احادیث صحیحہ میں پردہ نہ رکھنے کے متعلق وعید شدید آچکی ہے ۔کیا کبھی کوئی وعید شدید کسی فعل مباح کے لئے بھی آیا کرتی ہے ؟

اور یہ خیال کہ رسم پردہ اہل عجم کی تقلید میں اختیار کی گئی تھی محض وہم ہے بلکہ یہ حکم شرعی تھا جس کی تکمیل بزمانہ نزول وحی ہو کر اسپر عملدرآمد شروع ہو گیا تھا ۔ یہ ایک ایسا واضح امر ہے جسکی تحقیق کی کچھ ضرورت نہیں ۔ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ باواز بلند اس حکم ضروری کو پیش کر رہی ہیں ۔ اگر کوئی شخص جاہلانہ ضد پر اڑا رہے یا لغو و بیجا تاویلات سے اس حکم میں کچھ ترمیم کرنا چاہے تو کیا کرے ۔ حق کہیں مٹائے سے مٹ سکتا ہے ؟

اور جہاد میں عورتوں کا حاضر ہونا حکم پردہ کی پابندی کا مانع نہیں ہو سکتا اوّل تو عورتوں کا جہاد میں حاضر ہونا فرض ہی نہیں پھر اگر تیمار داری یا پانی پلانے کی غرض سے مجاہدین کے ساتھ گھر سے نکلیں تو کوئی ممانعت نہیں کیونکہ شریعت اس پر ناطق ہے مگر نتیجہ یہ کی بات تو پھر بھی پوری نہیں ہوتی ۔کیونکہ حدیث حضرت انس رضؓ سے جس میں عورتوں کا جہاد میں موجود ہونا مذکور ہے یہ بالکل مترشح نہیں ہوتا کہ عورتیں بلا حجاب ہر ایک مجاہد کی تیمار داری کیا کرتی تھیں ۔ چنانچہ لفظ

شارح مسلم اس حدیث کی ذیل میں لکھتے ہیں فیہ خروج النساء الی الغزو والانتفاع بھن فی السقی والمداواۃ ونحوھا وھذہ المداواۃ لمحارمھن وازواجھن یعنی اس حدیث سے عورتوں کا جہاد کیطرف نکلنا اور ان سے پانی پلانے اور مرہم پٹی وغیرہ میں منتفع ہونا ثابت ہوتا ہے اور یہ مرہم پٹی وغیرہ کا کام صرف وہ اپنے محارم (باپ۔ بیٹا۔ بھائی وغیرہ) اور اپنے شوہروں کے لئے کیا کرتی تھیں۔سو ایسی شرعی ضرورتوں کے موقعپر اب بھی عورتوں کو باہر نکلنے کی کوئی ممانعت نہیں۔نیچریہ کا قاعدہ ہے کہ مفید مطلب بات کو خواہ وہ کیسی ہی کمزور کیوں نہ ہو جھٹ سند میں لے آتے ہیں اور جو برخلاف ہو خواہ وہ کتنی بڑی حجت ہی کیوں نہ ہو اس سے بندر کی طرح منہ پھیر لیتے ہیں ؎

مَا وردَ فی الاخبار وَالاٰثار

ذیل میں چند احادیث کو قلمبند کیا جاتا ہے تاکہ مخالفین پردہ کو معلوم ہو جائے کہ وہ صاحب شریعت علیہ السلام کی کیونکر مخالفت کر رہے ہیں :-

(۱) عن جریر البجلی قال سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن نظرۃ الفجاۃ فامرنی ان اصرف بصری یعنی میں نے جناب پیغمبرؐ سے کسی عورت کو ناگہاں دیکھ لینے کی بابت سوال کیا تو آپ نے مجھے نگاہ ہٹا لینے کا حکم دیا (درمنثور)

(۲) وعن بریدۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعلیؓ لا تتبع النظرۃ النظرۃ فان لک الاولیٰ ولیست لک الاخرۃ -یعنی جناب پیغمبرؐ نے حضرت علیؓ کو فرمایا کہ نظر کے پیچھے نظر کو مت لگا کیونکہ کسی اجنبی عورت کو پہلی بار کا دیکھنا جس میں کوئی خیال مخالف پیدا نہیں ہو سکتا تیرے لئے موجب گناہ نہیں دوسری بار کا دیکھنا تیرے حق میں بُرا ہے کیونکہ اس میں بُرے خیالات کے پیدا

ہونے کا احتمال قوی ہے) (درمنثور)

(۳) وعن ام سلمة انها كانت عند النبي صلے الله عليه وسلم و میمونة فقالت بينا نحن عنده اقبل ابن ابي مكتوم فدخل عليه فقال رسول الله صلے الله عليه وسلم احتجبا عنه فقالت يا رسول الله اليس هو اعمى لا يبصرنا فقال افعميا وان انتما الستما تبصرانه یعنی حضرت ام سلمہ رض فرماتی ہیں کہ وہ اور حضرت میمونہ رض ہر دو جناب پیغمبر کے پاس موجود تھیں کہ اتنے میں ابن ام مکتوم صحابی جو نابینا تھے آنکلے۔ جناب پیغمبر نے ہمیں حکم دیا کہ پردہ کرو۔ حضرت میمونہ نے فرمایا کہ یا حضرت کیا ابن ام مکتوم نابینا نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا کیا تم بھی نابینا ہو؟ یعنی جس طرح کسی مرد کو اجنبی عورت کا دیکھنا حرام ہے اسیطرح عورت کو کسی اجنبی مرد کا۔

الغرض احادیث میں نہایت وضاحت کے ساتھ حکم پردہ کی ضرورت کو بیان کیا گیا ہے اور اس کی علت وہی انسانی فطری تقاضا ہے جس کی زد سے بجز انبیاء اور دیگر مقربان بارگاہ رب العزت کے کوئی شخص محفوظ نہیں رہ سکتا۔ تعجب ہے کہ کس طرح ظاہری تہذیب پر مرمٹنے والے لوگ اپنے تئیں شیطان اور نفس کی نہایت باریک چالوں سے بری سمجھ سکتے ہیں جبکہ ایک نبی اللہ مقام معذرت میں یوں کہتا ہے وما ابرئ نفسی ان النفس لامارة بالسوء۔ اسلام پاک کی بنیاد طہارت ظاہری اور باطنی اور تقویٰ پر قائم کیگئی ہے اور اس لئے وہ بحکم وذروا ظاهر الاثم وباطنه نہ صرف ایسے گناہوں سے روکتا ہے جو موجب غضب الٰہی ہیں بلکہ وہ تمام ان ابتدائی اسباب اور مواقع سے بھی منع کرتا ہے۔ جن کا استعمال یا جن میں موجود ہونا کسی گناہ کا باعث ہو سکتا ہے۔ اسلام پاک ہمیں سکھلاتا ہے کہ تمہارے تمام اعضاء اور قوے اپنے اپنے اعمال کے جوابدہ ہیں اس لئے ہمیں حکم ہوا کہ اتقوا مواضع التهم یعنی تہمت کے مواقع سے اپنے تئیں بچاؤ۔

معزز ناظرین یہ ہے اسلام پاک کی تعلیم جو نہایت لئے اعلے حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اور ہمارے بعض مغرور اور ناعاقبت اندیش بلا سوچے سمجھے یہ کہہ دیتے ہیں کہ تہذیب کے پھیلنے پر ایسے نتائج منتیجہ پیدا نہیں ہو سکینگے۔ پس آپ خود اندازہ لگالیں کہ اس تہذیب کو حاصل کرکے مسلمان عورتیں کہاں تک اپنی عفت و عصمت کو قائم رکھ سکتی ہیں؟ ایک موٹی سی بات ہے کہ کسی حسین اور نازنین نوجوان عورت کے دیکھتے ہی شیطان دل میں چٹکیاں لینے لگتا ہے۔ کیا کوئی نیچری اس واقعہ کا انکار کر سکتا ہے؟ اگر ایسی حالت میں ہر دو کو خلوت کا موقع مل جائے تو کیا ما بعد کے قابل شرم مراتب پر اقدام کرنے سے کوئی چیز مانع ہو سکتی ہے؟ حاشا و کلا۔ پس یہ بات ہر حالت میں یقینی ہے کہ تم چاہو احکام شریعت کی پیروی کرو یا نفس خبیث کی۔ یہی معنی ہیں اس مشہور مصرع کے

ان النساء حبائل الشیطان ۔ یعنی عورتیں شیطان کے پھندے ہیں ۔

مذکورہ بالا تقریر سے ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ شرعی پردہ کی صورت یہی ہے کہ عورتیں بلا ضرورت گھر سے باہر نہ نکلیں اور اگر نکلیں تو تمام چہرہ اور بدن ڈھانپ کر چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ثالث ص۱۵۰ میں حسب ذیل لکھا ہے والمعنی یغطین بہا وجوھھن وقت خروجھن من بیوتھن لحاجۃ ولا یخرجن مکشوفات الوجوہ والابدان انتہی یعنی عورتیں باہر کسی ضروری حاجت کے لئے نکلتے وقت اپنا چہرہ اور بدن ڈھانپ لیا کریں اور چہرہ اور بدن کو برہنہ چھوڑ کر نہ نکلا کریں ۔

پھر یہی مفسر آگے چلکر لکھتے ہیں واعلم انہ فہم من الایۃ تستان الاول ان نساء ذلک الزمان لا یخرجن لقضاء حوائجھن الا لیلا تستراً و تعففا واذا خرجن نہاراً بضرورۃ یبالغن فی التغطی ورعایۃ الادب والوقار وغض البصر عن الرجال الاخیار والاشرار ولا یخرجن الا فی ثیاب دنیئۃ فمن خرجت من بیتھا متعطرۃ متبرجۃ ای مظھرۃ زینتھا و محاسنھا للرجال فان

علیہا ما علی الزانیۃ من الوزر - یعنی اس آیت سے دو باتیں سمجھی جا سکتی ہیں
اوّل یہ کہ اس زمانہ کی عورتیں قضائے حاجت کے لئے ستر و عفت قائم رکھنے کی
غرض سے رات کو باہر نکلتی تھیں اور جب دن کو نکلا کرتیں تو بدن کے ڈھانپنے اور
ادب و وقار قائم رکھنے اور نیک و بد آدمیوں سے نظر کو ہٹائے رکھنے میں پورا پورا
زور دکھاتی تھیں اور نکلتیں تو کم قیمت لباس میں - سو جب عورت گھر سے عطر وغیرہ
کا استعمال کرکے اور بن ٹھن کر نکلتی ہے جس سے وہ اپنے زیور اور لباس وغیرہ کو
عام مردوں کے سامنے ظاہر کرتی ہے تو اس پر وہی گناہ ہے جو زانیہ عورت پر ہے

چو زن راہ بازار گیرد بزن ❊ دگرنہ تو در خانہ بنشیں چو زن
ز بیگانگاں چشم زن کور باد ❊ چو بیروں شد از خانہ در گور باد

حاصل یہ ہے کہ جو لوگ فطرتِ انسانی کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور انہیں احکام
شریعت اور ان کی عمیق مصلحتوں پر بھی نظر ہے انہیں ہر وقت پاس عصمت کا خیال
دامنگیر رہتا ہے ورنہ بحکم اذا لم تستحی فاصنع ما شئت (جب تو شرم اٹھا دے تو
جی چاہے کیا کر) مغربی اقوام کی تقلید اس امر میں کرنا کوئی مشکل کام نہیں مشکل تو صرف
فرمان خداوندی کا بجا لانا ہے - سبحان اللہ ایک عورت حضرت رابعہ بصریہ رحمہا تھیں -
آپ بیمار ہو گئیں - جب وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا کہ کہیں جنّت کا تصوّر آ گیا تھا
خدا کی جناب سے عتاب ہوا ہے کہ کیا ہمارے سوا غیر کی جانب نظر اٹھانا حلال ہے
سو اس غم میں میری یہ حالت ہو گئی ہے یا ایک ہمارے زمانہ کے مہذب ہیں جو اپنی مستورات
کو غیروں سے ہم آغوش ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں ؎

بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

اور نہایت سفاہت سے اسکا نام ترقی و تہذیب رکھا جاتا ہے - اسکی وجہ بجز
تقلید ملاحدۂ فرنگ اور کچھ بھی نہیں ؎

ہر عیب کہ سلطاں بپسندد ہنر است

لیکن ہم کہتے ہیں ؎

اے دو صد لعنت بریں تقلید باد

ابن سیرینؒ فرماتے ہیں انی لارٰی المرأۃ فی منامی فاعلم انھا لاتحل لی فاصرف بصری۔ یعنی میں کسی اجنبی عورت کو خواب میں دیکھکر اپنی نگاہ اس سے ہٹا لیتا ہوں اس قول سے شدت عفت کا جو مفہوم مترشح ہوتا ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے کسی غیرت مند طبیعت کی ضرورت ہے ۔یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے حدیث ذیل پر عمل کرکے رضائے مولیٰ کا درجہ پایا تھا قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من فاکہ امرأۃً لم تحل لہ ولا یملکھا حبس بکل کلمۃ الف عام فی النار ومن التزم امرأۃ حراماً ای اعتنقھا قرن مع الشیطان فی سلسلۃ ثم یؤمر بہ الی النار والعیاذ باللہ ۔یعنی جو شخص کسی اجنبی عورت سے مذاق یا دل لگی کرتا ہے ایک ایک کلمہ کے بدلہ میں ہزار سال عذاب میں رکھا جائیگا اور جو ایسی عورت سے گلے ملتا ہے شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں جکڑ اجاکر آگ میں جھونک دیا جائیگا ؛

پردہ کے متعلق ایک مغربی عیسائی کا غلط خیال اور اس کا رد دمشق کے ایک مشہور عالم کی طرف سے

دمشق کے روزانہ فرانسیسی اخبار "لنیرکیو" نے اسلامی پردہ پر کسی عیسائی مضمون نگار کا ایک تنقیدی مضمون شائع کیا تھا ۔جس میں اس نے اسلامی پردہ کے خلاف حسب ذیل دلائل قائم کئے تھے :-

(۱) اصولاً پردہ عورت کی عصمت وعفت کا محافظ نہیں ہے بلکہ ایک پاکدامن عورت خود اپنی حفاظت کر لیتی ہے ۔اور پردہ تو صرف عیب و رسوائی

پر پردہ ڈال سکتا ہے۔ پس پاکلا من عورت پر اعتماد کرنا چاہیئے کہ وہ اپنی عزت و آبرو کی خود محافظ ہے۔ اور اُس کی آزادی کو واپس دیدینا ضروری ہے اس کے بعد اگر اُس سے کوئی اخلاقی لغزش بھی ہو جائیگی تو وہ توبہ و پشیمانی کے ساتھ اپنے گناہ کا اعتراف کرے گی ؛

دمشق کے ایک مشہور عالم محمد ہاشم رشید الخطیب نے المرشد العزلی میں اس کے جواب میں ایک بسیط مضمون شائع کیا ہے۔ اور اس عقلی استدلال کا جواب مختلف حیثیتوں سے دیا ہے۔ اولاً تو وہ اس غلط اُصول کا رد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خیال کہ پردہ سے عورت کی حفاظت نہیں ہوتی صریح جھوٹ اور بہتان ہے۔ اگر پردہ عورت کی حفاظت کا ذریعہ نہ ہوتا تو ایک پردہ نشین عورت معزز و ممتاز کیوں قرار پاتی؟ خود خداوند تعالےٰ نے اسی شرف کی بنا پر پردہ دار عورتوں کو لونڈیوں سے ممتاز قرار دیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے ؛

یا یہا النبیؐ قل لازواجك و بنٰتك ونساء المومنین یدنین علیہن من جلا بیبہن ذٰلك ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین۔ اے پیغمبر اپنی بیبیوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ اپنی چادر سے گھونگٹ نکال لیا کریں۔ اس سے غالباً یہ (الگ م) پہچان پڑینگی اور ان کو کوئی چھیڑیگا نہیں

البتہ عورتوں کی نسبت احادیث و آثار میں یہ الفاظ آئے ہیں ؛

رب من کاسیۃ فی الدنیا عاریۃ یوم القیامۃ نساء کاسیات عاریات مائلات ممیلات لا یدخلن الجنۃ۔ اور بہت سی عورتیں جو دنیا میں لباس پہنتی ہیں۔ وہ قیامت کے دن برہنہ ہونگی۔ جو عورتیں لباس پہننے پر بھی برہنہ رہتی ہیں۔ حق سے منحرف ہیں اور لوگوں کو حق سے منحرف کرتی ہیں وہ جنت میں داخل نہ ہونگی ؛

اُن کا تمام تر پردہ بے شبہ اُنکی عصمت و عفت کا محافظ نہیں ہے۔ لیکن قرآن مجید نے اس آیت میں اذا سألتموهن متاعا فاسئلوهن من وراء حجاب ذٰلك اطهر لقلوبكم وقلوبهن اور جب پیغمبر کی بیبیوں سے تمہیں کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے باہر (کھڑے رہ کر) اُن سے مانگو۔ اس سے تمہارے دل (انکی طرف سے) خوب پاک (صاف) رہینگے اور (اسی طرح) اُنکے دل (بھی)۔

جس پردے کا حکم دیا گیا ہے وہ یقیناً عورت کی عصمت و عفت کا محافظ ہے لیکن اس کے ساتھ ہمارا یہ دعوےٰ بھی نہیں ہے کہ پردہ تمام اخلاقی جرائم کا سدباب کر دیتا ہے یا کر سکتا ہے بلکہ وہ عورت کی محافظت کا ایک عادی سبب ہے جیسا کہ دُنیا کی ہر چیز کی حفاظت انہی اسباب عادیہ سے ہوتی ہے مثلاً لعل و جواہر کی حفاظت لوہے کے صندوقوں کے ذریعہ سے کیجاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی چور ان صندوقوں کو توڑ ڈالے تو کیا اس سے یہ ثابت ہو سکے گا۔ کہ اِن صندوقوں میں جواہرات کا رکھنا ایک قسم کی حماقت ہے؟ جن مریضوں کی موت آنے والی ہے وہ کتنے ہی علاج کریں۔ اُن کو موت کے پھندے سے رہائی حاصل نہ ہو سکے گی۔ باایںہمہ اور بہت سے مریضوں کو دوا سے یقینی طور پر شفا حاصل ہو جاتی ہے۔ اور انہی طبی اسباب عادیہ کے اعتماد پر گو ہزاروں مریض مر جاتے ہیں۔ لیکن لوگ دوا کا استعمال ترک نہیں کرتے؛

اسلام نے عورتوں کو جو آزادی دی ہے اُس کے واپس کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس آزادی کے معنے یہ نہیں ہیں کہ عورتیں بے پردہ ہو کر منظرِ عام پر نمایاں ہو جائیں۔ بلکہ اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو ہر قسم کے مالی اور خانگی تصرفات میں آزاد رکھا ہے اور انکی حیثیت اس قدر ممتاز کر دی ہے۔ کہ وہ نہ صرف لونڈیوں کے لئے بلکہ غیر مسلم عورتوں کے لئے بھی موجب صدر رشک و غبطہ بن گئی ہیں۔ اسلام نے پردے کے ذریعہ سے اُن کو اپنی عصمت و عفت کی

حفاظت کا جو ذمہ دار قرار دیا ہے وہ بھی اس مخصوص آزادی کا لازمی نتیجہ ہے

(۲) عقلی حدود سے نکل کر اس عیسائی مضمون نامہ نگار نے معاشرتی حیثیت سے اسلامی پردہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اسلام میں بہت سے مرد ایسے ہیں جن سے عورتوں کو پردہ کرنا چاہیئے۔ لیکن مروت کی بنا پر ان سے پردہ ناممکن ہے۔ کیا کوئی شخص اپنے بھائی یا بھتیجے کو گھر میں آنے سے روک سکتا ہے؟ حالانکہ ان سے پردہ کرنا ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بھائی کا اپنے بھائی کی بی بی کو دیکھنا اور بھتیجے کا اپنے چچا کی عورت پر نگاہ ڈالنا اسلام میں ممنوع ہے اور اس صورت میں اقتضائے مروت پر عورت صرف اس قدر عمل کر سکتی ہے کہ خود ان سے چھپ جائے اور بھائی کو بھائی کے اور بھتیجے کو چچا کے گھر میں آنے سے نہ روکے لیکن مشتبہ حالت میں روک ٹوک ہی عین مروت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے جب مردوں اور عورتوں کے اختلاط اور میل جول کی ممانعت فرمائی تو شوہر کے اعزہ کی نسبت آپ سے سوال کیا گیا۔ اور آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "وہ تو موت ہیں" جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ان لوگوں کے میل جول سے ایک مسلمان عورت کو اور بھی شدت سے احتراز کرنا چاہیئے۔ غرض اسلام ایک ایسا باغیرت مذہب ہے کہ مشتبہ حالت میں باپ اپنی بہو کو اور بیٹا اپنی ماں کی طرف بھی باوجود جواز کے نگاہ نہیں اُٹھا سکتا اور اگر مبتلائے گناہ ہونے کا احتمال ہو تو ان میں سے کوئی دوسرے کے گھر میں بھی نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم قوموں کو جب یہ نظر آتا ہے کہ ان کے یہاں عورتوں اور اجنبی مردوں کے میل جول اور بات چیت کا عام رواج ہے تو ان کے دلوں میں غیور مسلمان ہونے کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے۔

اس دو قدرح کے بعد علامہ محمد ہاشم نے خود اس عیسائی مضمون نگار کے دوسرے ہم مذہب ارباب فکر و بصیرت کی رائیں پردے کی تائید میں نقل کی ہیں مثلاً

ایک عیسائی کہتا ہے۔ کہ جب کسی غیر قوم کے بے پردہ بی بی سے اُس کا شوہر یا اُس کا کوئی اور قریبی عزیز بطور اخلاقی باز پُرس و مواخذہ کے یہ سوالات کرتا ہے کہ فلاں شخص نے تم سے بڑی دیر تک گفتگو کی۔ "فلاں شخص تم کو گھور رہا تھا" فلاں شخص سے کیوں اس لطف و محبت سے ملتی ہو۔" جب تم فلاں شخص کے قریب گئیں تو تمہیں نگاہ دلفریب و تبسم شیریں کو خاص طور پر دیکھا" تو اس صورت میں اگر جھگڑا چکانے کے لئے اُس نے ان باتوں کا اعتراف کر لیا تو گویا خود اپنے آپ کو مشتبہ بنا لیا اور اگر اعتراف نہیں کیا تو باہم سخت اندرونی نزاعوں کے پیدا ہو جانے کا احتمال ہے ۔

مقدس پوپ نے ایک خط میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "روما میں جو عام جلسے کئے جاتے ہیں اُن کی تنظیم کرنی چاہئے۔ کیونکہ انحطاط روما کے سخت ترین دور میں بھی عورتوں کو اس قسم کے جلسوں میں شرکت کی اجازت نہ تھی۔"

علامہ محمد ہاشم نے اس قسم کی اور بھی بہت سی رائیں نقل کی ہیں۔ اور اخیر مضمون میں یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ علمہ تمدن و اجتماع کے بڑے بڑے علماء اب پردے کی فضیلت کو تسلیم کرنے لگے ہیں اور وہ اس کے متعلق موجودہ زمانہ کی حالت کے مناسب اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے جس طرح امریکہ نے شراب نوشی کا انسداد کر دیا ہے۔ اور بہت سے ارباب نظر طلاق اور تعدد ازدواج وغیرہ کے جواز پر غور کر رہے ہیں۔ اسی طرح ممکن ہے کہ یہ لوگ پردے کی ضرورت کو تسلیم کر لیں ۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ غیرت اسلامی سے کام لیں اور نیچریہ کی چکنی چپڑی باتوں پر مت جایا کریں۔ یہ جماعت ہے اعداء اللہ اور اعداء الرسول کی اور انہیں بجز ظاہر داری اور نفس پرستی کے شریعت حقہ سے کچھ تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اُمت کو مخالفت کرتے دیکھ کر ان کو بُرے الفاظ سے یاد کیا کرتے ہیں۔ پردہ

حکم خداوندی ہے اور عورتوں کی دینی و دنیوی بہتری اسی پردہ میں ہے ...

مکن بر کار زن چنداں مبہوری
کہ افتد رخنہ در سدِّ غیوری

ولنعم ماقیل ؂

چو بینی کہ زن پائے بر جائے نیست ٭ ثبات از خرد مندی و رائے نیست
گریز از کفش در دہان نہنگ ٭ کہ مردن بہ از زندگانی بہ ننگ

وللہ در القائل ؂

چہ خوش گفت جمشید با رائے زن
کہ یا خانہ یا گور بہ جائے زن

تعلیم نسواں

مردوں اور عورتوں کے قوائے جسمانی و دماغی میں جو تفاوت رکھا گیا ہے اس سے کس شخص کو انکار ہو سکتا ہے؟ اسی تفاوت پر ان کے فرائض اور ذمہ داریاں بھی مردوں کے فرائض اور ذمہ داریوں سے مختلف ہیں۔ مرد ہو یا عورت ہر دو کیلئے انسان ہونے کی حیثیت سے نفس تعلیم کی ضرورت یکساں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ مگر قابل غور امر یہ ہے کہ آیا ہر دو کے لئے نوعیت تعلیم اور طریق تعلیم یکساں ہونا چاہئے یا نہیں۔ عورتوں کے لئے احکام شریعت۔ اخلاق حسن معاشرت اور ایک حد تک علم سیر و تواریخ اور حساب وغیرہ کی ضرورت ہے۔ ہاں بعض عورتوں کے لئے علم المعالجات کا حاصل کرنا ممنوع نہیں۔ عورتوں کی نوعیت تعلیم یہیں تک محدود

ہونی چاہیے۔ کیونکہ تمدن و معاشرت میں اس تعلیم سے وہ مہذب کہلا سکتی ہیں۔ اور اپنے تمام فرائض اور ذمہ واریوں کو احسن طریق سے انجام دے سکتی ہیں +

(۲) طریق تعلیم۔ سو اس کی نسبت اس امر کا سمجھ لینا کافی ہے کہ عصمت و عفت مستورات کا طبعی حق ہے۔ مستورات کا موجودہ طریق تعلیم شریعت اسلامی کے رو سے سخت قابلِ اعتراض بلکہ حرام مطلق ہے کیونکہ پردہ جو حکم شرعی ہے اُٹھ جانے پر عصمت و عفت کا تو نام و نشان بھی باقی نہیں رہ سکتا جس کا مفصل بیان حکم پردہ کے مضمون میں پہلے آچکا ہے۔ یہاں اس کے دُہرانے کی ضرورت نہیں جو لوگ مغربی عورتوں کی تعلیم و تربیت کو مسلمان عورتوں میں رواج دینے کے دلدادہ ہیں وہ یقیناً ہماری اِس رائے سے متفق نہیں ہونگے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ تعلیم مذہب کے نہ تو خود پابند ہیں اور نہ اپنی اولاد کو پابند بنانا چاہتے ہیں سو یہ لوگ بمقابلہ حکم شرعی مروجہ نام نہاد تہذیب کو جس میں ظاہری بناوٹ کے سوا کچھ بھی نہیں رکھا اپنی ذاتی رائے کی بناء پر زیادہ اہم خیال کرتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ بحکم حدیث اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ یعنی ؎

بے حیا باش و ہرچہ خواہی کُن

اس بحث میں ہمارے مخاطب ہی نہیں۔ مستورات کے مروجہ طریق تعلیم کی برائیاں اس قدر ہیں کہ ان صفحات میں ان کا ذکر کرنا ہم جائز نہیں سمجھتے۔ تجربہ و مشاہدہ ہماری اس رائے کی تصدیق کے لئے شاہد عدل ہیں۔ ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ مروّجہ طریق تعلیم کے مؤید صرف وہی لوگ ہیں جو احکام شریعت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے انہیں غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ لوگ اعداء اللہ اور اعداء الرسول کی جماعت میں داخل ہیں جو مختلف قسم کی چکنی چپڑی باتوں سے اپنے تئیں مصلحانِ قوم و ہمدردانِ اسلام ظاہر کرتے ہیں مگر فی الحقیقت ان لوگوں سے بڑھ کر کوئی بھی

بدخواہ قوم نہیں ہو سکتا ؎

اِذَا کَانَ الْغُرَابُ دَلِیْلَ قَوْمٍ
سَیَھْدِیْھِمْ اِلٰی اَرْضِ الْجِیَافِ[1]

بعض جہال اپنے بیہودہ خیالات کی تائید میں حدیث طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَۃٍ پیش کرکے عام لوگوں کو دھوکا دیا کرتے ہیں مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ جس علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے وہ صرف علم شریعت ہے جو اصلاح عقائد و اعمال پر مشتمل ہے نہ علوم اقتصادیات۔ فلسفہ و سائنس وغیرہ جو بسا اوقات راہزن دین و اسلام ثابت ہوتے ہیں۔ دیکھو قرآن مجید میں جہاں ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کو دعوت اسلام دیتے ہیں یوں فرماتے ہیں یَا اَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِکَ فَاتَّبِعْنِیْٓ اَھْدِکَ صِرَاطًا سَوِیًّا۔ یعنی اے باپ مجھے خدا سے وہ علم ملا ہے جو تجھے نہیں ملا۔ تو میری پیروی کر میں تجھے سیدھے راستہ کی ہدایت کرونگا۔ کیا اس آیت میں علم سے مراد علم معرفت ذات باری ہے یا سائنس و فلسفہ یا ناول خوانی؟ دوسری جگہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یوں تلقین کیگئی ہے قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا یعنی خدایا میرے علم کو اور بھی بڑھا۔ کیا یہاں بھی علم سے فلسفہ و سائنس و جغرافیہ و اقتصادیات و ناول خوانی مراد ہیں؟ سلف صالحین میں اہل علم کی اصطلاح صرف ان لوگوں تک محدود تھی جو علم شریعت یا یوں کہو کہ عقائد و اعمال کا صحیح علم رکھتے تھے مگر ہمارے مغربی تہذیب کے دلدادگان نے اس اصطلاح کو بہت برے معنی میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔

تاریخ اسلام کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر ایک زمانہ میں عورتیں کم و بیش تعلیم یافتہ ہوتی رہی ہیں۔ مگر انہوں نے اپنی عصمت و عفت کے حق کو کبھی بھی زائل نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ زمانہ نبوت میں خاندان نبوت کی حضرات مستورات علم و ادب سے کافی

[1] یعنی جب کسی قوم کا راہنما کوا ہو تو وہ انہیں مردار خواری ہی کی ہدایت کریگا ۱۲ منہ

بہرہ اندوز تھیں۔ جناب سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالےٰ عنہا اور اُم المومنین حضرت ام حبیبہ وغیرہ بہت ممتاز تھیں۔ جناب سیدۃ النساء نے حضرت رسول اللہ صلےٰ اللہ علیہ و آلہ وسلم کے غم وفات میں ایک مرثیہ تحریر فرمایا جو آجتک فصاحت و بلاغت کے اعلےٰ نمونوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حضرت ام ورقہ بنت نوفل بنت عبداللہ ام المومنین حضرت ام سلمہ اور ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر طبقہ اوّل کے حفاظِ قرآن میں سے ہیں۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا علاوہ حافظ قرآن ہونے کے محدثہ اور مجتہدہ مانی گئی ہیں۔ کیونکہ آپ سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں اور بعضوں نے کہا ہے کہ شریعت محمدیہ کے چوتھائی احکام آپ سے منقول ہیں۔ بعد وفات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم حضرات شیخین رض آپ سے اکثر مسائل حدیث وسُنن دریافت فرماتے اور آپ کے اجتہاد کو تسلیم فرماتے تھے۔ آپ کی صائب رائے و راستی ادراک اسی سے ظاہر ہے کہ آپ کا ایک قول یا آپ کی روایت کی ہوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں۔ جو عقلاً یا درایتاً نادرست یا ضعیف ہو۔ فن روایت میں بھی آپ کو اچھی مہارت حاصل تھی۔ سولہ ہزار اشعار حفظ تھے جو اہلِ عرب کا تاریخی سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔ آپ اکثر نعتیہ اشعار تصنیف فرماتیں۔

مسلمان بیبیاں عام طور پر علوم میں حصہ لیتی تھیں۔ چنانچہ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ دمشق کے مشہور مؤرخ ابن عساکر نے جن اساتذہ سے فن حدیث حاصل کیا تھا۔ ان میں اسّی سے زیادہ عورتیں تھیں۔

حضرت رابعہ بصریہ نے جو تبع تابعین میں سے تھیں۔ فرقان حمید پر ایسی قدرت پائی تھی کہ مؤاخذہ آخرت سے خوف زدہ ہوکر عہد کرلیا تھا کہ آیات قرآنی ہی سے اپنے ہر مفہوم کو ادا کیا کرونگی چنانچہ بقیہ عمر یعنی چالیس سال سے زائد اسکی پابند رہیں۔ ایسی نظیر تمام تواریخ و سِیَر میں نہ پاؤگے۔

جعفر ابن منصور عباسی کی بیٹی زبیدہ خاتون علاوہ علوم کے تدابیر ملکی میں بھی دخل رکھتی تھی۔ اس کا شوہر خلیفہ ہارون الرشید اکثر امور مملکت میں اسکی رائے صائب سے فائدہ اُٹھایا کرتا تھا۔ عربی اور فارسی میں شعر اچھا کہتی تھی۔ اپنے بیٹے امین کے مرثیہ میں کہتی ہے ؎

اے جانِ جہاں جہاں ناخوش بے تو ؛ بغداد پریشان و مشوش بے تو
رفتی تو و من بے تو بماندم فریاد ؛ تو در خاکی و من در آتش بے تو

خاندانِ عباسیہ کی اور شاہزادیاں بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ شاہزادیاں تو شاہزادیاں کنیزیں تک بھی فصاحت و بلاغت شاعری خطاطی اور دیگر علوم میں کامل مہارت رکھتی تھیں۔ جس سے تاریخ بالکل ساکت نہیں ؛

امام یزید ابن ہارون اخیر عمر میں ضعف بصارت کی وجہ سے کتاب دیکھنے سے معذور ہو گئے تھے۔ ان کی لونڈی بوقت ضرورت انکے لئے حدیثیں اخذ کرکے یاد کر لیا کرتی تھی ؛

تذکرۃ الحفاظ میں ہے کہ ایک بار ابن سماک کوفی نے جو اپنے عہد کے مشہور عالم تھے تقریر کرنے کے بعد اپنی جاریہ سے پوچھا میرا طرز بیان کیسا ہے ؟ سخن شناس جاریہ نے کہا کہ تقریر تو اچھی ہے لیکن اتنا نقص ہے کہ آپ ایک ہی بات کو بار بار کہتے ہیں۔ علامہ نے کہا کہ میرا اعادۂ کلام اس لئے ہے کہ جو مخاطب اوّل مرتبہ نہ سمجھے ہوں وہ سمجھ جائیں۔ تو جاریہ نے کیا ہی معقول جواب دیا کہ جب تک کم فہم سمجھینگے سمجھنے والے مکدر ہو چکے ہونگے ؛

اس کے بعد اہلِ عجم کی تاریخ میں بھی مستورات کی اعلےٰ درجہ کی قابلیت کا ثبوت ملتا ہے۔ جس کا ذکر بخوفِ تطویل نظر انداز کیا جاتا ہے ؛

میرے نزدیک تعلیم مستورات بہرصورت ایک امر مہتم بالشان ہے اور ان کی

تعلیم کی طرف متوجہ نہ کرنا اس صنف نازک پر نار وا ظلم وستم کا مترادف ہے۔ کچھ عرصہ ہوا پنجاب کی ایک قومی مجلس میں مستورات کی نسبت مروّجہ تعلیم کی ضرورت کا مسئلہ پیش ہوا۔ جس کے متعلق ایک طویل بحث کے بعد ضرورت تعلیم مروّجہ کا فیصلہ صادر کیا گیا۔ اس فیصلہ پر پنجاب کے ایک معزز ایڈیٹر اخبار نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا تھا جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے :۔

"اگر علم کی حقیقت کو دیکھا جائے تو ایک روشنی اور ایک دریافت کی وجہ اور علت کا نام علم ہے بغیر کسی زبان کی تخصیص کے جیسے اندھیری کوٹھڑی میں چراغ کا نور ہادی ہے جیسے دریا کے سفر میں ستارے راہبری کرتے ہیں۔ یہی علم ہے اسی کا نام علم ہے اور یہ ایک کار آمد اور ضروری چیز ہے۔ اور کوئی عقلمند اور ذی فہم یہ چاہے گا بھی نہیں کہ ہم زندگی بھر سویا کریں اور اس دنیا سے جب اُس عالم میں جائیں تو کسی شے کا ادراک نہ کیا ہو اور کسی شے کی ماہیت نہ سمجھی ہو یہ سب کچھ درست ہے۔ اور اسی کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ لیکن وہ مجدد (الخیال) کون ہیں جو یہ سمجھ چکے ہیں کہ علم کے معنی انگریزی تعلیم ہے اور تعلیم یافتہ سے مراد انگریزی انٹرینس پاس ہے اور عربی کا منتہی مراد نہیں؟ اگر عورتوں کو تعلیم دلانا منظور ہے تو ضرور دلواؤ لیکن مسلمانی کا حق کیوں مٹائے دیتے ہو۔ مذہب کی تعلیم سے کیوں اجتناب ہے؟ کیا تعلیم کی صورت میں بھی جدید خیالات پورے کرنے ہیں کہ مسٹر اور مسز کے معزز اور خوشنما خطاب حاصل کئے جائیں؟ اگر یہی مطلب ہے تو صاف صاف کہو۔ اپنے ساتھ دوسروں کی مٹی خراب نہ کرو۔ مسلمانو! سنو۔ انگریزی تعلیم کا اثر دیکھو کہ انگریزی تعلیم کس قدر حفاظت اسلام کی ذمہ دار ہے؟ سمجھو۔ میں ایک نئی اور سچی مثال پیش کرتا ہوں۔ یہ آج سے دو روز پہلے کا واقعہ ہے کہ لکھنؤ کے مشہور محلوں میں باورچی ٹولہ بھی ایک محلہ ہے جہاں مسلمان کثرت سے آباد ہیں۔ اسی محلہ میں ایک شریف مسلمان جو علاوہ

شرافت و نجابت کے ایک معزز خاندان کے رکن یادگار ہیں رہتے ہیں۔ اس بزرگ نے اپنی آنکھوں پر غفلت کے پردے ڈال کر اپنی کم سن لڑکی کو انگریزی مدرسہ نسواں میں بھیج دیا۔ لڑکی صرف دو سال تک آتی جاتی رہی جس طرح سکول کے لڑکے ۱ بجے سے ۴ بجے تک آمد و رفت کی منزل طے کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں اس لڑکی کے اوضاع و اطوار میں فرق پیدا ہو گیا۔ عقائد میں ضعف آ گیا۔ لیکن بنائی ہوئی پردہ پوشیوں نے ماں باپ پر کوئی راز ظاہر نہ ہونے دیا۔ اب ضرورت ہوئی کہ لڑکی کو سبق پڑھا کر پکا کیا جائے تاکہ جو امر کل ہونا ہو آج ہی ہو جائے۔ لہٰذا لڑکی کو ضعف دماغ کے معانی سمجھا کر اور درد سر کی دوا کا حکم دے کر شفاخانہ روانہ کیا گیا۔ یہ لڑکی وہاں سے دو مہینے تک واپس نہ ہوئی تو ماں باپ کی آنکھوں سے غفلت کے پردے اٹھے اور انہوں نے لڑکی سے مضطربانہ ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ دو ماہ کے بعد صاحبزادی ایک چپڑاسی اور کئی ایک لیڈی ڈاکٹروں کی حفاظت میں آئی اور پہلا فقرہ جو سلام کے بعد والدین سے کہا گیا یہ تھا کہ "ماما اب ہم تمہارے کام کے نہیں رہے۔ جو دین حق تھا وہ پسند کر لیا اور برے دین اسلام کو ترک کر دیا۔ اس کے بعد پولیس کی معرفت لڑکی مشن کے حوالہ کر دی گئی۔" فاعتبروا یا اولی الابصار۔ کیا اسی کا نام حفاظتِ اسلام ہے ؎

گر ہمیں مکتب است و ایں ملا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

جناب یہ افسانہ یا قصہ یا شاعرانہ خیال نہیں بلکہ ایک واقعی بات ہے جو عرض کی گئی۔ اس قسم کی ناہنجار اور قابلِ شرم مثالیں ملک میں کثرت کے ساتھ مشاہدہ میں آچکی ہیں۔ مگر ہمارے مروجہ تعلیم کے دلدادگان اس عفت و عصمت کی تباہی اور دین حق کی تذلیل و توہین کو قومی ترقی و تہذیب بتلایا کرتے ہیں انا للہ و انا الیہ راجعون خاکسار مؤلف کے نزدیک مسلمان لڑکیوں کو انگریزی مروجہ تعلیم دلانا جس کا

لازمی نتیجہ کسی ایک احکام شرعیہ کا محو کرنا ہے شرعاً حرام ہے۔ مگر آثار میں وارد ہوا ہے کہ کسی قوم کی ذلت وادبار کا نشان یہ ہے کہ وہ تعلیم وحی سے منہ موڑ کر ایسے علوم میں لگ جائے جو عالم آخرت میں کچھ مفید نہیں۔ مگر نباچرہ کب سنتے ہیں۔ وہ وقت قریب آگیا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجودہ اسلامی امت کو مٹا کر ایک دوسری قوم کو حامئ اسلام پیدا کرے ۔

ہمیں یقین ہے کہ ملحدین ہماری مذکورہ بالا سطور کو پڑھ کر ناک بھوں چڑہائینگے مگر گفتگو یہ ہے کہ ان لوگوں کو پہلے مذہب کی اہمیت اور ضرورت کا مسئلہ ذہن نشین کرانا چاہیئے۔ کیونکہ یہ لوگ مذہب کی ضرورت کو صرف ایک فیشن کی حد تک محدود سمجھے بیٹھے ہیں مگر ہمیں اُن سے یہ کہنا ہے کہ ہم نے بربنائے احکام شرعی جو کچھ لکھنا تھا لکھدیا تمہارے چیں برجبیں ہونے پر حق گوئی سے باز نہیں رہا جا سکتا ہے

مارا بحق کار است گو خواجہ رضی مباش

افسوس ہے کہ دیوثیت کا نام تہذیب رکھا جاتا ہے ۔ ع

برین عقل و دانش بباید گریست

مسئلہ نکاح وطلاق

(۱) ازدواج اور حسنِ معاشرت صحیح معنی کے رو سے باہم لازم و ملزوم کا تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ اسلام پاک فطرتِ الٰہیہ کا صحیح نمونہ ہے۔ اس لئے انسان کی اعلےٰ اور عمدہ زندگی کے ہر ایک طریق پر بحث کرنا اس کا ضروری فرض ہے۔

ضرورت ازدواج اور اس کے تمدنی۔ اخلاقی اور دینی مصالح میں کسی کو کلام نہیں
روئے زمین کی تمام قوموں کا اس امر میں متفق ہونا کافی شہادت ہے۔ اس
امر کی ازدواج مقتضائے فطرت انسانی ہے مجھے صرف اسی ایک بدیہی امر
کی نسبت بحث کرنا مطلوب نہیں بلکہ میں اس وقت یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ
اس ضروری اور اہم فرض کے متعلق جس طریق کی اسلام مقدس نے تعلیم کی
ہے وہ دیگر مذاہب کی نسبت زیادہ سہل اور نتیجہ خیز ہے۔

(۲) ضرورت ازدواج کے متعلق صرف یہی کہنا کافی ہے کہ حفاظت حقوق
کا خیال انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ کیونکہ جب تک کوئی شخص اپنے حقوق کا
مالک نہیں وہ کبھی کسی قسم کی ترقی نہیں کرسکتا۔ اسلئے ہم فطرتاً تمام ایسے
اسباب کی خواہش کرینگے جن سے ہمارے حقوق کی (خواہ فطری ہوں یا غیر فطری)
پوری پوری حفاظت ہوسکے۔ ہم فطری حقوق کی حفاظت بذریعۂ ازدواج یوں
کرسکتے ہیں کہ جس قدر حیوانی قوتیں ہم میں ودیعت رکھی گئی ہیں ان کا مقتضا ایسے
طور پر حاصل کریں جس سے دیگر بنی نوع کے حقوق میں کسی قسم کی دست اندازی نہ ہو
کیونکہ اس صورت میں ہم اپنی آزادی کو ایسے طور پر استعمال نہیں کرینگے جس میں دیگر
بنی نوع کا اضرار منظور ہو ورنہ انسانی فہرست سے ہمارا نام کٹ کر بہائم کی فہرست
میں لکھا جانا زیادہ موزوں ہوگا۔ غور کرکے دیکھ لو کہ جس قدر قوائے شہوانیہ
کو برخلاف صورت ازدواج استعمال کرنے کی صورتیں ہیں کسقدر مستلزم قبائح
ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے ہر ایک کے متعلق سخت وعیدیں
عائد کی ہیں۔ سب سے مشہور صورت زنا کی ہے۔ اس کی نسبت حکم دیا [1] ولا
تقربوا الزنی انہ کان فاحشۃ وساء سبیلا۔ حکمت اس نہی کی یہ ہے کہ

[1] زنا کے قریب بھی مت پھٹکو کیونکہ وہ ایک امر شنیع ہے اور برا طریق ہے ۱۲ منہ

زنا سے نسب تلف ہوتی ہے اور تربیت انسانی کا کوئی نظام کلی باقی نہیں رہتا۔ اور نہ ہی کسی قسم کی ہمدردی اور شرکت رنج و راحت متصور ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہمارے ترکہ اور دیگر حقوق کی حفاظت ممکن ہے حالانکہ تسلیم کیا گیا ہے کہ انسانی تمدنی اجتماع کا روح و رواں یہی امور ہیں۔ ہم اپنے تمام قوائے فطریہ کو ان کے حقوق دیتے ہیں مگر اسی حد تک کہ موجب خلل نظام ثابت نہ ہوں۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ فطرت اس حد سے زیادہ ہم سے تقاضا بھی نہیں کرتی۔ ان قوائے شہوانیہ کو ناجائز استعمال میں لانے کی باقی صورتیں اس قابل نہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ کیونکہ وہ اس قدر مضرت آمیز ہیں کہ ان کو بجز ایک ایسے شخص کے جو حقیقت انسانی سے مسخ ہو کر طویلہ بہائم میں شامل ہو گیا ہو کوئی دوسرا ہرگز اختیار نہیں کر سکتا۔ الغرض ازدواج انسانی زندگی کے اعلےٰ سے اعلےٰ نمونے کے قائم کرنے میں جزو اعظم ہے ؛

(۳) اسلام میں کثرت ازدواج کا حکم ہے ؛

کسی مسئلہ کی حقیقت کو نہ سمجھنا اور بے سمجھے ایک اعتراض جڑ دینا بیوقوفی اور حماقت کی دلیل ہے۔ کثرت ازدواج کا اتہام مقدس اسلام پر یورپ کے بعض متعصب عیسائیوں کا تراشا ہوا ہے۔ چونکہ ہمارے بعض نوتعلیم یافتہ اصحاب کے دماغوں میں بھی دیکھا دیکھی ایک اُلجھن سی پیدا ہو رہی ہے اس لئے بغرض رفع اتہام اس کی حقیقت کو کھولنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ اسلام مقدس کثرت ازدواج کا مجوز ہے نہ موجب۔ قبل اس کے کہ اس دعوے کو دلیل سے ثابت کیا جائے یہ ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جواز امر اور وجوب امر میں بڑا فرق ہے۔ کسی امر کے جواز کا صرف یہ مطلب ہوا کرتا ہے کہ اس کے کر لینے میں کسی قسم کا شرعی مواخذہ نہیں مگر کسی امر کے وجوب سے اس امر کا بجالانا لازم ہو جاتا

ہے اور بصورت ترک ایسا شخص گنہگار رہ کر قیامت کو جوابدہ ہوگا۔ متعصب مصنفین یورپ نے جس قدر اعتراض اس مسئلہ کے متعلق عائد کئے ہیں سب کے سب جواز و وجوب میں فرق نہ کرنے پر مبنی ہیں کیونکہ اکثر نے یہی لکھا ہے کہ اسلام کثرتِ ازدواج کا حکم دیتا ہے۔ اس جملہ سے عام طور پر بعض ناواقفوں نے یہ سمجھ لیا کہ اسلام حکماً کثرت ازدواج پر مجبور کرتا ہے۔ حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ اب رہا یہ امر کہ اس مسئلہ میں جواز کی کیا صورت ہے؟ سو معلوم ہونا چاہیئے کہ معترضین نے یہ اعتراض آیہ فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلٰث ورباع پر وارد کیا ہے۔ اور عجیب قسم کی ملمع تقریروں سے اس پر زور دیا ہے۔ بالخصوص پادری لوگ بہت کچھ شور وغل مچایا کرتے ہیں مگر حق یہ ہے کہ یہ لوگ دیانت و تقویٰ سے ہرگز کوئی بات منہ سے نہیں نکالتے۔ اسلام کی ہر ایک بات پر گو وہ کوئی اعلیٰ خوبی ہی کیوں نہ ہو اعتراض کر دینا ان کا فرض منصبی ہے۔ کیونکہ وہ اپنا روزنامچہ اسی قسم کی کارروائیوں سے پُر کرتے ہیں۔ مگر میں اس لغو اعتراض کے رد میں الزامی اور تحقیقی طور پر حسب ذیل عرض کرتا ہوں۔ اُمید کہ ناظرین توجہ سے کام لینگے:۔

حسب ضرورت انسانی ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت نہ دینے سے آج عیسائی اُمت کا یہ حال ہو رہا ہے کہ وہ دُنیا کے تمام مذاہب میں ناپاک اور خلاف فطرت مذہب شمار کیا جاتا ہے۔ تمام عیسائی ممالک میں زنا ان لوگوں کی طبیعت ثانیہ بن چکا ہے عصمت وعفت کا کہیں نام ونشان تک باقی نہیں رہا۔ انگلستان کی ایک شریف عورت لنڈن کے پال مال گزٹ میں اپنی ہم ملک عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ غالباً انگلستانی عورتوں میں بہت ہی کم ایسی عورتیں ملینگی جو عصمت وعفت کا صحیح دعویٰ کرسکیں ہمیں مشرقی ممالک کی خواتین پر رشک آتا ہے کہ وہ کیونکر انسانیت کے اعلےٰ سے اعلےٰ حقوق کی مالک ہیں۔ ہماری آزادی نے ہمیں ننگ وناموس کا دشمن بنا دیا ہے۔ اس کے

بعدوہ عورت اس خرابی کے وجوہ قلمبند کرتی ہے جن میں پردہ کا اُٹھادینا[له] اور نکاح ثانی کی ممانعت کو بھی شامل کیا ہے - میرے پاس دو معتبر اور معزز تعلیم یافتہ آدمیوں نے جو انگلستان میں مدت رہ آئے ہیں بیان کیا کہ زنا کی یہ حالت ہے کہ بہائم کی طرح لب سڑک عورت و مرد مشغول ہیں اور اس بارہ میں ذرا بھی حجاب نہیں ہوتا - اگر کوئی زیادہ پاس شرم کرے تو سڑک کی جانب کو اپنا چھاتا تان لیتا ہے - پیرس وغیرہ شہروں میں اس سے بھی بدتر نقشہ بدفطرتی کا نظر آتا ہے - وہاں ربڑ کی مصنوعی عورتیں جماع کے لئے استعمال کی جاتی ہیں - پادری صاحب جرجیس انگریزی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ عیسائی مذہب کی بدنامی اور ذلت کا باعث پوپوں کی اندرونی کارروائی ہے - یہ لوگ زنا کے مشتاق اور ہر ایک قسم کی نفس پرستی کے دلدادہ ہوتے ہیں اور ان کے گرجا رنڈیوں کے چکلے ہوتے ہیں - ایک سے زیادہ عورت سے نکاح ناجائز بتلاتے ہیں - مگر زنا میں ان کا نمبر سب سے اول رہتا ہے - پادری اسحٰق ٹیلر جو مدتوں ممالک افریقہ میں رہا ہے اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے کہ عیسائی مذہب کی اشاعت اسلامی ممالک میں ناممکن ہے کیونکہ عیسائیت کی تعلیم اس قابل نہیں کہ فطرت کے معیار پر لوگ اس کا موازنہ کر سکیں - یہ لوگ جن باتوں کو اسلام کے حق میں قابل اعتراض بتلاتے ہیں ان میں خود نہایت ہی بری روش سے گرفتار ہیں - اسلام قواعد شریعت کی پابندی بتلاتا ہے اور کسی امر خلاف شریعت کو جائز نہیں رکھتا - عیسائی ممالک میں خود اولاد الحرام کے لئے غریب خانوں کا قائم کرنا عیسائی اُمت کی زناکاری کا اعلےٰ ثبوت ہے - دیکھیئے باوجود تقدس کے جب جرجیس پادری نے وہ تالاب صاف کروایا جو اس گرجا کے متعلق تھا جس میں مجرد عورت و مرد عیسائی دین سے مقدس بنکر رہتے تھے تو اس تالاب میں سے سینکڑوں کھوپریاں حرامی بچوں کی نکلیں اور

[له] حکم پردہ کے متعلق ہم نے اسی کتاب میں مفصل و مدلل بحث کر دی ہے ۱۲ منہ

جو ادھر اُدھر پھینک دئے گئے یا کہ حمل گرائے گئے۔ انکا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں حال ہی میں اکثر اصحاب نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ ایک پادری صاحب علاقہ جنوبی ہند کے ایک لڑکیوں کے یتیم خانہ کے مہتمم تھے وہ سولہ لڑکیاں یتیم لڑکیوں سے منہ کالا کرکے انگلستان بھاگ نکلے جہاں سے وہ بذریعہ وارنٹ طلب کئے گئے۔ معلوم نہیں کہاں کی سینر کی ہوگی؟ پنے یہ نظائر جن کی اصلیت میں کسی کو شک وشبہ نہیں محض بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کئے ہیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ معترضین کا اسلامی شریعت سے انحراف کرنا کن برائیوں کا مستلزم ہے؟ کاش! اگر یہ لوگ فطرت الٰہیہ کے قوانین میں غور کرتے اور دیانت وتقوٰے سے کام لیتے تو اسلامی شریعت کی حکمت سے واقف ہو کر جہنم کی جلتی آگ کا ایندھن نہ بنتے۔ میں چند اقوال ان منصف مزاج پادریوں کے بھی یہاں نقل کرتا جنہوں نے ایک سے زیادہ نکاح کی ضرورت کو محسوس کرکے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ منجملہ جنکے لوتھر جرمن ریفارمر بھی ہے۔ مگر بخوف طوالت ان کو چھوڑنا پڑا ہے ؏

(۴) اب میں تحقیقی طور پر اسلامی شریعت کی اس حکمت کو بیان کرتا ہوں۔ جو تعدد ازدواج میں مضمر رکھی گئی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانی فطرت چند فطری قوتوں پر مشتمل ہے۔ کوئی عام آدمی ہو یا کوئی خاص فطری قوت کے مقتضے میں سب برابر ہیں انسان جس طرح اپنی ذات کی بقا کے لئے طلب غذا کا محتاج ہے اسی طرح بقاء نسل کا بھی محتاج ہے۔ کسی شریعت کا ضروری اور مہتم بالشان اصول یہ ہونا چاہئے۔ کہ وہ ان انسانی قوا فطریہ کو اعتدال کی صراط مستقیم پر چلانا تعلیم کرے۔ اگر کسی شریعت میں یہ امر ملحوظ نہیں تو وہ شریعت کبھی نوع انسانی کے لئے قطعی حجت نہیں قرار پا سکتی۔ اسلام پاک نے ہر ایک فطری قوت کے استعمال کے لئے کیفیت وکمیت کی ایسی صراط مستقیم بتلا دی ہے جو نہ تو بہائم کی طرح نفس پروری سکھلاتی ہے اور نہ بالکل رہبانیت

اور قطع تعلق کی تعلیم دیتی ہے۔ اور یہی ایک امر کسی مذہب کی صداقت کی اعلیٰ دلیل ہو سکتا ہے۔ مسئلہ ازدواج کے متعلق بھی شریعت حقہ نے اسی حکمت کو مدنظر رکھا ہے۔ لیکن میں قبل اس کے کہ وجہ جواز تعدد ازدواج کو ظاہر کروں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کسی نبی کی تعلیم ایسی ہونی چاہئے کہ ان تمام مروّجہ مفاسد کا استیصال کرے جو برخلاف فطرتِ انسانی لوگوں میں جاری ہوں۔ اور ایک ایسا جامع دستور العمل وضع کرے جس پر بمقتضائے فطرت صحیحہ تمام لوگ کاربند ہو سکیں۔ چونکہ اسلام دنیا کا آخری اور قطعی آسمانی مذہب ہے اس لئے ضروری تھا کہ وہ اس مسئلہ کے متعلق نہ صرف جہال عرب کی اصلاح کا ذمہ لیتا بلکہ تمام دنیا کی آنے والی نسلوں کے لئے بھی ایک قاعدۂ کلیہ وضع کرتا جس میں پھر کسی ترمیم کی ضرورت نہ ہوتی۔ چنانچہ اسی کتاب میں ضرورت نبوت کے مضمون میں اس امر کا بیان کر دیا گیا ہے اس مضمون کو زیادہ واضح کرنے کے لئے میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ پہلے اہل عرب کے ان متعدد طریق نکاح کا ذکر کر دوں جو زمانۂ جاہلیت میں مروّج تھے اور جن کا اسلام پاک نے استیصال کر دیا۔ اہل عرب میں نکاح کے حسب ذیل طریق تھے:۔

(۱) نکاح عام سب سے مہذب طریق کا نکاح جو قریش اور دیگر شرفائے عرب میں مروّج تھا۔ اس کی صورت آجکل کے نکاح سے جو مسلمانوں میں رائج ہے ملتی جلتی تھی اور یہ نکاح اور نکاحوں سے بہتر خیال کیا جاتا۔ اس کا طریق یہ تھا کہ ایک مرد دوسرے مرد سے اس کی بیٹی یا اس عورت کی جو اسکی ولایت میں ہوتی منگنی کی درخواست کرتا اور اس کا حق مہر مقرر کرتا۔ جب وہ شخص منگنی منظور کر لیتا تو مہر کی معین مقدار پر جس کا اس مجلس میں ذکر ہو جاتا اس کے ساتھ عقد ہو جاتا۔ منگنی کی درخواست عورت کے باپ یا بھائی یا چچا یا چچازاد بھائیوں سے کرتے تھے۔ لوگ جب منگنی کی درخواست کرتے تو عورت کے باپ

یا دلی سے کہتے کہ خدا کرے تم پر صبح خوش رہے کہ ہم تمہاری ذات برادری کے ہیں۔ اگر تم ہم سے اپنی بیٹی بیاہ دو تو ہماری خوشی پوری ہو جائیگی اور ہم تمہارے ہو جائینگے اور ہم تمہاری تعریف کرتے ہوئے تمہاری فرزندی میں داخل ہونگے اور اگر کسی علت کی وجہ سے جس کو ہم بھی جانتے ہوں تم ہمیں محروم لوٹاؤ گے تو ہم تم کو معذور سمجھ کر لوٹ جائینگے۔ اگر عورت کی قوم سے خاطب کی قرابت قریبہ ہوتی اور اس کی منگنی منظور ہو کر اس کے ساتھ عقد ہو جاتا تو رخصت کے وقت لڑکی کا باپ یا بھائی لڑکی سے کہتا کہ خدا کرے جب تو اس کے پاس جائے تو عیش و آرام سے رہے اور لڑکے جنے۔ نہ لڑکیاں۔ خدا تجھ سے کثیر التعداد اور عزت والے اشخاص پیدا کرے اور تیری نسل ہمیشہ رہے۔ اپنا خلق عمدہ رکھنا اور اپنے شوہر کی عزت و تعظیم کرنا اور پانی کو خوشبو سمجھنا ؞

اگر عورت کسی اجنبی اور پردیسی سے بیاہی جاتی تو اس کا باپ یا بھائی اس سے کہتا کہ خدا کرے نہ تو عیش و آرام میں رہے اور نہ لڑکے جنے۔ کیونکہ تو اجنبیوں سے قریب ہوگی اور دشمنوں کو جنے گی۔ اپنا خلق عمدہ رکھنا اور اپنے شوہر کے عزیز و اقارب کی نظر میں پیاری بنی رہنا کیونکہ انکی آنکھیں تیری طرف اٹھی ہوئی ہونگی اور ان کے کان تیری طرف لگے ہوئے ہونگے اور پانی کو خوشبو سمجھنا ؞

قریش اور عرب کے اکثر قبائل میں یہی نکاح رائج تھا اور اکثر شریف اور خاندانی لوگ اسی نکاح کو پسند کرتے تھے ؞

(ب) نکاح استبضاع اس کا طریق یہ تھا کہ جب عورت حیض سے پاک ہو جاتی تو اس کا شوہر اسکو خود اجازت دیتا کہ فلاں رئیس یا شریف قوم سے ہم بستر ہو لے۔ وہ عورت اس سے ہم بستر ہوتی۔ اور جب تک وہ

اس شخص سے حاملہ نہ ہو جاتی اُس کا شوہر اُس سے ہمبستری نہ کرتا مگر جب اُس سے اُس کا حمل قرار پا جاتا تو اُس کا اصل شوہر اس سے جس وقت چاہتا ہم بستر ہوتا۔ استبضاع ان سرداروں اور روٴسا کے ساتھ کراتے تھے جو شجاعت یا شرافت وسخاوت وغیرہ اوصاف میں مشہور ہوں۔ اور اس سے غرض یہ تھی کہ بچہ شریف النسب پیدا ہو۔ یہ قریبًا وہی رسم ہے جس کو ہندو نیوگ کہتے ہیں ؂

(ج) چند آدمی جمع ہو کر دس سے کم ہوتے کسی عورت کے پاس جاتے اور باری باری اُس سے ہم بستر ہوتے۔ یہ عمل طرفین کی رضامندی سے ہوتا۔ جب عورت حاملہ ہو کر بچہ جنتی تو وہ ان سب کو اپنے پاس بلواتی۔ وہ سب کے سب اس کے پاس جمع ہو جاتے اور کسی کو انکار کی مجال نہ ہوتی۔ جب سب جمع ہو جاتے تو وہ ان سے کہتی کہ تم نے جو میرے ساتھ کیا ہے تمہیں معلوم ہے۔ اب بیٹے یہ بچہ جنا ہے اور وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف منسوب کر کے کہتی کہ اے فلاں یہ تیرا بیٹا ہے۔ سو تو اس کا نام تجویز کر۔ وہ شخص اس کے قبول کرنے سے انکار نہ کر سکتا تھا یہ رسم نرینہ اولاد کے لئے ہوتی۔ اور اگر لڑکی پیدا ہوتی تو اُس کے لئے اس کی ضرورت نہ ہوتی تھی کیونکہ لڑکیوں کو عمومًا زندہ ہی دفن کر دیا کرتے تھے ؂

(د) بہت سے آدمی جمع ہو کر عورت کے پاس جاتے وہ کسی کو اپنے پاس آنے سے منع نہ کرتی اور غیر معین اور بے تعداد آدمیوں سے ہم بستر ہوتی یہ فاحشہ عورتیں تھیں جو اپنے دروازوں پر جھنڈیاں قائم کر دیتی تھیں تاکہ اس قسم کی تجارت کا لوگوں کو علم ہو جائے۔ ان نشانوں کو رایت کہتے تھے۔ اور ایسی عورتیں بغایا کہلاتی تھیں۔ بچہ پیدا ہونے پر وہ سب اس کے پاس جمع ہو جاتے اور قیافہ شناس کو بلاتے۔ قیافہ شناس بچہ کو جس کے زیادہ مشابہ پاتا اُسی کا بیٹا قرار دیتا۔ مرد اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ہشام بن الکلبی نے اپنی کتاب المثالب میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور ایسی عورتوں کی ایک فہرست اسم وار لکھی ہے۔ چنانچہ ام ہزول سب سے زیادہ مشہور

تھی - اسی بدرسم کے استیصال میں آیہ الزانیۃ لا ینکحھا الا زان او مشرک نازل ہوئی ؛

(ہ) نکاح الخدان - ایک قسم کا ناجائز تعلق ہوتا تھا جس کو یارانہ کہتے ہیں جاہلیت کے لوگ کہا کرتے تھے کہ جو نکاح چھپا کر کیا جائے اُس میں مضائقہ نہیں ہے لیکن جو نکاح ظاہر ہو وہ منحوس ہے یہ بھی عام طور پر جاری تھا - آیہ متخذات اخدان میں اسی کی ممانعت وارد ہوئی ؛

(و) نکاح المتعہ - مرد ایک وقت معیّن تک کسی عورت کو اپنے نکاح میں لے لیتا اور وہ مدت گذرنے پر ہر دو علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ؛

(ز) نکاح البدل - ایک مرد دوسرے مرد کو اپنی بیوی سے ہم بستر ہونے کی اجازت دیدیتا اور اسی طرح وہ دوسرا پہلے کو اپنی بیوی سے ؛

(ح) نکاح الشغار - ایک شخص اپنی بیٹی یا بہن یا بھتیجی یا کسی اور عزیزہ کو اس شرط پر کسی کے نکاح میں دیدیتا کہ وہ اپنی بیٹی یا بہن یا بھتیجی یا کسی اور عزیزہ کو اُس کے نکاح میں دیدے - اس میں کسی قسم کا حق مہر نہ ہوتا تھا - بلکہ یہ آپس کا تبادلہ یعنی ایک کا نکاح دوسرے کے نکاح کا مہر ہوتا تھا - حدیث شریف میں اس کی ممانعت موجود ہے ؛

(ط) ایک شخص بلا تعداد بیویاں نکاح میں لے آتا اور ان کے حقوق نان ونفقہ وشب باشی سے عہدہ برآ نہ ہو سکتا ؛

اہل جاہلیت ماں - بیٹی - خالہ - پھوپھی - بہن - بھانجی - بھتیجی اور ان تمام عورتوں سے نکاح نہیں کرتے تھے - جن سے شریعت اسلام میں نکاح کرنا حرام ہے - ان رشتہ داروں کو خواہ وہ نسبی ہوں یا رضاعی نکاح میں لانا حرام جانتے - خصوصاً اہل قریش اس بارہ میں بڑے حیا اور غیرت والے تھے - وہ ان ارحام قریبہ کی حرمت کا پورا

بڑا پاس رکھتے تھے۔ مسلمانوں کے ہاں جو عورتیں محرمات ہیں جاہلیت میں ان سے صرف دو صورتیں مستثنیٰ تھیں۔ اوّل یہ کہ وہ لوگ اپنے باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ اس میت کا ترکہ متصوّر کرتے تھے۔ باپ کی بیوی کا سب سے زیادہ مستحق اُس کا بڑا بیٹا خیال کیا جاتا تھا۔ اگر وہ اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا تو بے تامل کر لیتا۔ کوئی عیب نہ تھا۔ جو لوگ اس قسم کا نکاح کرتے تھے اُن کو ضیزن کہا جاتا تھا۔ بنی قیس بن ثعلبہ میں سے تین بھائیوں نے یکے بعد دیگرے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کیا تھا۔ اوس بن حجر تمیمی ان کو انکے اس فعل پر یوں عار دلاتا ہے ؎

نیکوا فکیھۃ وامشوا حول قبتھا
فکلکم لابیہ ضیزن سلف

(ترجمہ) فکیہہ سے ہم بستر ہو اور اس کے قبّہ کے گرد چکر لگاؤ۔ تم سب اپنے باپ کے ضیزن سلف ہو ÷

اگر میت کا بڑا بیٹا اس کی بیوی سے نکاح نہ کرنا چاہتا تو اُس کے چھوٹے بھائی کر لیتے اور اگر وہ بھی نہ چاہتے تو میت کا اور کوئی قریبی رشتہ دار کر لیتا۔ اس میں عورت کی رضامندی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ میت کا ترکہ خیال کی جاتی تھی۔ اور جو کوئی اُس پر اپنا کپڑا ڈال لیتا وہی اس کے نکاح کا مالک ہو جاتا۔ جاہلیت میں اس نکاح کو نکاح مقت کہتے تھے اور جو اولاد اس نکاح سے پیدا ہوتی تھی اس کو مقتی۔ قرآن مجید میں خدائے کریم نے اس نکاح کو حرام فرمایا اور مذمت میں یہ آیت نازل فرمائی ولا تنکحوا ما نکح اٰباءکم من النساء الا ما قد سلف انہ کان فاحشۃ ومقتا وساء سبیلا۔ یعنی جن عورتوں سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا ہے تم ان عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ پہلے جو ہو چکا سو ہو چکا۔ یہ نکاح بے حیائی اور خدا کے غصّہ کا باعث ہے

دوسری صورت جو شریعت اسلام کے خلاف تھی یہ تھی کہ ایک شخص اپنے نکاح میں دو سگی بہنیں ایک وقت میں جمع کرلیتا تھا۔ اس میں بھی ان کے نزدیک کوئی عیب نہ تھا۔ خدائے تعالےٰ نے اس کو بھی ان تجمعوا بین الاختین نازل فرماکر حرام فرمایا یعنی تم کو دو بہنوں کا ایک وقت میں نکاح میں جمع کرنا حرام ہے ؛

جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد معین نہ تھی۔ مرد جس قدر بیویاں چاہتے کرلیتے چنانچہ جب قیس بن حارث مسلمان ہوئے تو اس وقت ان کے نکاح میں آٹھ عورتیں تھیں اور غیلان بن سلمہ ثقفی کے اسلام قبول کرنے کے وقت انکے نکاح میں دس عورتیں تھیں۔ اسلام نے زیادہ سے زیادہ چار نکاحوں کی اجازت دی اور اس سے زیادہ کی ممانعت کردی ؛

مذکورہ بالا اقسام نکاح اہل عرب میں حضور علیہ السلام کی بعثت کے وقت عام طور پر رائج تھے۔ ایک عقلمند آدمی بشرطیکہ تعصب کو بالکل بالائے طاق رکھدے نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی غیرت ہرگز اس امر کی مقتضی نہ تھی کہ ایسے بُرے وقت میں ان لوگوں کی اصلاح کے لئے کسی نبی کو مبعوث نہ کیا جاتا کیونکہ فطرۃ اللہ ہمیشہ اپنے طبعی اسباب کے رُو سے غالب آکر باطل کو بے نام ونشان کردیا کرتی ہے ؛

آیت مذکورہ بالا جس پر معترض کا اعتراض مبنی ہے نہایت وضاحت کے ساتھ تعدد ازدواج کو روک رہی ہے۔ کیونکہ اس آیت کے آگے الفاظ وان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ موجود ہیں یعنی اگر تمہیں ایک سے زیادہ نکاح کرنے میں یہ ڈر ہو کہ تم انمیں ہر ایک طرح مساوات حقوق کو ملحوظ نہ رکھ سکو گے تو ایک ہی پر قانع رہو۔ یہ الفاظ درحقیقت ایک کافی روک ہیں تعداد ازدواج کے لئے بشرطیکہ کوئی شخص حقیقت عدل کو باریک نگاہ سے دیکھے۔ اور خود دوسرے مقام پر خداوند کریم

نے نہایت وضاحت سے اس وقت عدل کی حقیقت کو بیان کردیا حیث قال ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم فلا تمیلوا کل المیل یعنی تم عورتوں میں ہرگز عدل قائم نہیں رکھ سکو گے اگرچہ تم اس بات پر حرص بھی کرو۔ سو تم ایک ہی پر پورا پورا مت جھک پڑو۔ غور کرو کہ کس زور کے ساتھ انسانی کمزوری کا بیان کیا ہے اور خود جناب سرورِ کائنات ایک حدیث میں اس اشکال کی طرف یوں اشارہ فرماتے ہیں اللھم ھذا قسمی فیما املک فلا تلمنی فیما تملک ولا املک یعنی خدایا! یہ تو (ازدواج میں) میری تقسیم ہے جس کا میں مالک ہوں سو تو کسی ایسی فروگذاشت پر جو تیرے قبضۂ قدرت میں ہے اور میرے اختیار[1] سے باہر ہے مجھے ملامت نہ کر۔ لوگوں نے حقیقت عدل کو ایک سرسری بات سمجھ کر اس آیت کے مفہوم پر بہت بری طرح عملدرآمد کرنا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین نے بجائے اس کے کہ آیہ مذکورہ بالا کو تعدد ازدواج کی ممانعت کا حکم خیال کرتے وجوب تعدد نکاح پر محمول کیا (عمداً یا غلطی سے) بہرصورت یہاں دو امر قابل لحاظ ہیں۔ اوّل یہ کہ انسانی تمدنی تعلقات کے رُو سے آیا مرد کو بمقتضائے فطرت کبھی ایک سے زیادہ نکاح کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے۔ دوم یہ کہ اگر ایک سے زیادہ نکاح کرے تو آیا وہ شخص عین اس حکم کے مطابق جو منشاء قرآن ہے اپنی بیویوں میں من کل الوجوہ مساوات قائم رکھ سکتا ہے؟ امر اوّل کے متعلق صرف یہی کافی ہے کہ ضروریات بشریت کی کمیت و کیفیت چونکہ ہر ایک فرد بشر کے لئے مختلف ہے۔ کیونکہ ہر ایک کے قوار فطریہ اور تمدنی حالات ایک ہی درجہ پر کبھی نہیں ہو سکتے۔ اسلئے ممکن ہے کہ ایک عورت کسی شخص کی تمام ضروریات بشریہ کو پورا نہ کر سکے۔ عورت کا بانجھ ہونا۔ دائم المرض ہونا۔ حاملہ

[1] واضح ہو کہ حضورؐ کی یہ دعا محض بغرض اظہار عبودیت تھی جو شیوۂ انبیاء علیہم السلام ہے ورنہ جناب سے بڑھکر عدل کون کر سکتا ہے گویا ایک طرح سے یہ حدیث آیہ لن تستطیعوا کی تفسیر ہے۔ ایک مرتبہ تقسیم غنیمت کے وقت حضورؐ نے ایک معترض کو فرمایا اذا انا لم اعدل فمن یعدل۔ یعنی اگر میں عادل نہیں تو پھر کون عادل ہے ۱۲ منہ

ہو کر مرد کو قریبًا سال بھر تک لئے باز رکھنا با آنکہ وہ فطرتًا ایسا قوی الخلقت ہے کہ باز نہیں رہ سکتا اور نیز دیگر تمدنی ضروریات وغیرہ ایسے امور ہیں کہ کوئی شخص اگر ان نظرانداز کردے تو کسی دوسری صورت میں نکے مفاسد بہت بری طرح سے اپنا اثر ... اس لئے کوئی سمجھدار اس بات کو جائز نہیں رکھ سکتا کہ ایک شخص باجازت شریعت ... کیوں اپنے قوارِ فطریہ کو مہمل چھوڑے یا کسی مفادِ تمدنی سے محروم رکھا جائے - یہ کیسی سراسر حماقت ہے کہ ایسے امر کو جو محض بمقتضائے فطرت اختیار کیا جاتا ہے تعصب یا جہالت سے قابلِ اعتراض ظاہر کیا جاتا ہے - سچ کہا ہے سرزمین مصر کے ایک مسلمان فاضل نے کہ اگر شریعت محمدیہ کا نزول کہیں ممالک یورپ میں ہوا ہوتا تو اہل یورپ اس کی صداقت کا چار دانگ عالم میں ڈنکا بجا دیتے - مگر تعصب بہت بڑا مرض ہے ؎

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد
صد ہزاراں پردہ سوئے دیدہ شد

امر دوم کے متعلق جب کیفیت عدل کو مدنظر رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو شہوت رانی اور نفس پرستی سے قطعًا روک دیا گیا ہے کیونکہ جو امر بغرض شہوت پرستی کیا جائیگا وہ سراسر عدل کے منافی ہوگا - اس کی تشریح یوں ہو سکتی ہے کہ اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح کرے اور ان میں مساوات قائم نہ رکھ سکے تو چونکہ عدل من کل الوجوہ قائم رکھنا قریبًا ناممکن ہے اسلئے بالضرور افراط و تفریط میں مبتلا ہو کر شرعی مجرم قرار پائیگا کیونکہ اس معاملہ میں بالخصوص تفریط کی نسبت افراط کی طرف لوگ زیادہ مائل ہوتے ہیں اس لئے وہ افراط ضرور موجب فتنہ و فساد ثابت ہوگی اور اگر سب سے بے قاعدگی برتے گا تو اس کی زندگی وبال ہو جائیگی یا کثرت جماع اس کے حق میں مضر ثابت ہو کر اس کو وعید [1] ولا تلقوا بایدیکم الی التهلکة میں لا ڈالے گی

[1] خود اپنے تئیں ہلاکت میں نہ ڈالو ۱۲ منہ

یہ ایسے اُمور ہیں جو روزمرہ ہمارے سامنے پیش آرہے ہیں۔ خصوصاً طبقہ امراء میں تو کثرت عیاشی سے بہت بُری بُری تغیریں دیکھی جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں کیونکر گمان ہو سکتا ہے کہ شریعت اسلامی نے عام طور پر بلا ضرورت اور بلا مراعات حقوق ازواج یہ اجازت دے دی ہے کہ جس کا جتنی عورتوں سے جی کرے نکاح کرے۔ غالباً معترض نے الفاظ دُو دُو، تین تین، چار چار کو پکڑ لیا ہے اور اس کے مخالف و موافق پہلو پر کچھ غور نہیں کیا۔ حالانکہ اِن اعداد کے بیان سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ تقاضائے فطرت کے رُو سے جبکہ مختلف اشخاص کے حالات طبعی و تمدنی مختلف ہوتے ہیں تو وہ کونسا ایسا جامع اصل ہے جو ان مختلف حالات و اوضاع کے اشخاص کی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان تمام وجوہ اختلاف کو مدنظر رکھنے سے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ سب کی ضرورتوں کو کسی خاص صورت میں محدود کر دیا جائے۔ اسلئے بعض محققین نے دیگر وجوہ اختلاف کو جو تمدنی ضرورتوں پر مبنی ہیں علیحدہ رکھ کر صرف انسانی قوائے فطریہ کے رُو سے چار نکاح کی ضرورت کو یوں ثابت کیا ہے کہ فرض کرو کہ زید بالکل ایک تندرست اور صحیح القویٰ شخص ہے جو عین اٹھتی جوانی میں نکاح کرتا ہے۔ اب اگر پہلی ملاقات میں اسکی بیوی حاملہ ہو جائے تو بموجب اصول طب جس کو آجکل کے ڈاکٹروں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ زید عورت کے حاملہ ہو جانے پر صرف اڑھائی ماہ اس کے ساتھ مباشرت کر سکتا ہے مگر عورت کو وضع حمل کے لئے نو ماہ اور کچھ دن پورے کرنے ہونگے بعد ازاں چالیس دن تک اور انتظار کرنا پڑیگا اس طرح سے اس کو قریباً دس ماہ اس عورت کی ہمبستری سے علیحدہ رہنا پڑیگا۔ مگر اس عرصہ میں چونکہ وہ صحیح القویٰ نوجوان ہے۔ اس خیال سے کہ کہیں ناجائز طور پر قضائے شہوت نہ کرے دوسری منکوحہ کی ضرورت ہوگی۔ اب اگر اس کے ساتھ بھی یہی حالت پیش آئے تو پھر اس دوسری عورت کے

لہ میرے نزدیک یہی خطرہ ہے کہ کوئی گنجایش نہ ہو جو ہر وقت ڈاکٹروں اور طبیبوں کے دروازوں پر کھڑے نظر آتے ہیں مثلاً

وضع حمل اور ایام نفاس تک اس کو محترز رہنا ہوگا اسلیئے تیسری عورت کی ضرورت ہوگی۔ فرض کرو کہ تیسری کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا تو چوتھی کی ضرورت ہوگی۔ اس چوتھی عورت کے حاملہ ہونے پر اڑھائی ماہ کا عرصہ اس کے ساتھ ہم بستر ہوتا رہیگا اور اس عرصہ کے بعد وہ پہلی عورت ایام وضع حمل اور نفاس کو پورا کر چکی ہوگی۔ اس لئے وہ اسے کام دینے کے قابل ہو جائیگی۔ اس طرح سے اس کے دس ماہ کٹ جائینگے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کرتا تو وہ نوجوانی کی ترنگ میں کسی ناجائز طریق کا مرتکب ہو جاتا اسلیئے خاص حالات میں چار بیویوں کا نکاح میں لانا ہرگز خلاف فطرت انسانی نہیں ہو سکتا۔ بالخصوص ایسے حالات میں جبکہ از روئے تجربہ و مشاہدہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ عورت چالیس پینتالیس سال تک پانچ چھ بچے جن کر عجوز نود سالہ ہو جاتی ہے اور مرد بشرطیکہ بالکل صحیح و تندرست ہو ستر سال تک بھی بچہ پیدا کرنے کے قابل ہوتا ہے بلکہ بعض حالات میں اس سے بھی زیادہ مدت تک ؂

جو لوگ انسانی قوائے فطریہ کی حقیقت سے آگاہ ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ قوائے عاملہ ہمیشہ اپنے فطری عمل کا تقاضا کرتی رہتی ہیں۔ مرد چونکہ عورت کی نسبت زیادہ قوی الفطرۃ ہوتا ہے اس لیئے یہ خیال بالکل ساقط الاعتبار ہے کہ اگر مرد کو از روئے فطرت ایک سے زیادہ عورت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ عورت کو ایک سے زیادہ مرد کی ضرورت نہ ہو۔ کیونکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ عورتوں کے چند امور فطریہ ایسے بھی ہیں جو اُن کو مرد کی طرح خواہش مباشرت سے مانع ہیں اور مردان سے بالکل بری ہیں مثلاً ایام حیض۔ ایام حمل۔ ایام نفاس۔ ایام رضاعت ایسے ایام ہیں جن میں عورت سے مباشرت کرنا اصول طب کے رُو سے منع ہے اور یہی حکمت ہے کہ شریعت حقہ نے بھی ایسے حالات میں ممانعت کر دی۔ اب اگر عورت کی اس مدت عمر سے جو بالغ ہونے سے اس وقت تک شمار ہو سکتی ہے جبکہ وہ بچہ جننے کی قابلیت رکھتی ہے ان ایام کو منہا کر دیا جائے

تو یقیناً ایک محدود مدت ایسی باقی رہ سکتی ہے جس میں عورت مباشرت کے قابل ہو۔
ان یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عورت کو ان ایام میں ایک گونہ مباشرت سے
نفرت بھی ہو جاتی ہے۔ گو کوئی جاہل ان موانع کو ملحوظ نہ رکھے مگر تقاضائے فطرت یہی
ہے کہ رُکا رہے۔ اب اگر مرد کو عورت کے ساتھ ایک ہی راستہ پر چلایا جاوے تو کیسی
مشکلیں پیش آئینگی۔ کیونکہ فطرت ایک کو تو معذور قرار دے رہی ہے اور دوسرے
کو کامل القدرۃ۔ پھر ہر دو میں مساوات کیونکر متصوّر ہو سکتی ہے؟ جن لوگوں نے عورت
کو بھی اس امر میں مرد کے برابر رکھنا چاہا ہے۔ انہوں نے عورتوں کے ان ضروری موانع
کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے بلکہ عورت کو اپنی حالت پر قیاس کر کے ایک بے معنی اور مہمل سی
رائے قائم کر لی ہے۔ مگر نظر دقیق تو اس کو باطل کر رہی ہے۔ غالباً یہ اعتراض آریہ
ہندوؤں کا ہے۔ جن کو قواعد نظر و استدلال سے بالکل محروم رکھا ہے۔ بظاہر انہوں نے
اسلام پاک پر یہ اعتراض کیا ہے مگر در اصل نیوگ کی وجہ جواز قائم کرنا متصوّر ہے ٭

اسلام تعدد ازدواج کے لئے بربنائے ضرورت فطری انسان کو جواز کا راستہ بتلاتا
ہے نہ یہ کہ ہر ایک شخص کو خواہ مخواہ لاتعداد بیویوں سے نکاح کر لینا واجب ہے۔ حاشا و کلا
یہ خیال اسلام پاک پر محض بہتان و افترا ہے اور اگر کوئی عقلمند بلا تعصب اس مسئلہ کی
اصلیت پر غور کرے تو اسے معلوم ہو جائیگا کہ کس خوبی کے ساتھ اسلام پاک نے انسانی
فطرت کے تقاضا کو جو بلحاظ اصول تمدن و معاشرت لابد خیال کیا گیا ہے ملحوظ رکھ کر
ناجائز طور پر قضائے شہوت سے روکا ہے! میرے خیال میں جن مذاہب میں ایسی فطری
ضرورتوں کے لئے کوئی چارہ جوئی نہیں رکھی گئی ان میں زنا اور دیگر ضروری مفاسد کی
نسبتاً کثرت ہے۔ ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ فطرتاً ایک مرد کو صرف ایک عورت کافی
ہے۔ مگر جب فطرت ہی انسان کو خاص خاص ناگزیر موانع اور حالات کے پیش آنے کی
صورت میں دوسری عورت کی ضرورت پر مجبور کرے۔ تو اس صورت میں دوسری عورت

سے نکاح کرنا بھی فطرت ہی کا تقاضا ہوگا نہ کسی امر خلاف فطرت کا۔ عربی میں ایک مشہور ضرب
المثل ہے اذا بلیتم ببلیتین فاختاروا اھونھما۔ یعنی جب تم دو مصیبتوں میں پڑجاؤ
تو جو اُن میں سے آسان ہو اُسے اختیار کرو۔ اب اگر کوئی شخص ایسی حالت میں گرفتار ہو کہ
ادھر اُسکو ایک بانجھ عورت سے پالا پڑا ہے اور دوسری طرف بہ تقاضائے فطرت وہ اپنی
بقائے نسل کو ضروری سمجھتا ہے تو بتلائیے وہ کیا کرے؟ کیا عیسائی مذہب کی پابندی
کرکے دُنیا سے نامراد رخصت ہو یا یہ کہ دوسری عورت سے نکاح کرکے جائز طور پر اولاد
پیدا کرے؟ بھلا ایسا جماد بےحس و حرکت کون ہوگا جو اس مجبوری کو گوارا کرسکے اور عیسائی
اُمت کا ایک کے سوا دوسری بیوی سے نکاح کرنے سے روکنا محض بے سود اور بے معنی
بات ہے۔ کیونکہ کہیں دوسری عورت سے ممانعت انجیل میں وارد نہیں ہوئی۔ ہاں زیادہ
سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک ہی پر قناعت کرو۔ سو یہ ہم بھی کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے کیونکہ
اسلام بھی یہی کہتا ہے وان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ۔ انجیل کی تعلیم مجمل تھی قرآن مجید
نے اس اجمال کی تفصیل جملہ شرطیہ کی صورت میں کردی۔ بات ایک ہی ہے اور ذرا غور کرنے
سے معلوم ہوجائیگا کہ پہلی شریعتوں کے احکام میں زیادہ شدت ملحوظ تھی۔ موسیٰ علیہ السلام
کی شریعت کو دیکھو کیسے کیسے سخت احکام کی پابندی انپر لازم قرار دیگئی۔ اسی طرح
مسیح علیہ السلام کی فطرت پر چونکہ زہد و رہبانیت زیادہ غالب تھی اور اس زمانہ میں ان
مفاسد کی کثرت نہ تھی جو شروع اسلام میں عام طور پر موجود تھے انہیں ایسی ہی تعلیم دیگئی
مگر اسلام نے تمام شریعتوں کا خلاصہ اور عین صراط مستقیم یعنی ایک معتدلانہ احکام کا مجموعہ
ہمارے سامنے پیش کیا۔ مع ہذا توریت کی تعلیم تعدد ازدواج کو جائز رکھتی ہے۔ چنانچہ
پادری لوگوں نے نظر عمیق کے بعد اس کا فتویٰ دیدیا۔ (دیکھو کتاب اصلاح السہو مطبوعہ
امریکن مشن پریس ۱۸۶۱ء) اس کتاب میں صاف لکھا ہے کہ خدا نے منع نہیں کیا بلکہ دوسری
بیوی سے برکت کا وعدہ کیا ہے اور مارٹن لوتھر نے فلپ کو دو بیویوں کی اجازت دیدی تھی

اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلام پاک ہر ایک قسم کی نفس پرستی کا دشمن ہے۔ چنانچہ تمام احکام شرعیہ میں انکے محض خالصًا لوجہ اللہ بجالانے کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس لیئے محض شہوت رانی کی نیت سے اگر کوئی شخص بلاضرورت دوسرا نکاح کرتا ہے تو وہ اسلامی تعلیم کا حکم نہیں سمجھا جائیگا بلکہ اس شخص کی اپنی ہوائے نفس کا نتیجہ ہوگا۔ اگر اُمرا یا دیگر عیش پرست مسلمان ایسا کرتے ہیں تو یہ امر انکی شرعی خلاف ورزی پر محمول ہونا چاہیئے۔ اس سے اسلام پاک کیونکر مطعون ہو سکتا ہے؟ اسلام کے احکام عین حکمت و مصلحت پر مبنی ہیں اور اگر ان کی پابندی کما حقہ کیجائے تو کسی پہلو میں بھی قابل اعتراض ثابت نہیں ہونگے۔ غالبًا مخالفین نے ایسے ہی چند مسلمانوں کے حالات دیکھکر اسلام پاک کو عرضۂ طعن بنالیا ورنہ جس طریق اندواج کو اسلام نے پیش کیا ہے وہ تعدد ازدواج کا سخت مانع ہے بلکہ وہ افراط و تفریط کے درمیان اعتدال قائم رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ اور ؎

زن نو کن اے مرد در ہر بہار ❊ کہ تقویم پارینہ ناید بکار

اور

مرا یک دم شہوت کہ خاک بر سر او ❊ اسیر زن نتواں شد بسالہائے دراز

ہر دو کو باطل کرتا ہے۔ کیونکہ پہلا خیال کسی عیش پرست دنیا دار کا ہے اور دوسرا کسی خشک زاہد کا جو حقیقت فطرت سے بے خبر ہے❊

مسئلہ تعدد ازدواج کے متعلق اس امر کا بیان کر دینا بالخصوص ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بیویوں میں عدل کر سکنے کا معیار مرد کی لئے پر موقوف ہے جو احکام شرعیہ متعلقہ نان و نفقہ و شب باشی وغیرہ کے رُو سے قرار پائے۔ کیونکہ محض اپنی رائے سے کبھی عدل کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ اسلیئے ضروری ہے کہ اپنی رائے کو اس بارہ میں احکام شریعت کے مطابق قائم کیا جائے۔ بعض کوتاہ اندیشوں نے یہ بھی اعتراض کیا

ہے نہ عورت کو اس بارہ میں کچھ اختیار نہیں دیا گیا بلکہ عدل کا معاملہ مرد ہی کی جانے پر موقوف ہے کہ جس حالت کو وہ مناسب سمجھے اُسی کو عدل کہا جائیگا۔ مگر یہ اعتراض حکم شریعت کی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کیونکہ حقیقت عدل کا قائم کرنا شریعت کا کام ہے نہ کسی دوسرے شخص کا۔ اور شریعت نے جو کچھ حکم دیدیا ہے وہ عین عدل ہے کیونکہ جو حقیقت شریعت نے عدل کی بتائی ہے اُس میں کسی طرح بھی کسی ایک عورت کی حق تلفی لازم نہیں آتی۔ اور تعجب یہ ہے کہ معترض کیونکر حقیقت عدل کے قائم رکھنے کے لئے عورت کی رائے کو بھی دخیل قرار دیتا ہے۔ کیونکہ عدل کی بجا آوری تو مرد پر فرض ہے۔ عورت کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ پھر یہ قرار دینا کہ فلاں امر عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ اس میں مرد ہی کی رائے جو تابع احکام شریعت ہے معتبر ہونی چاہئے نہ عورت کی۔ عورت اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے کبھی جائز نہ رکھیگی کہ شوہر دوسرا نکاح کرے مگر مگر بضرورت بشریت اس کی اس رائے کو رد کرتی ہے یا ایک عورت دوسری عورت کے ساتھ کیونکہ مرد کو طریق عدل قائم رکھنے دیگی۔ اگر مرد ایک عورت سے رائے لیگا تو وہ یقیناً دوسری کے برخلاف ہوگی۔ اور اس لئے ممکن بلکہ اغلب ہے کہ خلاف شریعت ہو اسلئے گو بظاہر عدل قائم کرنے میں مرد اور عورت ہر دو معزول الاختیار رہیں۔ ہر دو کو شریعت کا تابع ہونا ضروری ہے۔ مرد صرف ان احکام کی بجا آوری کا متکفل ہے نہ ان احکام کے وضع کرنے کا۔ پس معترض کا اعتراض بالکل بےمعنی ہے ؛

(۵) مرد اور عورت میں ازدواج کے رُو سے گویا ایک قسم کا معاہدہ قائم ہو جاتا ہے جسکی طرفین کو پابندی لازم ہو جاتی ہے۔ اس معاہدہ کے رُو سے ہر دو اپنے اپنے مفوضہ فرائض کی نگہداشت کرتے ہیں شریعت نے ہر دو کے فرائض کی علیحدہ علیحدہ حدبندی کر دی ہے۔ یہ معاہدہ سوائے خاص خاص حالات کے قابل انفساخ نہیں تاہم بعض جہال کا یہ خیال کہ انفساخ کا حق صرف مرد ہی کو دیا گیا ہے۔ شریعت اسلامی سے

یا واقعی کا نتیجہ ہے۔ اوّل تو انفساخ کے حالات ہی شاذ و نادر واقع ہوتے ہیں مگر ان میں بھی جس طرح مرد کو کسی وجہ وجیہ کے پیدا ہونے پر طلاق کا اختیار دیا گیا ہے اسی طرح خاص خاص حالات میں عورت کو بھی قاضی کے حضور میں حاضر ہو کر قطع تعلق زوجیت کا اختیار دیا گیا ہے۔ البتہ مرد کے اختیار کو نسبتاً زیادہ مستحکم رکھا گیا ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ مرد اور عورت کی فطرت چونکہ یکساں نہیں اسلئے حقوق تمدن و معاشرت میں بھی ہر دو کا درجہ علیحدہ علیحدہ تجویز کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس امر کو میں نے اسی کتاب میں زیر عنوان حقوق الرّجال والنّسآء دلائل عقلیہ اور حجج شرعیہ سے ثابت کر دیا ہے اور جو لوگ اس تفاوت حقوق کی ضرورت کو تسلیم نہیں کرتے انہیں اپنے دعوے کے دلائل اصول فلسفہ اور شریعت اسلامی ہر دو سے پیش کرنے چاہئیں۔ ہم صرف کسی ایسے دہری یا نیچری کے قول کو حجت نہیں سمجھتے جو محض اپنے ظن فاسد کی پیروی میں عورت اور مرد کے متحد الفطرۃ ہونے کا مدعی ہے۔ عیسائی لوگ کبھی اسلامی مسئلہ طلاق پر اعتراض نہ کرتے اگر وہ اس امر کا علم رکھتے کہ اسلام نے طلاق کی سخت ممانعت کر دی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے تفریق بین المسلمین لازم آتی ہے جو منافی اصول اسلام ہے۔ ایک حدیث میں حضور علیہ السّلام نے طلاق کو ابغض الحلال فرمایا ہے یعنی حلال امور میں سب سے بُرا اور ناپسند امر خدا کے نزدیک طلاق ہے۔ اور خود جہاں نکاح زینب رضہ کا ذکر آیا ہے خداوند کریم حکایتاً فرماتا ہے امسك علیك زوجك واتق اللہ یعنی حضورؐ بار بار زید کو یہ اشارہ فرماتے رہے کہ تو اپنی بیوی سے سمجھوتہ کرلے اور طلاق نہ دے۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ اسلام تمام مختلف افراد کو متحد بنانے کی تعلیم دیتا ہے فاصبحتم بنعمتہ اخوانا اور الفاظ واتق اللہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بلا کسی عذر کامل کے طلاق عمل تقوے کے برخلاف ہے اور طلاق اس اصل عظیم کو توڑتا ہے مگر چونکہ بعض حالات واقعی ایسے ناگزیر پیش آجاتے ہیں جنکی ضرورت کو

انسانی طرز معاشرت اور اصول تمدن کے بطریق احسن قائم رکھنے کے لئے ہر ایک آدمی عقلمند ہو تسلیم کرسکتا ہے۔ اس لئے میاں اور بیوی میں بالمعروف یعنی خوش معاشرت کی صورت میں علیحدگی کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ غور کرو کہ اگر حکم طلاق کسی مجبورانہ حالت میں بھی نہ دیا جاتا تو کسقدر مشکلات جانی اور مالی اور دیگر بدعنوانیوں اور بے اعتدالیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کی اصلیت سے تو کوئی سمجھدار ہرگز انکار نہیں کرسکتا۔ کیونکہ بعض اوقات بمقتضائے اختلاف طبائع یا کسی دیگر ہوائے نفس میں گرفتار ہو کر منازعت اس درجہ تک تجاوز کرجاتی ہے کہ میاں اور بیوی ایک دوسرے کی جان کے بھی دشمن بن جاتے ہیں۔ یہ کیسا سراسر ظلم اور جہالت ہوگی کہ انہیں باہم فتنہ و فساد بھی تعلق زناشوئی پر مجبور کیا جائے۔ آخر تعلق ازدواج انسان کی عمدہ زندگی بسر کرنے کا ذریعہ ہے یا مصیبت میں پڑنے کا ؎

وصلے کہ درو ملال باشد
ہجراں بہ ازاں وصال باشد

(۶) شریعت حقہ نے طلاق کے بارہ میں مرد اور عورت ہر دو کو محدود اختیار کردیا ہے۔ جہاں مرد کو بلا وجہ طلاق سے روکا ہے۔ عورت کی نسبت بھی فرمادیا کہ جو عورت بلا وجہ طلاق حاصل کریگی اس پر جنت کی بو حرام ہے۔ مسائل طلاق میں غور کرکے دیکھو صاف معلوم ہوگا کہ اسلام طلاق کا سوائے مجبورانہ حالت کے سخت دشمن ہے۔ طلاق کا تین طہر[1] میں وارد کرنا مشروع قرار دیا گیا ہے اور ایک ہی دفعہ تین طلاق کے عائد کرنے سے منع کیا۔ اسی طرح حیض کے دنوں میں طلاق کو بدعت کہا۔ ان سب احکام کی علت یہی ہے کہ ایام طہر میں ممکن ہے کہ میاں اور بیوی کی ملاقات سے پھر ہر دو میں محبت پیدا ہو جائے۔ اور تیسری طلاق کے پہلے تک

[1] طہر۔ ہر ماہ میں عورت کے ایام حیض کے علاوہ باقی دن جو عموماً بیس ہوسکتے ہیں طہر کہلاتے ہیں ۱۲ منہ

طلاق بائن کہلاتی ہے۔ رجوع کا اختیار دیا۔ اس کی بھی علّت غائی یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مصالحت ہوجائے اور ناچاقی کے زمانہ میں ہر دو کے رشتہ داروں کو ملکر صلح کرا دینے کا حکم دیا گیا اور ایّام طلاق بلکہ ایّام عدّت میں مرد کے گھر میں عورت کا رہنا بھی اسی حکمت پر مبنی ہے۔ الغرض طلاق صرف اس تفریق کا نام ہے جو کسی سخت سے سخت ناگزیر امر کے پیدا ہونے پر شریعت حقّہ نے جائز رکھی ہے اسلئے ایسے جواز کو مورد اعتراض قرار دینا ایسی حماقت ہے جس کی کوئی نظیر نہیں۔ کہاں ہیں عیسائی جو بجز زنا کے کسی دوسری مجبورانہ حالت میں خواہ وہ کیسی ہی نقصان مالی اور جانی پر مشتمل ہو طلاق کو جائز نہیں رکھتے؟ اور کہاں ہیں یہود جو بلا وجہ ایک ادنیٰ سی ادنیٰ بات پر طلاق کو جائز رکھتے ہیں؟ آئیں اور شریعت اسلامی کو دیکھیں کہ کس طرح یہود کے افراط اور نصاریٰ کی تفریط کے عین بیچوں بیچ واقع ہوئی ہے جس کو صراط مستقیم کہتے ہیں اور یہی اس کی صداقت کی زبردست دلیل ہے۔ سبحان اللہ! کیا پاک شریعت ہے جس نے فطرت انسانی کو نہایت عمدگی کے ساتھ ملحوظ رکھکر احکام کا ایک حقیقی دستور العمل تیار کیا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی جہالت سے اعتراض کئے جائے تو اس کی مرضی ورنہ حق اسلامی حدود سے یقیناً آگے تجاوز نہیں کرسکتا۔

(۷) مسئلہ ازدواج و طلاق کے اخیر: مجھے بمناسبت مقام ضروری نظر آتا ہے کہ مخالفین کے اس اعتراض کا بھی جواب دوں جو وہ جناب سرور کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعدد منکوحات کے بارہ میں کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ باتیں کچھ نئی نہیں مگر ان لوگوں کے لئے جو حقائق مذہب سے بالکل بے بہرہ ہیں ضروری معلوم ہوتی ہیں اس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ایک نبی اللہ کی شان ارفع و اعلےٰ ہوتی ہے۔ اس امر سے کہ اسکی نسبت کوئی شخص نفس پرستی کا گمان کرسکے کیونکہ وہ معصوم ہوتا ہے اور اس کا معصوم ہونا واجب ہے ورنہ تمام احکام شرعیہ کا اعتبار اٹھ جائے

اور کوئی شخص بھی دنیا میں اس قابل نظر نہ آئیگا جس کا قول و فعل حجت قرار پا سکے۔ دیکھو جب نبی اللہ بھی ہوائے نفس کا تابع ہوا تو وہ نبی اللہ کیسا؟ لیکن اگر نبی اللہ کا کوئی فعل ایسا ہو جو بظاہر دوسرے لوگوں کے فعل سے متمیز ہو تو دیکھنا چاہیئے کہ وہ منافی شریعت ہے یا کسی خاص استثنائی صورت میں داخل ہے؟ جو کسی دوسری صورت میں عین شریعت حقہ کی تائید پر مبنی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی حالت کا موازنہ کرنے میں اکثر مخالفین نے بہت کچھ بیجا الزام قائم کیئے ہیں مگر سب کے سب اس غلط فہمی پر مبنی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو اُنھوں نے اپنی ذات پر قیاس کر لیا۔ مگر وہ یہ نہ سمجھے کہ ممکن ہے کہ ایک فعل زید کی نسبت جرم ہو اور وہی فعل عمرو کی نسبت عین مصلحت ہو۔ دنیا میں ہزاروں ایسے متشابہ امور ہیں جن میں بظاہر کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا۔ مگر عند التحقیق ان کی حقیقت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ زید مجلس میں ایک شخص کی تعریف غائبانہ حالت میں اس لیئے کرتا ہے کہ سننے والوں کو بھی ذکر جمیل کی خواہش ہو اور وہ بھی نیک کام کریں اور عمرو بھی اسی شخص کی تعریف کرتا ہے مگر اس کا منشاء یہ ہے کہ جب وہ شخص سُنے گا تو میری طرف سے اُس کے دل میں حسن ظن پیدا ہوگا اور اس طرح سے میں اُس کا مقرب بن سکوں گا۔ ممکن ہے کہ ایک تیسرا شخص بکر بھی اسی کی تعریف کرنے لگے مگر اس کا منشاء یہ ہو کہ خالد جو اس شخص غائب کی نسبت سوءظن رکھتا ہے میری طرف سے اُس کا سوءظن رفع ہو جائے۔ علیٰ ہذا فعل ایک ہی ہے مگر اغراض علیحدہ علیحدہ ہیں اور یہ ایک ایسا امر ہے جس کی مثالیں روزمرہ ہماری آنکھوں کے سامنے گذرتی ہیں۔ مخالفین نے ایک سطحی بات کو لے لیا کہ حضرت کے متعدد ازواج تھے۔ مگر اِن وجوہ کو نظر انداز کر دیا جن پر حضور کا متعدد ازواج کو نکاح میں لانا مبنی تھا۔ کفار بھی اسی طرح کا اعتراض کر کے کہا کرتے کہ یہ کیسا نبی ہے جو ہماری طرح ہی کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ بس ان کا مبلغ علم یہی تھا کہ نبی اللہ کو اپنے سے

زیادہ کچھ وقعت نہیں دیا کرتے تھے مگر حق یہ ہے کہ جو لوگ تقویٰ اور دیانت کو چھوڑ جاتے ہیں اُن کے لئے ہر ایک قسم کی بددیانتی آسان ہو جاتی ہے اور وہ نفوس قدسیہ کو بھی اپنے پلید نفس پر قیاس کرتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ جس طرح ہمارا ہر ایک فعل محض ہماری نفس پرستی پر مبنی ہے اسی طرح انبیاء بھی ہوائے نفس کے تابع ہوتے ہیں مگر حاشا وکلا۔ تشابہ فی الاشکال سے تشابہ فی الحقیقت لازم نہیں آسکتا ؎

کارِ نیکاں را قیاس از خود مگیر ٭ گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

صد ہزاراں ایں چنیں اشباہ بیں ٭ فرقِ شاں ہفتاد سالہ راہ بیں

اس تمہید کے بعد میں اپنے ناظرین پر یہ امر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں جناب رسولِ عربی (فداہ روحی وابی وامی) کی خدا پرستی اور مقام عبودیت میں اعلیٰ سے اعلیٰ کمال روحانی کے لاکھوں شواہد آفتاب سے بھی زیادہ روشن موجود ہیں جو واقفان قرآن و سنت پر مخفی نہیں وہاں کسی ناتراشیدہ عیسائی یا نیچری کی بکواس کو گوزشتر سے زیادہ کیا وقعت ہو سکتی ہے؟ اے نادانو! تم جناب رسول عربی کی نسبت نفس پرستی کا الزام عائد کرتے ہو اور اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہو کہ حضورؐ کی تعلیم کا اصل اصول ہی ہوائے نفس کی مخالفت کرنا تھا۔ قرآن مجید نے تو ہوائے نفس کے پیچھے لگنے والے کو الفاظ افرءیت من اتخذ الٰھہٗ ھواہ یاد کیا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص خود ہوائے نفس کا تابع ہو وہ دوسروں کو ہوائے نفس کی قید سے رہائی دے سکے؟ آخر وہ لوگ جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت و وفاداری میں اپنے اقارب واعزا اور اپنے املاک وجائداد سے دست کش ہو کر وطن مالوف کو خیرباد کہہ گئے تھے اور جو حضور علیہ افضل التحیات کی ادنےٰ ادنےٰ بات کی نہایت غور سے نگرانی کیا کرتے تھے حضور کی حقیقت نفس کا موازنہ کرنے میں تم سے بھی گئے گذرے تھے جو آپ ڈیڑھ ہزار سال بعد محض الزام قائم کر دینے کو حجت سمجھے بیٹھے ہو۔ تم

حضور کی شان کو کیا سمجھ سکتے ہو۔ وہاں تو یہ حال تھا کہ جس کو معصیت اور گناہ سے بچنے کا کوئی حیلہ نہ سوجھا جب جناب کے آستان معلےٰ پر آگرا تو تقویٰ اور ورع کے رنگ میں رنگا گیا۔ ذرا انصاف کرو اور خدا کے لئے دیانت سے کام لو کہ جس شخص کو نفس پرستی مقصود ہوتی ہے بھلا وہ ایسی عورتوں کو نکاح میں لاتا ہے جو اپنی جوانی کو دوسرے شوہروں کے ہاں گزار کر ایسی حالت کو پہنچ چکی ہوں کہ عموماً ان سے نکاح کرنا موجب وبال سمجھا جاتا ہے۔ تمام مورخ اس امر پر متفق ہیں کہ بجز جناب ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کوئی عورت باکرہ حضورؐ کے نکاح میں نہیں آئی اور یہ سب کی سب ایسی تھیں جو اپنے پہلے شوہروں کے پاس اپنی جوانی گزار چکی تھیں اور بیوہ ہو کر حضور علیہ السلام کے نکاح میں آئیں تعجب یہ ہے کہ اہل کتاب حضور علیہ السلام کے منکوحات پر کیونکر معترض ہو سکتے ہیں کیونکہ بعض دیگر انبیاء علیہم السلام کے مقابل جناب پیغمبر عرب نے منکوحات کی تعداد کو نہایت ہی محدود رکھا ہے جنکی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی تھی۔ مثلاً داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام مع تمام بنی اسرائیل میں تعدد ازدواج بروئے تعلیم توریت جائز ہے مگر نصاریٰ خواہ مخواہ مسلمانوں کے سامنے یہ فخر کرتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام نے تمام عمر نکاح نہیں کیا حالانکہ قواعد فطرت کے رو سے یہ امر قابل اعتراض ہے اور ممکن ہے کہ یہود لوگ جو جناب مسیح علیہ السلام کو مطعون کیا کرتے تھے اس واسطے کسی نے انہیں رشتہ ہی نہ دیا ہو۔ بہرحال اگر مسیحی امت حضرت مسیح علیہ السلام کے ترک ازدواج کو قابل فخر ظاہر کرتی ہے تو اپنے پیغمبر بلکہ خدا کی اس سنت پر خود بھی عمل کر کے دکھائیں۔ پھر معلوم ہوگا کہ سچے طور پر متبع ملت ہیں اور جو یہ نہیں تو پھر اسلام پاک کے مسئلہ ازدواج پر جو عین قانون فطرت کے منشاء کو پورا کرتا ہے لغو اعتراض کرنے

سے باز آئیں - اب سنو کہ حضور علیہ السلام کے متعدد ازواج میں کیا کیا مصلحتیں تھیں :-

(ا) حضور علیہ السلام نے اعلائے کلمۃ الحق میں تمام ممکن طریقوں سے کام لیا - منجملہ ان کے متعدد ازواج کو نکاح میں لانے کا طریق بھی آپ نے استعمال کیا - غرض یہ تھی کہ مختلف قبائل عرب سے رشتہ مصاہرت قائم ہو کر ان کے لئے موجب ترغیب ہو - چنانچہ تواریخ سے معلوم ہوگا کہ حضورؐ کی یہ سعی بہت کچھ کارگر ہوئی اور سینکڑوں کو مشرف بہ اسلام ہونے کا موقع ملا ؛

(ب) حضور علیہ السلام کو نہایت ضروری نظر آتا تھا کہ اسلام کی جماعت کو قوت حاصل ہو سو متعدد ازواج کے نکاح میں لانے سے ایک جماعت کثیر سے اسلام کو تقویت ہوتی چلی گئی ؛

(ج) اُمت کے لئے اس عملی نمونہ کو ظاہر کرنا مقصود تھا کہ کس طرح رانڈ اور بیوہ عورتوں کو بلا غرض نفسانی اپنے نکاح میں لا کر ان کے ارمعیشت کو اپنے ذمہ لیا جاتا ہے تاکہ نکاح بیوگاں جن سے عموماً طبائع متنفر رہتی ہیں اُمت کے لئے شرعی حکم قرار پائے - چنانچہ قرآن مجید نے بھی وانکحوا الایامیٰ سے اس مسئلہ کو حل کر دیا ؛ ایک مخالف کیا بکواس کریگا کہ حضور علیہ السلام کو شہوت پرستی مدنظر تھی حالانکہ جناب کا رانڈ عورتوں کو محض بغرض تربیت و حفاظت عصمت نکاح میں لانا مخالفین نے بھی تسلیم کر لیا - دیکھو ابو طالب جو آپ کے چچا تھے اور باآنکہ ایمان نہیں لائے تھے مگر آپ کی عفت پر کس زور سے شہادت دیتے ہیں ! حیث قال ؎

وابیض یُستسقی الغمام بوجهه[1] ثمال الیتامی عصمة للارامل

[1] یعنی وہ شریف جس کے روئے مبارک کی برکت سے آسمان پر سے بارش طلب کیجاتی تھی اور جو یتیم بچوں کا فریادرس اور رانڈ عورتوں کا سہارا ہے ۱۲ منہ

(۵) مختلف قبائلِ عرب کی عزت افزائی مدنظر تھی کیونکہ حضور خاندان قریش سے تھے جو تمام عرب میں سب سے زیادہ شریف سمجھا گیا تھا اور بالخصوص حضور کے رشتہ مصاہرت کے وہ لوگ دل سے خواہاں تھے۔ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ازواج محض بغرض حصول سعادت آپ سے وابستہ ہوئیں ؛

(۶) اسلامی شریعت ایسی جامع شریعت ہے جس میں ہر ایک قسم امر کے متعلق احکام نہایت شرح و بسط کے ساتھ مندرج ہیں۔ چونکہ اِن احکام کی تبلیغ نہایت ضروری تھی اس لئے صحابہ کا ایک گروہ ہمیشہ حضورؐ کی خدمت میں بغرض استفادہ جمع رہتا۔ چنانچہ قرآن مجید سے بھی آیہ فلولا نفر من کل فرقۃ میں اس کی ضرورت ظاہر کی۔ یہ ازواج مطہرات حضور علیہ السلام سے اس حصہ تعلیم کو حاصل کرتیں جو صرف عورتوں سے مخصوص ہیں۔ مثلاً مسائلِ حیض و نفاس و نکاح و طلاق اور دیگر مسائل طرز معاشرت و خانہ داری وغیرہ ایسے اُمور ہیں جو بجز گھر کے آدمیوں کے مفصّل معلوم نہ ہوسکتے تھے اور اجنبی عورتیں بلا واسطہ حضور علیہ السلام سے ان مسائل کے دریافت کرنے میں حجاب کیا کرتیں اسلئے ازواج مطہرات گویا آپ کے مکتب شریعت کے لئے بمنزلہ معلم کے تھیں جن سے عام عورتیں مسائل شریعت سیکھا کرتیں ؛

(۷) مخالفین ہمیشہ اس ٹوہ میں لگے رہتے کہ حضور علیہ السلام کے اندرونی حالات پر مطلع ہوکر نکتہ چینی کیا کریں۔ اس لئے جناب والا نے متعدد قبائل عرب سے ازواج کو تجویز کیا تاکہ انہیں ان کی وساطت سے آپ کے اندرونی حالات پر اطلاع حاصل ہوتی رہے۔ کیونکہ جب انہیں حضور کا خلا و ملا یکساں ثابت ہوجاتا تو ان کے لئے آپ کی صداقت کی دلیل ہوتا۔ چنانچہ واقفانِ علم سِیَر پر مخفی نہیں ہوگا کہ کئی ایک بڑے بڑے مخالف صرف اسی تدبیر سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ؛

(۸) اُمت کے لئے اس نمونہ کا قائم کرنا مقصود تھا کہ کس طرح ایک شخص با خدا

ہو کر ضروریات تمدّن و معاشرت پر بھی کاربند ہو سکتا ہے۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو ایک عورت کی سخت مزاجی کی بھی بُردباری نہیں کر سکتے۔ مگر حضور علیہ السلام نے نہایت مصلحت کے ساتھ مختلف الطبائع ازواج کے حقوق کو ہمیشہ برابر ملحوظ رکھا اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیا ۔

(ح) اہل عرب اس شخص کو جو مردی میں کامل ہو عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ امر بھی حضور علیہ السلام کے حشمت و وقار کا بڑا بھاری باعث تھا یہ امر واقف رسوم عرب پر مخفی نہیں ۔

(ط) اظہار خرق عادت مدنظر تھا۔ کیونکہ عام طور پر لوگوں میں اس قدر قوّت رجولیت نہیں ہو سکتی باآنکہ حضور علیہ السلام کی غذا کا یہ حال تھا کہ بسا اوقات کئی دن فاقہ میں گذر جاتے مگر حقوق زوجیت میں فرق نہ آتا ۔

ممکن ہے کہ کوئی اور صاحب فراست اور بھی بہت سے وجوہ تجویز کر سکے مگر ایک سمجھدار کی ایمانی طاقت کے لئے کیا یہ کچھ کم ہیں؟ حضورؐ نے ایک حدیث میں فرمایا کہ مجھے تمہاری[1] دنیا سے تین چیزیں مرغوب خاطر ہیں۔ عورت۔ بوئے خوش۔ نماز۔ ان کلمات کو ایک خبیث باطن کا آدمی جانے کس پہلو پر محمول کرے مگر ایک سلیم الفطرة آدمی جانتا ہے کہ اگر نکاح جائز سے کوئی شخص بلاوجہ محترز رہے تو سوائے بدمعاشی کے وہ اور کیا سیکھ سکتا ہے۔ عورت کا ہونا مرد کے لئے ہزاروں قسم کے گناہوں سے بچنے کا بڑا بھاری ذریعہ ہے۔ ذرا غور کر کے سمجھ لو کہ یہ کلام کس قدر خوبیوں کا جامع ہے ! ۔

الغرض اسلامی مسئلہ نکاح و طلاق ایسا جامع مانع ہے کہ اس سے بہتر کسی شریعت میں بھی مذکور نہیں۔ جس شخص نے تاریخ زمانہ جاہلیت کا مطالعہ کیا ہوگا

[1] لفظ تمہاری سے یہ مراد ہے کہ حضور کا ان چیزوں کو پسند کرنا محض بغرض ثواب اخروی تھا۔

وہ بخوبی جانتا ہے کہ اہل عرب کے ہاں طلاق تین طریق پہ عائد کیجاتی تھی۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ مینے ثقہ اور معتبر اہل علم کی زبان سے سُنا ہے کہ اہل جاہلیت تین طرح پر طلاق دیتے تھے۔ بذریعہ ظہار کے۔ بذریعہ ایلاء کے اور بذریعہ طلاق کے۔ سو طلاق کو تو خداوند تعالےٰ نے ثابت رکھا اور ظہار اور ایلاء کے وہ فیصلہ کیا جو قرآن مجید میں مذکور ہے ❊

جاہلیت کے ایلاء کی نسبت طبرانی نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ جاہلیت میں ایک سال اور دو سال کا ایلاء کرتے تھے۔ خداوند تعالےٰ نے ان کے لئے ایلاء کے کل چار مہینے مقرر کئے۔ جو ایلاء چار مہینے سے کم کا ہو وہ ایلاء نہیں ہے ❊

جاہلیت میں مختلف اوقات میں تین طلاق دیتے تھے۔ یہ طریقہ بعینہٖ اسلام کا طریقہ ہے۔ اس طریق کی بنیاد سب سے پہلے حضرت اسمٰعیل بن ابراہیمؑ نے ڈالی تھی۔ پھر ان کے بعد اہل عرب نے اس پر عمل کیا۔ چنانچہ جب ان میں سے کوئی اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا تو فقط ایک طلاق دیتا اور اور لوگوں کی نسبت اس کا سب سے زیادہ حقدار شوہر سمجھا جاتا۔ جب پوری تین طلاقیں دے چکتا تو اُس وقت عورت اُس سے بالکل علیحدہ ہو جاتی اور شوہر کا اس پر کوئی اعتبار باقی نہ رہتا ❊

یہ طریق کسی طرح بھی قابل ملامت نہیں ہے لیکن جاہلیت میں اس میں یہ خرابی واقع ہوگئی تھی کہ اہل جاہلیت عورتوں کو طلاق دیتے جبکہ ان کی عدت گزرنے کا زمانہ ہوتا اور ایک دو دن باقی رہ جاتے تو اُس وقت اُن سے رجعت کر لیتے نہ اس غرض سے کہ اُنہیں اُن کے ساتھ محبت یا اُن کی حاجت ہوتی تھی، بلکہ اس غرض سے کہ اُنہیں نقصان پہنچے اور عدت طویل ہو جائے اور نکاح ثانی کے لئے زمانہ دراز تک انتظار کرنا پڑے ❊

ان کی یہ بھی شرارت تھی کہ اپنی عورتوں کو طلاق دیتے یا نکاح کرتے یا اپنا غلام آزاد کرتے تو کہتے کہ ہم نے مذاق کیا تھا۔ شریعت اسلام نے ان دونوں کو باطل کیا۔ پہلے امر کی نسبت خدائے تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی واذا طلقتم النساء فبلغن اجلهن فامسکوهن بمعروف او سرحوهن بمعروف ولا تمسکوهن ضرارا لتعتدوا ومن یفعل ذلك فقد ظلم نفسه یعنی جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدّت پوری کرنے کے قریب ہوں تو اس کے بعد انہیں خوبی سے روک رکھو یا خوبی کے ساتھ چھوڑ دو۔ ضرر اور نقصان پہنچانے کی غرض سے انہیں نہ روکو ورنہ تم حد سے بڑھ جاؤ گے اور جو انہیں نقصان پہنچانے کی غرض سے روکے گا وہ اپنے پر ظلم کرے گا ۔

دوسری بات کو جناب سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول سے باطل کر دیا اور فرمایا کہ نکاح کا انعقاد اور طلاق ورجعت کا وقوع ہر حالت میں ہو جاتا ہے خواہ انسان دل سے ان کا مرتکب ہو یا مذاق سے۔ مذاقاً ان باتوں کو کرنا ایسا ہی ہے جیسے دل سے (دیکھو بلوغ الارب فی احوال العرب جلد ۲) ۔

طلاق کے باب میں زمانہ جاہلیّت کے بعض عربوں کا یہ بھی دستور تھا کہ جس طرح خاوند اپنی بیویوں کو طلاق دینے کا اختیار رکھتے تھے اسی طرح بیویاں بھی اپنے شوہروں کو طلاق دینے کی مجاز تھیں۔ بیویوں کے اپنے خاوندوں کو طلاق دینے کا طریق یہ تھا کہ جب کوئی عورت اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے طلاق دینا چاہتی تو جس خیمہ میں وہ رہتی اُسکے دروازہ کا رُخ بدل دیتی۔ یعنی اگر خیمہ کا دروازہ مشرق کی طرف ہوتا تو اُسے مغرب کی طرف اور اگر مغرب کی طرف ہوتا تو مشرق کی طرف پھیر دیتی۔ اسی طرح اگر خیمہ کا رُخ جنوب کی طرف ہوتا تو اُسے شمال کی طرف اور اگر شمال کی طرف ہوتا تو جنوب کی طرف بدل دیتی اس کے ایسا کرنے سے خاوند پر طلاق پڑ جاتی اور جب وہ خیمہ کا رُخ بدلا ہوا دیکھتا تو سمجھ جاتا

کہ اس کی بیوی نے اسے طلاق دیدی ہے۔ پھر اس کے پاس نہ جاتا اور دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے۔

جاہلیت میں عورتیں خُلع بھی کراتی تھیں۔ خُلع کے یہ معنی ہیں کہ عورت شوہر کو کچھ مال دے کر اس سے اپنا پیچھا چھڑا لیتی تھی۔ یہ بھی ایک قسم کی طلاق ہی تھی۔ اس میں اور طلاق میں فقط صرف یہ فرق ہے کہ طلاق شوہر خود اپنی مرضی سے دیتا ہے مگر خلع میں مال کے عوض عورت اس سے طلاق مانگتی ہے۔ خلع کا موجد عامر بن ظرب تھا جس کا مختصر حال یہ ہے کہ عامر بن ظرب نے اپنی بیٹی اپنے بھتیجے عامر بن حارث بن ظرب سے بیاہ دی تھی۔ نکاح کے بعد جب دُلہن دُولہا کے پاس بھیجی گئی تو دُلہن کو دُولہا کی صورت دیکھکر اس سے نفرت پیدا ہو گئی۔ اس نے اس کا ذکر اپنے باپ سے کیا۔ باپ نے کہا کہ اگر تو اس سے علیحدہ ہونا چاہتی ہے تو وہ مال جو اس نے تجھے مہر میں دیا ہے اسے واپس کر دے یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ تجھے بھی تیرے شوہر سے چھڑا دوں اور اس کا مال بھی تیرے پاس رہے۔ پھر اس کے شوہر سے کہا کہ جو مال تو نے اسے دیا تھا میں اس سے واپس کرائے دیتا ہوں تو اسے چھوڑ دے۔ یہ سب سے پہلا خلع ہے جو عرب میں واقع ہوا۔

چند سال گذرے کہ مصر کے ایک مشہور رسالہ اللواء میں ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمارے زیر بحث موضوع پر بہت کچھ روشنی ڈالتا ہے:۔

اسلام کا ظہور اس وقت ہوا جبکہ طبقۂ اناث کو غایت درجہ کی ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اسلام نے اس فرقہ پر یہ احسان کیا کہ اس کو قعر ذلت سے نکال کر مرد و عورت کے حقوق فیمابین میں مساوات کا درجہ قائم کر دیا۔ بقولہ تعالےٰ ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجۃ۔ یہ فضیلیں کونسی

ہیں؟ مردوں کی جسمانی طاقت عقل اور مال و دولت جو انکی بہتری اور گذارہ کے لئے کماتے اور خرچ کرتے ہیں۔ جو حقوق ایک مسلمان عورت کو شریعت اسلامیہ نے عطا کئے ہیں انکی نظیر کسی قوم میں نہیں ملتی اور نہ اس سے بڑھکر کسی کے دل میں آسکتے ہیں +

منجملہ ان حقوق کے جو عورت کو اسلام نے عطا کئے ہیں ایک یہ بھی ہے کہ طلاق کا امر ایک حد تک عورت کے اختیار میں ہے کیونکہ عقد کے وقت ضمناً یہ شرط ملحوظ ہوتی ہے کہ اگر مرد اس کے ساتھ اچھی طرح سلوک نہ کرے یا حسن سلوک کے ناقابل ہو تو وہ عورت امام وقت یا قاضی سے کہہ کر مرد سے جبراً طلاق لے سکتی ہے۔ خواہ مرد کی مرضی ہو یا نہ ہو۔ علاوہ ان صورتوں کے مرد کو مطلق اختیار حاصل ہے کہ جب وہ چاہے عورت کو طلاق دیدے کسی دوسرے شخص کو کوئی حق نہیں کہ اس سے سبب دریافت کرے۔ البتہ اس پر یہ اعتراض آسکتا ہے کہ عورت کو بغیر سبب بتلائے طلاق دیدینا اس کے لئے بے عزتی اور اس پر ظلم کرنا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ امر اس کے لئے باعث عزت اور اس کے عیوب کے لئے پردہ پوش ہے کیونکہ بسا اوقات اظہار وجہ میں عورت کی تشہیر عیوب ہوتی ہے۔ اور یہ امر اس کے لئے دوسری جگہ نکاح کرنے میں سدّراہ ہو جاتا ہے۔ یہ ان احسانات کی بین دلیل ہے جو اسلام نے فرقہ اناث پر کئے اسی لئے خداوند تعالے نے کسی دوسرے شخص کو یہ حق نہیں دیا کہ مرد کو اسباب طلاق بیان کرنے پر مجبور کرے۔ اکثر یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ عورت کی کوئی خاص خصلت جو اگرچہ دوسروں کی نظروں میں پسندیدہ ہو خاوند کو نہایت بری معلوم ہوتی ہے ع للناس فیما یعشقون مذاھب۔ اس صورت اس وجہ کا اظہار خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز دوسروں کو عورت پر بدظن ہونیکا موقع دیتا ہے۔ جس سے اسکی زندگی کٹھن ہو جاتی ہے اور وہ ذلت اور حقارت کی نگاہ سے

دیکھی جاتی ہے۔ ہرکس وناکس کو طعن وتشنیع اور آوازے کسنے کا موقع ملجاتا ہے جس کا تدارک ناممکن ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ اصلاح اس کے لئے مصیبت ہو جاتی ہے بلکہ صحیح لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ تمدن ومعاشرت کو سخت نقصان پہنچاتی ہے اب معترض کہہ سکتا ہے کہ پھر قرآن مجید (سورۂ نسار) میں مرد اور عورت کے خاندانوں سے منصفوں کا قرار دیا جانا اور حکم بنا کر ان کو مرد اور عورت کے درمیانی اسباب نفاق کا بتانا کیوں آیا ہے؟ وہ بھی اس عورت کے حق میں مضر ہوتا ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ اسباب شقاق (مخالفت وعداوت) اور اسباب طلاق میں بہت فرق ہے۔ صورت اوّل میں اگر طلاق تک نوبت نہ پہنچے تو افشائے راز سے عورت کو کچھ ضرر نہیں پہنچ سکتا اور اگر طلاق واقع ہو جائے تو اس صورت میں دوسری صورت سے مقابلۃً بہت کم ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ نفاق کا باعث عورت کی بدخلقی ہی ہوا کرتی ہے لیکن اسباب طلاق مختلف ہوتے ہیں۔ دو منصفوں کا فریقین کے اسباب شقاق کی تحقیقات کے لئے مقرر کرنا اکثر صلح مابین الفریقین کے لئے مفید ثابت ہوا ہے۔ بخلاف تحقیقات اسباب طلاق کے کہ اس صورت میں وقوع طلاق کے بعد اُس کی تلافی محال بلکہ ناممکن ہے۔ اگر ہم مرد کو معمولی وجہ سے طلاق دینے پر عذاب کا خوف دلائیں تو یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ ہم کسی بات کو معمولی سمجھیں مگر وہ مرد وعورت کے حق میں معمولی نہ ہو۔ بلکہ اس سے انکی زندگی ہی تلخ گذرتی ہو۔ اور وہ آپس میں گذارا نہ کرسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامی میں اس امر کی طرف ترغیب دلائی گئی ہے مجبور نہیں کیا گیا۔ کقولہ تعالیٰ فان کرھتموھن فعسیٰ ان تکرھو شیئًا ویجعل اللہ فیہ خیرًا کثیرًا۔ کیونکہ کراہت دل کی بات کو دور نہیں کرسکتی۔ اس کا نتیجہ سوائے بغض اور کینہ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا ہے

لا ترجع الا نفس عن غیہا
ما لم یکن منہا لہا زاجر

وجوہات مندرجہ بالا پر شارع علیہ السلام نے طلاق کا امر مطلقاً مرد کے اختیار پر چھوڑ دیا۔ اگر وہ طلاق دیدے تو ہمارا کوئی حق نہیں کہ ہم اسے برا بھلا کہیں۔ اگر اس نے ظلم سے ایسا کام کیا ہے تو خود خدا اس سے سمجھ لے گا۔

وقوعات طلاق کو حتی الامکان کم کرنے کے لئے شارع علیہ السلام نے مفصلہ ذیل فرائض کو مردوں پر لازم کر دیا ہے:۔

(۱) عورت کا حق مہر ادا کرنا۔ فاتوھن اجورھن فریضۃ ۔

(۲) ان اشیاء کا واپس نہ لینا جو قبل از طلاق عورت کو دیدی گئی ہوں۔ وان اردتم استبدال زوج مکان زوج واتیتم احداھن قنطارا فلا تاخذوا منہ شیئاً اتاخذونہ بہتانا واثماً مبیناً ۔

(۳) ان اشیاء کا عورت کو بخش دینا جو بوقت طلاق اس کے زیر استعمال ہوں اس کا نام اصطلاح شریعت میں متعہ ہے وللمطلقٰت متاع بالمعروف حقا علے المتقین ۔

(۴) عدت کے گذرنے تک ان کو نان ونفقہ دینا اور گھر میں رکھنا لا تخرجن من بیوتھن الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ ۔

(۵) اگر حاملہ ہو تو وضع حمل تک اس کو اخراجات وغیرہ دینا وان کن اولات احمال فانفقوا علیھن حتی یضعن حملھن ۔

(۶) اگر مطلقہ عورت مرد کے شیر خوار بچہ کو دودھ پلاتی ہو تو اسکی اجرت وغیرہ دینا وعلے المولود لہ رزقہن وکسوتھن بالمعروف ۔

(۷) اگر کسی وجہ سے عورت کی طرف سے دل کھٹا ہو جائے تو صبر کرنا فان کرھتموھن ... الآیۃ

(۸) عورت و مرد کے خاندانوں سے دو منصف مقرر کرنا۔ تاکہ وہ اسباب شقاق

کو دریافت تحقیق کرکے اُس کے ازالہ کی کوشش کریں۔ وان خفتم شقاق بینہما فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا ان یریدا اصلاحا یوفق اللہ بینہما

(۹) مفلس شخص کو جو اخراجات خانہ داری کا متحمل نہ ہو سکے نکاح کرنے سے باز رکھنا ولیستعفف الذین لا یجدون نکاحا حتی یغنیہم اللہ ؛

(۱۰) عورتوں سے حسن سلوک روا رکھنا فامسکوھن بمعروف اوفارقوھن بمعروف ولا تمسکوھن ضرارا لتعتدوا ومن یفعل ذلک فقد ظلم نفسہ ولا تتخذوا ایت اللہ ھزوا ؛

بیان مذکورہ بالا سے واضح ہو گیا کہ اسلام نے اس مسئلہ کو نہایت عمدہ طور پر حل کیا ہے کہ کسی شخص کو نکاح جائز نہیں جب تک اسے اس کی ذمہ داریوں سے واقفیت نہ ہو اور جب تک وہ اپنے آپ کو عورت سے حسن سلوک کرنے کے قابل نہ پائے۔ اس لئے امام المسلمین پر واجب ہے کہ جب تک کوئی شخص ان صفات سے متصف نہ ہو اُسے نکاح کرنے کی اجازت نہ دے تاکہ اسلام میں ایسی حرکات نامطبوعہ کی کثرت نہ ہو جائے۔ ہم پر بھی واجب ہے کہ اس کی کلی اطاعت کریں واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ جو شخص امام کے احکام کی پیروی نہیں کرتا وہ گناہ کرتا ہے اس کے لئے ہمیں ایسی سزا دینی اور ان خرابیوں کے روکنے کے لئے ایک ایسا دستور العمل بنانا چاہئے جو مندرجہ ذیل امور پر مبنی ہو ؛

(ا) کوئی شخص نکاح نہ کرے جب تک وہ نکاح کی ذمہ داریوں کو بجالانے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور جب تک وہ اپنی بیوی سے حسن معاشرت نہ کر سکے ؛

(ب) شریعت اسلامی کے موجب مرد اپنی منسوبہ بیوی کو دیکھ بھال لے تاکہ اسے شکایت کا موقع نہ رہے ؛

(ج) عام لیکچروں اور تقریروں میں ظلم کی برائیاں بیان کریں اور عذاب الٰہی

سے ڈرائیں ٭

(د) فرقہ اناث میں یہ روح پھونکیں کہ کسی مرد کے ساتھ نکاح نہ کریں جب تک وہ ایک معتدبہ رقم بطور مہر مقرر نہ کرے یا نکاح کے وقت طلاق کا اختیار اپنے قبضہ میں رکھیں ٭

(ہ) عورت کی بے پردگی اور اجنبیوں کے سامنے اظہار زینت کا بموجب احکام قرآن مجید بڑے زور سے رد کریں اور اس کے روکنے کے لئے جان توڑ کوشش کریں ٭

اگر ہم مذکورہ بالا طریق پر عمل کریں تو انشاء اللہ العزیز طلاق جس کی کثرت کی ہم شکایت کرتے ہیں بہت کم ہو جائیگی اور اس کا اثر بد ہم سے اٹھ جائیگا ٭

عدّت

شریعت اسلام میں مطلقہ عورت یا اس عورت کے لئے جس کا خاوند مرجائے عدّت پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حکم میں ایک مصلحت تو یہ ہے کہ ایام عدّت کے پورا ہونے سے پہلے پہلے مطلقہ عورت اور شوہر میں ممکن ہے کہ مصالحت ہو جائے اور تفریق بین المسلمین لازم نہ آئے۔ کیونکہ طلاق کی صورت میں مرد اور عورت ہر دو کے خاندانوں میں ایک قسم کی مخالفت پیدا ہو جاتی ہے جو منشاء اسلام کے برخلاف ہے اور جس عورت کا شوہر مرچکا ہو اس کی عدّت میں یہ حکمت ہے کہ اس کے حاملہ ہونے کی صورت میں اگر وہ بے عدّت دوسرے مرد سے نکاح کرے تو اس امر کا فیصلہ دشوار ہوگا کہ بچہ پہلے شوہر کا ہے یا دوسرے کا۔ اور اس طرح بچے صحیح النسب ثابت نہیں ہو سکتا اور یہ امر تقسیم ترکہ کے وقت موجب نزاع ثابت ہوگا۔ مختلف قسم کی عورتوں کی عدت کتب فقہ میں بالتفصیل مذکور ہے ٭

زمانہ جاہلیت میں عورتوں کی عدّت کا طریق حسب ذیل تھا۔ وفات کی عدت ایک سال تھی۔ جب کسی عورت کا خاوند مرجاتا تو وہ ایک چھوٹے سے تنگ و تاریک گھر میں جس کی چھت نیچی ہوتی تھی نہایت خراب اور میلے کچیلے کپڑے پہن کر بیٹھ جاتی سال بھر

تک اس میں بیٹھی رہتی - اس عرصہ میں نہ نہاتی نہ کپڑے بدلتی - نہ ناخن کٹواتی نہ خوشبو لگاتی - غرض زینت اور آرائش کی کسی چیز کے پاس نہ پھٹکتی - جب پورا سال گذر جاتا اس وقت اس کے پاس کوئی جانور گدھا یا بکری یا پرندہ لایا جاتا اس کے ساتھ وہ اپنی عدت توڑتی - یعنی اس جانور یا پرند کے جسم کے کسی حصہ کو اپنی شرمگاہ پر رگڑتی - اور اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتی - پھر بُری صورت سے باہر نکلتی اور اُس کے ہاتھ میں چند خشک مینگنیاں دی جاتیں جن کو وہ کسی کتے کے اوپر یا اپنے کندھے پر سے اپنی پیٹھ پیچھے پھینکدیتی - اور ایسا کرنے کے بعد عدت سے باہر ہو جاتی - پھر خوشبو لگاتی اور جن باتوں کی اُسے ممانعت تھی وہ اس کو مباح ہو جاتیں اور اس کے بعد جس قسم کا بناؤ سنگار چاہتی کرتی - راوی کا بیان ہے کہ جب وہ پرند کو اپنی شرمگاہ پر رگڑ کر پھینک دیتی تو وہ پرند مر جاتا تھا ؏

اسلام وعیسائیت کی اشاعت[1]

بعض ناواقفوں کا خیال ہے کہ مسئلہ جہاد صرف اسلامی شریعت سے تعلق رکھتا ہے - حالانکہ یہ خیال صریح طور پر غلط ہے - کیونکہ شریعت موسوی میں جہاد کا حکم موجود ہے - اور مختلف انبیاء بنی اسرائیل اسپر عمل پیرا ہوتے رہے ہیں - چنانچہ کتاب استثناء میں جیبئون اور اُن کے ساتھ بعض دیگر لوگوں کے جہاد کرنیکا صریح حکم موجود ہے - اور مرتد اور بتوں کی قربانی دینے والے اور پرستش کرنے والے کی نسبت قتل کا حکم شریعت موسوی میں ایک تاکیدی حکم تھا - بلکہ اس حکم پر اس شدت کے ساتھ عملدرآمد کیا گیا کہ بچوں - بوڑھوں اور عورتوں کو بھی مستثنیٰ نہیں رکھا گیا تھا - کتاب العدد میں

[1] اس مسئلہ کو ایک خاص مناسبت کی بنا پر آئے ہوئے دیگر مضامین کے لکھنا مناسب سمجھا ہے ۱۲ منہ

مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ اس سرزمین کے تمام باشندوں کو ہلاک کر ڈالو۔ اگر
تم ہلاک نہیں کروگے تو وہ تمہاری آنکھوں میں میخوں اور تمہارے پہلوؤں میں نشتروں
کا کام کرینگے۔ اور تمہاری سرزمین میں فساد کرینگے۔ اور میں جو انکے ساتھ کرنا چاہتا
ہوں تمہارے ساتھ کرونگا۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد یوشع علیہ السلام بھی بدستور
حکم جہاد پر عملدرآمد کرتے رہے اور بے شمار مخالفین کو تہ تیغ کیا۔ جس کا ثبوت کتاب
یوشع کے باب اوّل تا باب یازدہم میں موجود ہے اور باب دوازدہم میں مذکور
ہے کہ انہوں نے کفار کے ۳۱ سلاطین کو قتل کیا اور بنی اسرائیل انکی سلطنت پر
قابض ہوگئے۔ اور کتاب صموئیل کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد علیہ السلام
نے اہل جاسور اور عمالکہ کو بلا استثنا زن و مرد قتل کر ڈالا اور ان کے مال و متاع کو
لوٹ لیا اور اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ موبین لوگ داؤد علیہ السلام کے مطیع
ہو کر خراج ادا کیا کرتے تھے۔ اور سریانیوں کے چالیس ہزار سوار کو قتل کیا۔ اور
سات سو گھوڑے لوٹ میں لئے۔ اور داؤد علیہ السلام کے ان اعمال کو اللہ تعالیٰ
نے اعمال حسنہ قرار دیا۔ چنانچہ کتاب ملوک میں لکھا ہے کہ داؤد میرا بندہ ہے جس نے
میری وصیت کو محفوظ رکھا اور دل سے میرے حکم کی اطاعت کی۔ طالوس حواری
ان انبیاء کے عمل جہاد کی بابت شہادت دیتا ہے کہ انہوں نے نیکی کا کام کیا۔ ان کا
ایسا کرنا گناہ نہیں تھا بلکہ قوت ایمانی اور رضاء الٰہی کا حاصل کرنا مقصود تھا۔ اس کو
سنگدلی اور ظلم نہیں کہہ سکتے۔ صحائف انبیاء میں اور بھی بہت سے اس قسم کے
حوالہ جات موجود ہیں۔ جب عادت اللہ سرکش کفار کی نسبت ہمیشہ جہاد پر جاری ہی
ہے تو زمانہ نبوّت اور بعد میں زمانہ خلافت کے ایسے جہادات کو کیوں مورد طعن
بنایا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلامی جہاد میں انبیاء بنی اسرائیل کے جہاد کی نسبت کفار
کے لئے بہت ہی سہولتیں مدنظر رکھی گئی ہیں پہلے انبیاء علیہم السلام کے جہاد

میں بچوں - بوڑھوں - عورتوں کو قتل سے مستثنےٰ نہیں کیا گیا تھا - مگر اسلامی جہاد میں ایسے لوگوں کی جانیں محفوظ رکھی گئی ہیں - اور اہل عرب کے سوا دیگر ممالک کے کفار کی نسبت حکم ہے کہ پہلے ان کے سامنے اسلام پیش کیا جائے - اگر وہ قبول کر لیں تو ان کے جان و مال اسی طرح محفوظ رکھے جاتے ہیں - جس طرح دیگر مسلمانوں کے - اور اگر اسلام قبول نہ کریں تو وہ ایک نہایت خفیف ٹیکس جو جزیہ کے نام سے مشہور ہے حفاظت جان و مال کے معاوضہ میں ادا کیا کریں اس کے بدل میں جنگی ضرورت کے وقت ان لوگوں پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ڈالا جاتا اور باایں ہمہ کئی ایک معذور لوگ ایسے ٹیکس سے معاف رکھے گئے ہیں لیکن اگر وہ جزیہ ادا کرنے سے بھی انکار کر دیں تو تیسرے درجہ پر ان سے جہاد کا حکم کیا گیا ہے - یہ امر کسقدر حیرت انگیز ہے کہ آجکل مغربی حکومتیں اپنے ملکی یا قومی حقوق کی حفاظت میں کروڑوں بندگان خدا کا بیدریغ خون کر دینا تو جائز سمجھیں اور اعلائے کلمۃ الحق کے دشمنوں سے جو تکذیب حق میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا کرتے تھے توحید الٰہی کی اشاعت اور فساد فے الارض کے مٹانے کی غرض سے جہاد کرنا جائز قرار نہ دیں ؂

اس امر میں غور کرنا چاہیئے - کہ عادت اللہ ہمیشہ مخالفان حق کے ہلاک کرنے پر جاری رہی ہے - جن انبیاء علیہم السلام کو جہاد کے اسباب مہیا نہیں ہوئے - انکے مخالفوں پر انواع و اقسام کے آسمانی عذاب نازل ہوتے رہے - نوح - لوط - ہود - صالح اور شعیب علیہم السلام کی قوموں کی تباہی کے حالات جو مختلف قسم کے عذاب کی صورتوں میں کتب تواریخ میں مذکور ہیں - اسی عادت اللہ ہی کے نتیجہ تھے - اور انبیاء بنی اسرائیل اور جناب پیغمبر علیہ السلام کے جہادات بھی عادت اللہ ہی کے سلسلے میں شمار کیئے جاتے ہیں - اور اس کی مثال بعینہٖ ایک ماہر ڈاکٹر کی سی ہے جو عمل جراحی کے اصول پر کسی عضو کو صرف اس غرض سے کاٹ دیتا ہے کہ مریض کی جان بچ جائے

یا یوں سمجھو کہ ایک بیمار بچہ جب کڑوی دوا نہیں پینا چاہتا تو اُسے جبراً پلائی جاتی ہے کیونکہ وہ استعمال دوا کے نتیجہ سے بے خبر ہے - اسی طرح ایک کسان اناج کے کھیت سے اس قسم کی نباتات کو اُکھاڑ پھینکتا ہے - جو محض فضول اور زراعت اور کھیتی کی نشوونما میں حارج ہوتی ہے - کیا کوئی عقلمند آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ ڈاکٹر یا کسان کا مذکورہ بالا عمل ناجائز یا غیر معقول ہے - سیرت نبوی کے واقف پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ کلمۃ الحق کی اشاعت میں جناب پیغمبر علیہ السلام کو مخالفین کی طرف سے کس کس قسم کی مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا - اور آپ اور آپ کے صحابہ کی جماعت نے کس استقلال کے ساتھ ان سب کو برداشت کیا - چونکہ قوت جہاد کے اسباب مکہ کی زندگی میں میسر نہ تھے - اس لئے بجز صبر کوئی چارہ نہ تھا - مگر خدائے تعالےٰ کی طرف سے برابر وعدہ نصرت کے آیات نازل ہوتے رہے - جس کا ایفا بحکمت خداوندی واقعہ ہجرت کے ساتھ وابستہ تھا - چنانچہ بالآخر مدینہ کی زندگی میں اسلام پاک کی تعلیم عرب کے کونے کونے تک پہنچ گئی - اکثر قبائل عرب نے برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا - اور بعض کے ساتھ جہاد کی ضرورت بھی پیش آئی - ان جہادی کارروائیوں میں بھی اکثر تو ایسی تھیں جو مدافعت کے طور پر عمل میں آئیں اور بعض ایسی بھی تھیں جو ان مخالفین کی قوت توڑنے کے لئے جنکے منصوبوں سے قبل از وقت اطلاع موصول ہوئی - بطور حفظ ماتقدم کیگئیں - جناب پیغمبر علیہ السلام چونکہ مامور من اللہ تھے اس لئے آپ کا ہر ایک فعل حکم خداوندی پر مبنی تھا - چنانچہ ان جہادی کارروائیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ آپ کے دُنیا سے رحلت فرمانے کے وقت تک عرب کی سرزمین جس پر لاکھوں معبودوں کی پرستش کی گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی انوار توحید سے و اشرقت الارض بنور ربہا کا مصداق بن گئی ۵

بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود + سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

پدر بجائے پسر ہرگز ایں کرم نہ کند * کہ دست جود تو با خاندان آدم کرد

عیسائی مشنریوں نے جو ہمیشہ اسلام پاک کی مخالفت میں سرتوڑ کوششیں کرتے چلے آئے ہیں۔ اور جنہیں اسلام کے محاسن بھی معایب نظر آتے ہیں۔ اسلام کے مسئلہ جہاد پر گاہ و بیگاہ نکتہ چینی کی ہے۔ اگرچہ ان کا یہ اعتراض کہ اسلام کی اشاعت میں دنیا میں تلوار سے کام لیا گیا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں اور نہ اس کا جواب آج کوئی نیا جواب ہو سکتا ہے مگر ہم ان لوگوں سے صرف دو باتوں میں غور کرنے کی استدعا کرتے ہیں۔ اول تو یہ کہ مذہب کی حکومت دلوں پر ہوا کرتی ہے۔ جس کے آثار لوگوں کے خارجی اعمال میں ظاہر ہوتے ہیں اور دلوں کو مسخر کرنا کسی دنیوی سلطنت کا کام نہیں۔ جب تک جوہر صداقت کسی مذہب کا اصل اصول نہ ہو۔ قانون فطرت اسکا کبھی ساتھ نہیں دیتا اور نہ دنیا کی تاریخ میں اس کا کہیں نام موجود ہے۔ زمانہ خلافت کی تاریخ پڑھو جس میں عرب سے باہر دیگر ممالک میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ تمہیں خوب واضح ہو جائیگا کہ مسلمانوں نے کبھی اشاعت مذہب میں جبر و اکراہ سے کام نہیں لیا بلکہ ان معاہدات کی شرائط پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ غیر مسلم اقوام کو اختیار دیا گیا کہ مذکورہ بالا اور مختصر ٹیکس یعنی جزیہ ادا کرنا قبول کرلیں یا اسلام میں داخل ہو جائیں۔ ٹیکس جزیہ ادا کرنے کی صورت میں انکو انکے مذہب میں ہر ایک قسم کی کامل آزادی دیدی گئی۔ اور مسلمانوں کے ساتھ بحیثیت رعایا ان کو برابر کے حقوق حاصل تھے۔ اور اس قسم کے بہتیرے نظائر موجود ہیں۔ جن میں مسلم اور غیر مسلم فریقین مقدمہ میں سے غیر مسلم کے حق میں فیصلہ صادر کیا گیا۔ اور اگر بعد کی کسی اسلامی سلطنت میں کسی مسلمان حکمران نے کسی قسم کی بے اعتدالی کی ہو۔ تو اس کی جوابدہی صرف اسی شخص کی ذات تک محدود ہے اصول پرستی عضو کے کا ذمہ دار نہیں۔ مگر غالباً ایسی نظیر تاریخ میں مشکل سے دستیاب

ہو گی۔ الغرض اسلام کی سادہ اور بے لاگ تعلیم نے دلوں کو اپنی مقناطیسی قوت سے
اپنی طرف جذب کر لیا۔ اور مختلف مذاہب کے لوگ کفر و شرک کی ظلمت سے نکل کر
خود بخود نورِ توحید کی طرف کھچے چلے آئے اور آیہ سنریہم ایاتنا فی الآفاق وفی
انفسہم حتی یتبین لہم انہ الحق کا آسمانی وعدہ پورا ہو گیا۔ اس لئے ہم
ان کج بحث مشنریوں کو کہتے ہیں موتوا بغیظکم یعنی وانت پیسو اور کڑھ ہو دوم
جناب پیغمبر علیہ السلام کے ابتدائی زمانۂ بعثت کے حالات میں غور کرو تمہیں معلوم
ہو جائیگا کہ حضور علیہ السلام کس طرح تن تنہا تبلیغ توحید کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے
اور مخالفین نے جو حقیقت توحید سے کوسوں دور تھے کس طرح آپ کی آواز کو ناگوار
محسوس کیا۔ چونکہ ورفعنا لک ذکرک کا وعدہ ہو چکا تھا۔ اس لئے بتدریج چند ایک
سعادت مند آپ کی آواز پر لبیک کہکر آگے بڑھے۔ اور آہستہ آہستہ لوگوں کا رجوع
بڑھتا چلا گیا۔ اور بالآخر ایک معتدبہ جماعت قائم ہو گئی۔ سوال یہ ہے کہ ان لوگوں
کے لئے کونسی مادی قوت استعمال کیگئی اور کس طریق پر انہیں مجبور کیا گیا۔ اور ہجرت
حبشہ پر مہاجرین کو کس طاقت نے اپنے عزیز وطن اور دیگر تعلقات سے علیحدہ ہونے
پر مجبور کیا۔ حالانکہ کوئی شخص معمولی حالات میں اپنے اہل و عیال اور دیگر تعلقات
سے علیحدہ ہونا کبھی پسند نہیں کرتا۔ پھر خصوصًا ایسی حالت میں جبکہ بجز تکالیف و
مصائب کے کسی قسم کے لالچ کی اُمید بھی دامنگیر نہ ہو۔ غالبًا معترضین کو دنیا بھر
کی تاریخ میں اس کی نظیر ہرگز نہیں ملسکتی۔ حضور علیہ السلام ابھی مکہ ہی میں تھے
اہل مدینہ نے آپ کی پاک تعلیم سے متاثر ہو کر آپ سے استدعا کی کہ مدینہ تشریف
لے چلیے۔ چونکہ نصرت الٰہیہ کے ایفاءِ وعدہ کا وقت قریب آرہا تھا۔ اسلئے ہجرت
واقعہ اسلامی تاریخ میں ایک ایسا اہم واقعہ ہے جس کی نسبت نہایت دیانتداری
سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس ہجرت نے لاکھوں مہجورین کو بزم وصال میں قرب

الٰہی کے مسند پر بٹھا دیا۔ یہ وہ واقعات ہیں جنکی اصلیت میں ...
مجال انکار نہیں۔ خدارا ذرا انصاف کرو کہ وہ کونسی تلوار تھی جسکی ...
و نزدیک کے لوگ جوق درجوق حاضر ہوکر برضا و رغبت اسلام کی پاک ...
سے بہرہ یاب ہوتے۔ برخلاف اس کے عیسائی سلطنتوں نے گاہ بیگاہ ...
مذہب کے لوگوں کو ایسے ناپاک حیلوں اور شرمناک تجویزوں ...
کی دعوت دی ہے جن کو اسلام نہایت ذلت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتا
ہے۔ ابن جبیر ساتویں صدی ہجری کا ایک مشہور اندلسی سیاح جزیرہ صسلی
کے مقام اطرابنش کے چشم دید واقعات میں یوں لکھتا ہے :۔
کہ حکومت نصارٰی کے ماتحت وہاں کے مسلمانوں کی کیا گت بنائی جاتی تھی
حکومت کی طرف سے اس قسم کے احکام جاری کئے جاتے تھے جن سے مسلمان
زن و مرد کو عیسائیت کی طرف مجبوراً رجوع کرنا پڑتا تھا اور بڑے بڑے اکابر
اہل اسلام پر مختلف قسم کی تعزیرات عائد کی جاتیں جن سے وہ بالکراہ واجبار اسلام
چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے۔ چنانچہ مقام مذکور کے ایک مشہور فقیہ ابن زرعہ کا
واقعہ جو ہمارے ایام قیام میں پیش آیا یوں ہے کہ عاملان حکومت نے اسے ایسا
تنگ کیا کہ وہ بیچارہ مجبور ہو کر داخل کلیسا ہو گیا اور مذہب اسلام سے دست بردار
ہوا اور اسے اناجیل اور اہل روما کی تاریخ و قوانین کے مطالعہ پر متوجہ کیا گیا
چنانچہ وہ نصارٰے میں لارڈ بشپ کے عہدہ پر مقرر کیا گیا اور عیسائی شریعت
کے مطابق فتوے دینے لگا۔ اور اس کے گھر کے متصل کی مسجد کو کلیسا بنا دیا گیا
مگر ہمیں اندرونی طور پر اطلاع ملی کہ وہ دل سے بدستور اپنے مذہب اسلام پر قائم
ہے۔ غالباً قرآن مجید کے اس حکم استثناء میں داخل تھا۔ قال اللہ تعالیٰ الا من اکرہ
وقلبہ مطمئن بالایمان۔ انہیں دنوں میں جزیرہ مذکور کا ایک بڑا ...